لاہور کی تاریخی، ثقافتی، سیاسی اور ادبی دستاویز

Mein Lahore Hoon

Pani Ka BulBula

میں لاہور ہوں
لاہور کی تاریخی، ثقافتی، سیاسی اور ادبی دستاویز
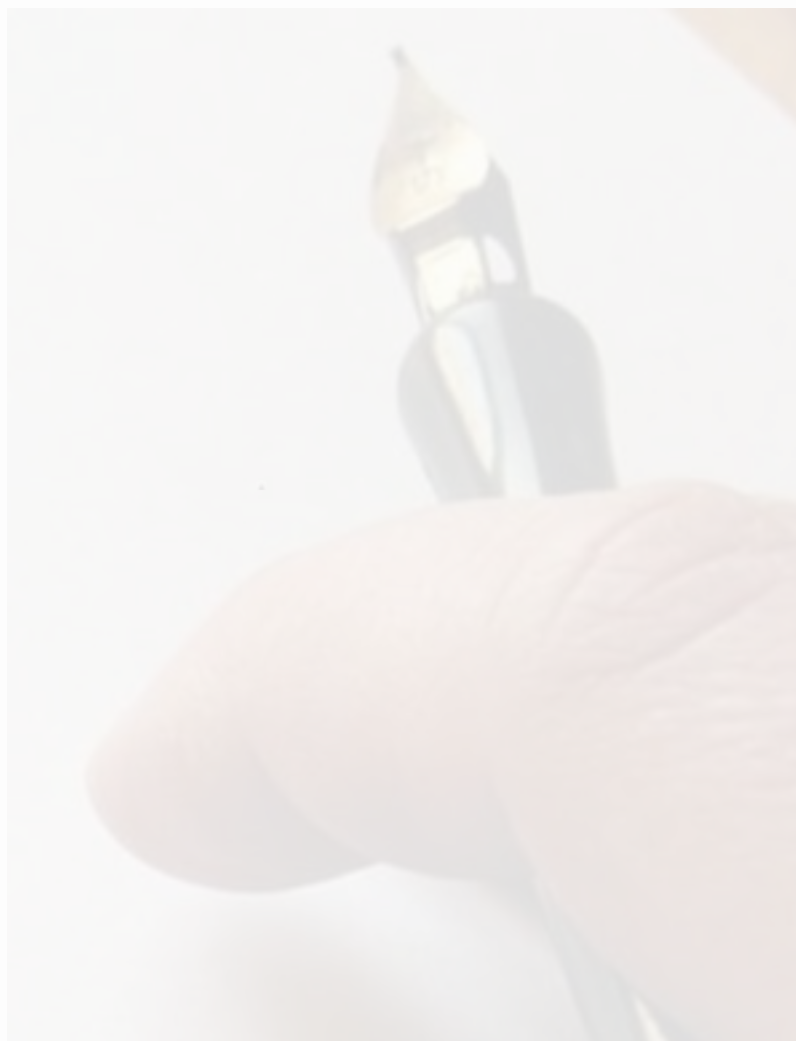
Mein Lahore Hoon

Pani Ka BulBula

Mein Lahore Hoon

لاہور کی تاریخی، ثقافتی، سیاسی اور ادبی دستاویز

Pani Ka BulBula

Mein Lahore Hoon
by Dr. Kewal Dheer
Darbaan Publications, Lahore-Daska.
Publication Year: 2021, Pages 224
Literature and History
ISBN: 978-627-7529-01-7

قانونی مشیر : محمد ظہیر عباس چشتی (ایڈووکیٹ ہائیکورٹ)

نام کتاب : میں لاہور ہوں (لاہور کی تاریخی، ثقافتی، سیاسی اور ادبی دستاویز)

مصنف : ڈاکٹر کیول دھیر (لدھیانہ۔انڈیا)

سرورق : طارق عزیز

ناشر : ماجد مشتاق

ایڈیٹنگ : طارق عزیز

سالِ اشاعت : 2021ء

مطبع : فائن گراف پرنٹرز، لاہور

قیمت : -/800روپے

ملنے کے پتے

• علم و عرفان پبلشرز، الحمد مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔
فون نمبر: 042-37232336

• بک کارنر شوروم، اقبال لائبریری روڈ، جہلم۔
فون نمبر: 054-4614977

انتساب

مستنصر حسین تارڑ

ابدال بیلا

عطاء الحق قاسمی

بیگم بشریٰ رحمٰن

گلزار جاوید

امجد اسلام امجد

افضال احمد

فرحت پروین

طاہرہ اقبال

سلیم اختر

آمنہ مفتی

اور پاکستان کے اُن تمام دوستوں کے نام
جو میرے دِل کے دروازے کی دستک ہیں!

— کیول دھیر

Mein Lahore Hoon

Pani Ka BulBula

فہرست

میرا شہر لاہور

ذاتی طور پر شہر لاہور سے میرا صرف لگاؤ ہی نہیں، ایک اٹوٹ رشتہ بھی ہے۔ اگرچہ ہمارا آبائی گاؤں بھارت کے خِطّہ دوآبہ میں شہر پھگواڑہ سے نواں شہر سڑک پر واقع گاؤں ''ملّو پوتہ'' ہے لیکن تقسیم ملک سے قبل میرے دادا جی لاہور میں رہتے تھے اور میرے والد نے ڈاکٹری کی تعلیم لاہور ہی میں حاصل کی تھی۔ بعد ازاں نوکری انہوں نے لاہور کے قرب و جوار میں ضلع منٹگمری (حال ضلع ساہیوال) میں مختلف مقامات پر واقع سرکاری ہسپتالوں میں کی۔ میری پیدائش پانچ اکتوبر 1938 کو قصبہ گگو منڈی میں ہوئی جہاں والد صاحب سرکاری ہسپتال میں ڈاکٹر تعینات تھے۔ ملک کی تقسیم کے قبل لگ بھگ دس سال کی عمر تک اپنے ننھے ننھے پاؤں سے اپنے دادا یا والد کی انگلی پکڑ کر لاہور کو دیکھنے، اسے محسوس کرنے اور اس کی ادھ کھلی معصوم یادوں کے احساس کے ساتھ ان لمحوں کو جینے کے مواقع مجھے حاصل ہوئے۔ ہندوستان تقسیم ہو کر ''بھارت اور پاکستان'' بن گیا اور ہم بھارت میں اپنے آبائی گاؤں آ گئے لیکن اپنا وہ گھر کبھی نہیں بھولے جہاں ہمارا جنم ہوا تھا—جہاں ہمارے قدموں نے ننھے ننھے ڈگ بھرنے سیکھے۔ اور جہاں کی معصوم یادیں ہمارے دل و دماغ میں دھڑکنیں اور خواب بن کر سمائی رہیں۔ یہاں اپنے گھر رہتے ہوئے بھی وہاں کے گھر کو ہم بھول نہیں پائے۔ شاید ہی کوئی دن ایسا ہوتا جب والد صاحب بیتے دنوں کو یاد نہ کرتے اور ان یادوں میں لاہور کی باتیں نہ ہوتیں۔ ننھے ننھے الفاظ اور قدموں کی یہ یادیں میری بھی تھیں اور وقت کے ساتھ یہ کبھی ماند نہیں پڑیں۔

دیش کے بٹوارے کے بعد وقت صرف آگے ہی نہیں بڑھا، جوان بھی ہوا۔ وقت کے ساتھ تبدیلیاں بھی آئیں۔ میری تعلیم کا آغاز اُردو زبان سے ہوا تھا۔ میرے قلم نے سب سے

پہلے جن الفاظ کولکھنا سیکھا وہ الف۔ ب۔ پ۔ تھے۔ بٹوارے کے بعد بھارت کے اپنے گاؤں کے جس اسکول میں پہلی بار گئے وہاں اسکول والوں کو ہی علم نہیں تھا کہ تعلیم کی زبان کونسی ہے یعنی تعلیم کس زبان میں دینی ہے۔ ہم الف۔ ب میں ہی تعلیم حاصل کرنے لگے۔ جلد بعد ہی اپنے گاؤں ملوپوتہ سے قریبی شہر پھگواڑہ منتقل ہوئے تو وہاں بھی اُردو پڑھنے کی باقاعدہ سہولت نہیں تھی۔ کچھ اور وقت گذرا تو سرکار کی تعلیمی پالیسی میں اُردو زبان کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ اس زمانے میں پڑھائی کے پانچ مضامین ہوتے تھے ـــ انگریزی، حساب، تاریخ، جغرافیہ اور دیگر مضامین میں سے کوئی بھی دو مضمون۔ ہم نے لازمی کے علاوہ دیگر مضامین میں سے سائنس کے مضمون لیے۔ اس زمانے میں یہ سہولیت میسر تھی کہ کسی بھی مضمون میں سوالات کے جواب ہم اردو زبان میں دے سکتے تھے۔ اس طرح اُردو سے ہمارا ناطہ نہیں ٹوٹا۔

والد صاحب کو پڑھنے کا شوق تھا۔ شاید انہیں کی بدولت ادب میں میری دلچسپی پیدا ہوئی۔ پڑھتے پڑھتے لکھنے کا شوق بھی پیدا ہوا اور اردو ہندی دونوں زبانوں میں بچّوں کے رسالوں میں لکھنے لگے۔ اس زمانے میں اُردو اور ہندی زبان کے اخبارات میں بچّوں کے لیے صفحات مخصوص ہوتے تھے اور ان میں زیادہ تر بچّوں کی تصنیفات ہی شائع ہوتی تھیں۔ باقاعدہ اردو کی پڑھائی نہیں ہونے کے باوجود اُردو زبان میں میری دلچسپی مسلسل بڑھتی گئی۔ زبان کے طور پر باقاعدہ تعلیم مجھے نہ تو اردو میں حاصل کرنے کا موقع ملا اور نہ ہی ہندی میں لیکن قدرت نے ان دونوں زبانوں میں برابر لکھتے رہنے کی تحریک عطا کر کے ''ادیب'' یا قلم کار ہونے کی پہچان عطا کی۔

پاکستان کی زبان اردو تھی۔ بھارت میں بھی تب اردو زبان میں اخبارات اور رسالے شائع ہو رہے تھے۔ شروع میں مَیں اپنے وطن میں اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں لکھتا تھا اور سہولت ہونے کے باعث پاکستان کے اردو رسالوں کے لئے اردو میں لکھتا تھا۔ زبان اور ادب کی یہ کہانی طویل ہے۔ اختصار یہ کہ اردو میں لکھنا میری پہلی پسند ہو گیا اور اُردو ادب میں پہچان بھی ملنے لگی۔ اُردو کے بیشتر جریدے پاکستان میں لاہور سے شائع ہوتے تھے اور اس طرح لاہور زیادہ پُر اثر طریقے سے میرے دل و دماغ میں سماتا چلا گیا۔ گذرتے ہوئے وقت کے ساتھ ساتھ لاہور جانے اور وہاں سے اپنی جائے پیدائش ''گگو منڈی'' جا کر وہاں کی مٹّی کو ماتھے لگانے کی خواہش بھی بڑھتی گئی۔

کنور مہیندر سنگھ بیدی سحرؔ اردو ادب کا ایک بڑا نام تھا اور آج بھی ہے۔ بھارت سرکار نے ان کی نمائندگی میں، دیش کے بٹوارے کے بعد پہلی بار، ہندوستانی اردو ادیبوں کا ایک وفد پاکستان کے ایک ہفتہ کے دورے پر بھیجا جس میں درجن بھر بہت بڑے قلم کاروں میں ایک چھوٹا نام میرا بھی تھا۔ میری خواہش زیادہ دنوں تک لاہور میں رہنے کی تھی اور خوش قسمتی سے بیدی صاحب کی محبت اور کوشش سے مجھے تین ہفتے وہاں رہنے کی سرکاری اجازت اور ویزا کی سہولت مل گئی اور لاہور شہر سے 1947 میں وداع ہونے کے لگ بھگ 38 سال بعد پندرہ جنوری 1986 کو میں ایک بار پھر لاہور میں موجود تھا اور یہ تین ہفتے لاہور میں میرے لئے دوسرے جنم جیسے تھے۔

بھارت اور پاکستان کے درمیان تعلقات کبھی بھی نارمل نہیں رہے۔ یہی وجہ تھی کہ جنوری 1986 کے بعد لگاتار 19 برسوں تک میں اُس پار نہیں جا سکا لیکن جنوری 2005 میں کچھ ایسا ہوا کہ پاکستان جانے کے سلسلے میں مجھے کچھ آسانیاں اور دوستانہ سہولیات میسر آ گئیں اور نتیجے کے طور پر میں عموماً ہر سال لاہور جاتا ہوں۔ داتا گنج بخش کے دربار میں حاضری لگاتا ہوں۔ علامہ اقبال اور سعادت حسن منٹو کے مزاروں پر دیئے جلاتا ہوں۔ میری اس طویل یاترا کے دوران میرے کئی بہت عزیز دوست جُدا ہو گئے۔ جُدا ہونے والے ان دوستوں میں اشفاق احمد تھے — ڈاکٹر وزیر آغا، احمد ندیم قاسمی، فرخندہ لودھی، اظہر جاوید، شہزاد احمد، خالد احمد، انور سدید، رخسانہ نور، عبداللہ حسین، بانو آپا، انتظار حسین — اور کئی دوسرے عزیز دوست بھی جو شہر لاہور کی آبرو تھے۔ احمد فراز اور منشا یاد بھی چلے گئے، شبنم شکیل بھی جُدا ہو گئیں جو سب اسلام آباد کی رونق تھے — جُدا ہونے والے ان تمام دوستوں کو سلام کرتا ہوں۔ لاہور میرے بے شمار دوستوں کی موجودگی سے آج بھی ہنستا کھیلتا اور بے حد خوبصورت ہے۔ خدا ان سب کو سلامت رکھے۔ میں لاہور آتا ہوں تو ان سب سے گلے ملتا ہوں۔ اپنے وطن کو واپسی ہوتی ہے تو انہیں جلد ہی ایک بار پھر لاہور آنے کا یقین دلا کر ایک گھر سے واپس اپنے دوسرے گھر آ جاتا ہوں۔

بٹوارے کے وقت لاہور جب میں نے آخری بار دیکھا تھا تب میں عمر میں بہت چھوٹا تھا۔ ذہن میں کچھ جھلکیاں محفوظ تھیں جو سپنوں جیسی لگتی تھیں۔ تقسیم کے بعد جیسے جیسے ہوش سنبھالا، ماں باپ سے پُرانے وقتوں کی لاہور کی کہانیاں سُنیں تو کچھ اور مزید جاننے کی خواہش بے قرار ہوتی گئی — ”جس نے لاہور نہیں دیکھا وہ پیدا ہی نہیں ہوا“ — یہ کہاوت من کو بے چین کرتی

رہی — اور لاہور دیکھنے، اس شہر کو محسوس کرنے، اس کے بارے میں جاننے کی خواہش شدید ہوگئی۔ 15 جنوری 1986 کو جب میں لاہور کے لئے روانہ ہوا تو میں اپنے دھڑکتے دل کو ایک ننھے معصوم بچے جیسا محسوس کر رہا تھا کہ جیسے جنّت سے پریوں کی شہزادی ملنے والی ہو۔

اور آخر میں لاہور پہنچ گیا۔

لاہور پہنچ کر پانچ دن ہندوستانی ادیبوں کے وفد کے ساتھ گذارے اور اس کے بعد وہ لوگ سرکاری پروگرام کے مطابق اسلام آباد اور کراچی ہوتے ہوئے بھارت لوٹ گئے۔ میں دو ہفتے لاہور ہی میں گذارنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ لاہور میں مشہور ادیبہ بیگم بُشریٰ رحمٰن میری میزبان تھیں۔ میرے بے حد عزیز دوست ماہنامہ ''تخلیق'' کے ایڈیٹر اظہر جاوید اور جناب مقبول دہلوی میرے راہنما تھے۔ لاہور کو ہر طرح سے جاننے، پہچاننے اور دیکھنے کا اپنا مقصد میں نے اُنہیں بتا دیا تھا۔ منصوبہ بند طریقے سے لاہور کو جاننے اور دیکھنے کا پروگرام ان کی راہنمائی میں ہم نے بنالیا تھا۔ اظہر جاوید نے مجھے چند بے حد اہم کتابیں بھی مہیا کرا دیں جن میں لاہور کی تاریخ پر رائے بہادر کنہیا لال کی کتاب بھی تھی اور دوسری کتاب یُونس ادیب کی تھی جس میں ان کا آنکھوں دیکھا بچپن سے بڑھاپے تک کا لاہور تھا۔ ان کے علاوہ چند کتابیں اور بھی تھیں جو میرے لئے کافی مددگار ثابت ہوئیں۔ اے۔ حمید نے بھی بچپن سے ہی لاہور دیکھا تھا۔ اسی طرح ابراہیم جلیس نے بھی اس شہر کے گلی کوچوں کو خوب کھنگالہ تھا۔ ان دونوں کی یادیں باتیں بھی میری راہنما بنیں۔ مقبول دہلوی ایک طرح سے لاہور کی ڈائریکٹری تھے۔ لاہور کے ہر بڑے ادیب، قلم کار اور صحافی سے میری ملاقاتیں ان کی بدولت ہی ممکن ہوسکیں تھیں۔

لگ بھگ پندرہ سولہ دنوں کا لاہور میں میرا طویل قیام بیگم بُشریٰ رحمٰن کے یہاں ہی تھا۔ صبح گھر سے روانگی سے قبل دن بھر کے پروگرام کے مطابق وہ ہماری راہنمائی کرتیں اور دیر شام گھر واپسی کے بعد سارے دن کی مصروفیات کی رُوداد سُنتیں اور ساتھ ہی اپنی باتوں سے ہماری جانکاری میں اضافہ بھی کرتیں۔

لاہور کی تاریخ کی باتیں ہم آگے چل کر پڑھیں گے لیکن یہاں میں ان سب باتوں کا ذکر ضرور کروں گا جو میں نے لاہور کے رنگ روپ میں دیکھیں اور جو دوسروں کی یادوں میں شامل ہوکر محسوس کیں۔

لاہور کا رہن سہن، اس شہر کے لوگوں کی دلچسپیاں، کھانا پینا، دوستی اور دشمنی، کھیل و تفریح، بچوں کے شوق، اندرون اور بیرون لاہور کی آبادیاں، بجلی، فلم، سنگیت، مزار، کاروبار، کارخانے، گلی کوچوں کی رونقیں، باغوں کی خوبصورتی، تھڑوں اور محلّوں کا ماحول، پہلوانی کا شوق، ادبی ماحول، ہندو مسلم کلچر، شہریوں کی بول چال کا ڈھنگ طریقہ، تعلیم کا ماحول، ہیرا منڈی، اخبارات، رسالے، 1947 سے پہلے کا ماحول — وغیرہ کتنے ہی موضوعات ہیں جو شہر لاہور کو الگ پہچان عطا کرتے ہیں۔

لاہور میں صدیوں سے آباد لوگوں کا اپنا ایک مزاج ہے۔ اپنا الگ کلچر ہے۔ رہن سہن کا ایک بے حد پیارا انداز ہے۔ زبان اور بول چال میں اپنا ایک خوبصورت رنگ ہے۔ ہنسی مذاق کے انداز، لباس، کھانے پینے کی عادتوں اور چال ڈھال کے اپنے طریقے اور اپنے جذبے ہیں۔ غیرت، ہمدردی، اُنس، محبت اور دوستی کا بھی اپنا ایک الگ اور خوبصورت انداز ہے۔ مہربانی، مہمانی اور سلیقے کا بھی جواب نہیں۔ یہاں کی محبتوں کے انداز بھی نرالے ہیں۔ یہاں کسی دوست کی جدائی میں بھی آنسو بہانے والے ہیں اور کسی کی آمد میں خوشی منانے والے بھی ہیں۔

لاہور محض ایک شہر نہیں، مکمّل ایک تہذیب ہے اور اس کے کلچر کے مختلف رنگ ہیں — میں کوشش کروں گا کہ لاہور کو ٹھیک اُسی رُوپ میں الفاظ کے ذریعے آپ کو دکھا سکوں جیسا لاہور سچ مچ تھا اور ہے۔

وہ قاری جن کا اپنا یا اُن کے بزرگوں کا تعلق کبھی لاہور سے رہا ہے یا وہ لوگ جنہوں نے لاہور کے بارے میں پڑھا، سُنا اور خصوصاً بھارت کی نئی پیڑھی جس کے دل میں لاہور کے بارے میں طرح طرح کے سوالات اور خواہشات ہیں، ان سب کو یہ کتاب لاہور کے بارے میں نہ صرف جانکار بنائے گی بلکہ بھارت پاک دوستی کی راہیں بھی ہموار کرے گی۔

اس کتاب کے بارے میں اپنے قارئین کی بیش قیمتی رائے کا مجھے انتظار رہے گا۔

—— ڈاکٹر کیول دھیر

B-116, B.R.S. Nagar
Ludhiana-141012, INDIA

سستا سودا

ملکہ نور جہاں نے کہا تھا کہ میں اپنی جان فروخت کر کے اگر لاہور خرید لوں تو پھر بھی یہ ایک سستا سودا ہوگا۔۔۔

میں نے بھی دُنیا کے ایسے بڑے بڑے شہر چھوڑے ہیں جہاں لوگ آباد ہونے کو ترستے ہیں، میں نے نہ صرف وہ شہر چھوڑے بلکہ کچھ عشق بھی چھوڑے،

اُن عشقوں سے بے وفائی کی لیکن میں نے ہمیشہ لاہور سے وفا کی

اور اس جادوئی شہر کے بام ودر میں واپس آ گیا۔۔

اور یہ ایک سستا سودا تھا۔

اس شہر کی فضاؤں میں ایسے طلسم سرگوشیاں کرتے ہیں کہ کسی نے بھی اُنھیں سُنا تو وہ ہمیشہ کے لیے اس شہر بے مثال کا ہو گیا۔

آپ کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، امرتا پریتم، خوشونت سنگھ، پران ، اوم پرکاش ، دیو آنند اور کامنی کوشل سے پوچھیے کہ جب مجبوراً اُنھیں لاہور چھوڑنا پڑا تو اُن پر کیا گذری؟

کنہیا لال کپور لاہور سے نکلے تو نابھ میں جا مقیم ہوئے، کسی نے پوچھا کہ آپ کسی بڑے شہر میں جا کر کیوں آباد نہیں ہوئے؟۔۔۔ کہنے لگے جب کوئی شہر لاہور جیسا ہوگا تو چلا جاؤں گا۔

کیول دھیر کی کتاب ''میں لاہور ہوں'' میں یہی لاہور ان کے لفظوں میں سانس لے رہا ہے۔

اس میں کیا شک کہ وہ ایک بڑے لکھنے والے ہیں اور یہ انھوں نے ایک بڑی کتاب لکھی ہے۔

کیول دھیر کو دھیرے دھیرے پڑھتے آپ بھی لاہور کے طلسم میں گرفتار ہو جائیں گے۔

مستنصر حسین تارڑ

ڈاکٹر کیول دھیر

ڈاکٹر کیول دھیر۔ اک تعارف

کیول دھیر اردو کے ایک معروف فکشن نگار ہیں۔ ان کے تخلیقی سفر کا عرصہ کئی دہائیوں پر محیط ہے۔ انھوں نے مختلف تحریکات کا دور دیکھا ہے اور ان تحریکوں کے عروج و زوال سے بھی وہ اچھی طرح آگاہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے خود کو کسی تحریک سے نہیں جوڑا۔ آزادانہ طور پر اپنی تخلیقی مسافت جاری رکھی اور اردو دنیا کو ایسے افسانے دیے جو ہر طبقے میں مقبول ہوئے۔

کیول دھیر کے تجربات اور مشاہدات بہت وسیع ہیں اور ان کی کہانیوں میں انہی تجربات اور مشاہدات کی وسعت نظر آتی ہے۔ وہ معاشرے کے خارجی اور باطنی احوال سے واقف ہیں اور افراد کی داخلی اور خارجی ذہنی کیفیات سے بھی آگاہ ہیں۔ ان کی کہانیاں پڑھتے ہوئے احساس ہوتا ہے کہ وہ افراد اور معاشرے کی مکمل نفسیات پر گہری نظر رکھتے ہیں اور اپنے آس پاس سے ہی افسانوں کے لیے کردار کا انتخاب کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں سماجی، سیاسی اور ثقافتی حقائق کا اظہار بڑی خوبصورتی سے ملتا ہے اور کہانی کہنے کا انداز بھی بہت متاثر کن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو کے بڑے نقادوں، دانشوروں اور کہانی کاروں نے ان کی کہانیوں کو سراہا ہے اور انھیں ایک مختلف طور وطرز کا افسانہ نگار بھی قرار دیا ہے۔ ان کے تعلق سے لکھنے والوں میں راجندر سنگھ بیدی اور عصمت چغتائی جیسے ممتاز فکشن نگار بھی ہیں اور گوپی چند نارنگ جیسے عظیم ناقد بھی۔ ان کے ہمعصر تخلیق کاروں نے بھی ان کے آرٹ کی ستائش کی ہے۔ دیکھا جائے تو وہ برصغیر ہند و پاک میں ایک معتبر اور مؤقر فکشن نگار کے طور پر اپنی شناخت رکھتے ہیں۔ ان کی تصنیفات کی تعداد بھی خاصی ہے جن میں کئی افسانوی مجموعے اور ناول بھی شامل ہیں۔ اور ان کے کمالِ ہنر کا اعتراف بھی مختلف سطحوں پر کیا گیا ہے۔ صرف ہندوستان نہیں بلکہ پاکستان، امریکہ اور دیگر علاقوں میں بھی انھیں اعزازات سے سرفراز کیا گیا ہے۔ ان کے

چاہنے والوں کا ایک بڑا حلقہ ہے۔ ان کی شخصیت اور فن کے حوالے سے کتابیں اور رسائل کے گوشے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ اس طور پر دیکھا جائے تو کیول دھیر کی شخصیت آج کے عہد میں بہت نمایاں نظر آتی ہے۔ کیول دھیر کی شخصیت اور فن پر اظہار کرنے والوں نے انھیں مختلف زاویوں سے پرکھا ہے اور یہ واضح کیا ہے کہ معاصر افسانہ نگاروں میں کیول دھیر کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔

یہ کتاب اسی خوب صورت ذہن کی تلاش سے عبارت ہے جس کا نام کیول دھیر ہے!

پروفیسر ارتضیٰ کریم
(ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی)
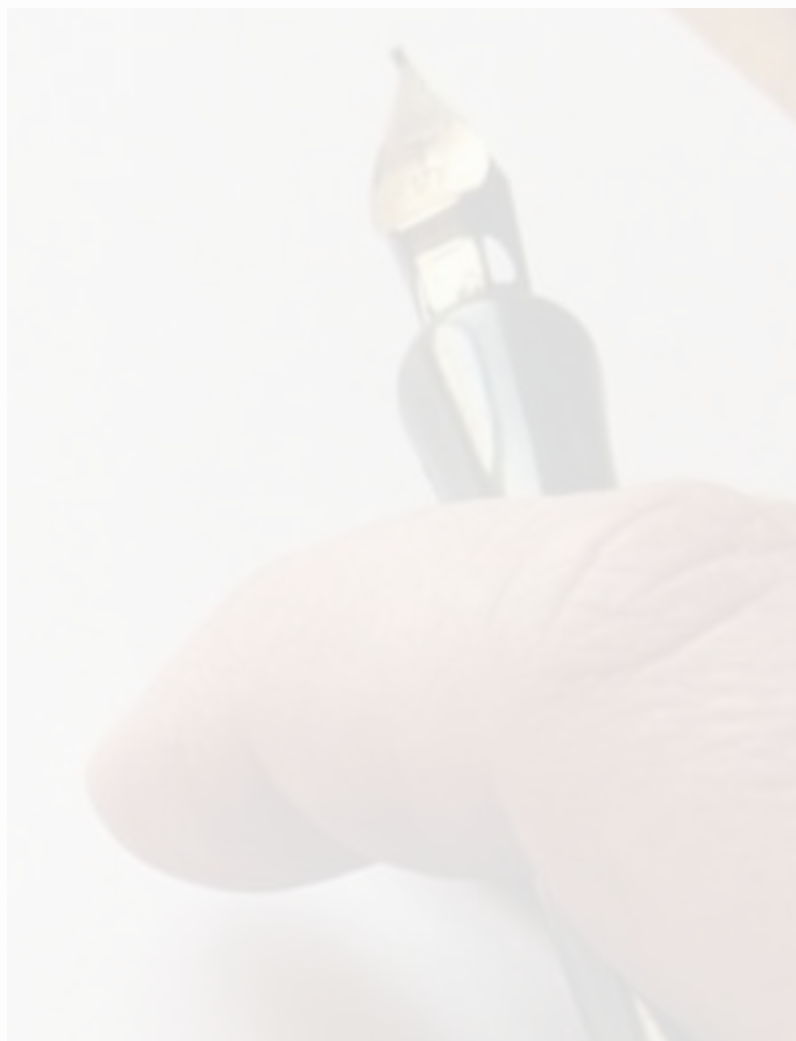
جس نے لاہور نہیں دیکھا

لاہور لفظ ہی سنگیت کے سُروں جیسا ہے۔

لاہور کا نام آتے ہی دل و دماغ میں ایک عجیب سا خوبصورت احساس پیدا ہوتا ہے۔

درحقیقت لاہور محض ایک شہر نہیں، یہ ایک کیفیت ہے — ایک احساس ہے — اور جب یہ احساس اس جادونگری کی نیم روشن گلیوں اور اس کے پُرانے تاریخی باغات میں گھومنے کے بعد دل کی گہرائیوں میں جذب ہو جاتا ہے تو پھر انسان پر اس کا جادو اثر کرنے لگتا ہے اور وہ محسوس کرتا ہے کہ اس شہر سے اس کی رُوح کا رشتہ بہت پُرانا اور اٹوٹ ہے۔

اُردو کے معروف ادیب اور میرے دوست اے۔حمید نے لاہور کے حوالے سے ایک بار ایک واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے بتایا تھا کہ ایک روز وہ مال روڈ پر قائم ایک فائیو سٹار ہوٹل کے لان میں بیٹھا ایک غیر ملکی ایمبیسی کے پریس اٹیچی سے باتیں کر رہا تھا۔ اس کا تعلق یوروپ کے کسی ملک سے تھا۔ مارچ — اپریل کا موسم تھا جب لاہور کے باغ باغیچوں میں پھول کھل رہے ہوتے ہیں۔ وہ غیر ملکی کافی کی چسکیاں بھرتے اور مال روڈ کے گھنے اور سایہ دار درختوں کی طرف دیکھتے ہوئے اپنی کہانی سنانے لگا —— کہ اس نے اپنے کیریئر کا آغاز افریقہ کے ایک ترقی پسند ملک میں اپنے سفارت خانے سے کیا لیکن وہاں دل نہیں لگتا تھا۔ جتنی مدت وہاں رہنا لازمی تھا وہ وہاں گذارنے کے بعد اس نے پیرس کے سفارت خانے میں ٹرانسفر کی کوشش شروع کردی تاکہ وہ وہاں ایک ماڈرن، خوبصورت اور فیشن ایبل ماحول کی میسر سہولیات کا سُکھ حاصل کر سکے۔ اسی دوران اس نے لاہور شہر کی بے پناہ خوبصورتی اور اس کی تاریخ کے بارے میں کوئی کتاب پڑھی تو اس کے دل و دماغ میں لاہور سا گیا لیکن تب تک اس کی ٹرانسفر پیرس ہو گئی تھی۔ اب اس نے

درخواست کی کہ اس کا تبادلہ پیرس کی بجائے پاکستان کر دیا جائے کیونکہ لاہور آنے کی اس کی خواہش اور بے چینی میں اضافہ ہوگیا تھا۔ دوستوں نے اس کا مذاق اڑایا کیونکہ پیرس جیسا رنگین اور جدید شہر چھوڑ کر لاہور آنے کی بات ان کے لئے غیر یقینی تھی ـــــ لیکن وہ اپنی کوشش میں کامیاب ہو کر لاہور آ گیا اور لگا تار کئی سالوں تک وہ اسی شہر میں رہا۔ اے حمید کے مطابق اس پیرس اٹیچی کی یہ کہانی حقیقت پر مبنی تھی یا اس کی کوئی ڈپلومیٹک مجبوری تھی لیکن حقیقت ہے کہ بہت سالوں تک وہ لاہور میں رہا اور لاہور کے جادوئی احساس سے وہ متاثر رہا۔

یہ حقیقت ہے کہ لاہور شہر کی کشش ہی کچھ ایسی ہے کہ انسان اپنے آپ کو اس سے الگ نہیں کر سکتا۔ لاہور پُرانا ہو یا نیا، لاہور ہر حال میں، ہر رنگ میں، ہر روپ میں لاہور ہی ہے۔ یہ داتا کی نگری ہے اور اس شہر پر داتا صاحب کی مہر اور دعاؤں کا سایہ ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ لاہور کا دل داتا صاحب کے اثر اور پورے ماحول میں دھڑکتا ہے۔ داتا صاحب کی درگاہ کے لال گلابوں اور اگربتیوں کی بھینی بھینی مہک نے سارے لاہور کو اپنی نورانی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔

لاہور صرف ایک شہر ہی نہیں، ایک اتہاس ہے، ایک تہذیب ہے۔ لاہور دنیا کے ان خوش قسمت شہروں میں سے ایک ہے جس کی تاریخ ہزاروں سال پُرانی ہے۔ بھگوان رام چندر کے بیٹے راجہ لوہ (ہندو دھرم گرنتھوں میں "لَو" کے نام سے جانا جاتا ہے) نے اس شہر کو آباد کیا تھا۔ قدیم زمانے میں لاہور تین ٹیلوں پر قائم تھا جو آج کے لاہور کی گھنی آبادی کی وجہ سے نظروں سے اوجھل ہو گئے ہیں۔ یہ موہن جوداڑو اور ہڑپہ کے وقتوں کا شہر ہے اور شاید یہ تمام عالم میں ایک اکیلا شہر ہے جو مسلسل آباد چلا آ رہا ہے اور کبھی بھی اجڑا نہیں۔ لاہور وہ شہر ہے جو ایک کے بعد ایک قدیم ہندوؤں اور مسلمان حکمرانوں کے علاوہ سکھ اور انگریز حکومتوں کا مرکز بھی رہا۔ سب سے پہلے شری رام کے بیٹے راجہ لوہ (لَو) نے شہر کی تعمیر و قیام کیا اور اس پر حکومت کی۔ اس شہر کی طویل تاریخ میں بے شمار بادشاہ، شہنشاہ، حاکم، پیر فقیر، مہاتما سلطنت کے ساتھ ساتھ عوام کے دلوں پر بھی حکومت کرتے رہے۔ اسی شہر میں شہنشاہ اکبر شاہی محل میں اپنے وزیروں کے ساتھ دربار لگاتا تھا۔ لاہور سے ہی جہانگیر اور نور جہاں ـــــ شہزادہ سلیم اور انارکلی ـــــ کی محبت کی امر کہانیاں جڑی ہوئی ہیں۔ شاہجہاں کا جنم بھی لاہور میں ہوا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی حکومت کے وقت لاہور ہی ان کی راجدھانی تھی۔

لاہور نے متعدد لڑاکو جنگ بازوں اور حملہ آوروں کو بھی دیکھا۔ ترک جنگجوؤں کے ساتھ محمود غزنوی یہاں آیا۔ خانہ بدوش دُنیا کے طاقتور سردار چنگیز خان کے لشکر آئے۔ یہاں تیمور لنگ آیا جس نے بہت سی جگہوں پر نہ صرف قبضہ کیا بلکہ اپنے جانشینوں میں سے 27 بادشاہ ہندوستان میں چھوڑے۔ تُرکوں کے ساتھ ظہیر الدین بابر بھی آیا۔ ایرانی سپاہیوں کے ساتھ غضبناک بادشاہ نادر شاہ آیا۔ انگریز ہندوستان سے پندرہ ہزار میل طویل سمندر کے راستے سے آکر یہاں کے مالک بن گئے اور ایک طویل مدّت تک لاہور میں بیٹھ کر حکومت کی۔

لاہور کے بارے میں کئی تاریخی اعداد و شمار اور حقائق ہمارے سامنے ہیں۔ سینٹ ٹامز ہربرٹ، جس نے 1595 میں شہنشاہ اکبر کے دورِ حکومت میں لاہور کی یاترا کی، نے اپنے سفر نامے میں لکھا ہے کہ لاہور میں بہت سی چیزیں دعوتِ نظارہ دیتی ہیں جیسے یہاں کا قلعہ، مسجدیں، باغات، حمام، تالاب اور اس شہر کے محلّے۔ قلعے کی شان و شوکت لامثال ہے۔ ہندوستان کا دوسرا کوئی بھی حصّہ یا علاقہ اور نہ ہی مشرق کا کوئی اور علاقہ صحیح معنوں میں اس کی خوشحالی اور بیوپار کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ لاہور سے آگرہ جانے والی تین سو میل سے زیادہ لمبی سڑک کے دونوں طرف سایہ دار درخت لگائے گئے ہیں اور ہر آٹھ میل کے فاصلے پر ایک آرام دہ سرائے ہے جہاں مسافر بلا معاوضہ آرام کرسکتے ہیں۔

سولہویں صدی میں ابوالفضل کی تحریر کردہ کتاب ''آئینہ اکبری'' میں کہا گیا ہے کہ لاہور ایک عظیم شہر ہے۔ اس کی عظمت، خوبصورتی اور آبادی کے لحاظ سے کوئی بھی دوسرا شہر اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ لاہور کے قلعے کو پُختہ اینٹوں اور چونے سے تعمیر کیا گیا ہے۔ یہاں عالیشان محل بنائے گئے اور بہت ہی خوبصورت باغات سے اس شہر کی خوبصورتی کو چار چاند لگائے گئے ہیں۔

مسٹر کوریارٹ نے لاہور کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کے میدانی علاقے اتنے شاندار ہیں کہ اس سے پہلے ایسے میں نے کہیں نہیں دیکھے۔ ہندوستان کے تمام شہروں کے تاجر اپنا سامان فروخت کرنے کے لئے لاہور میں جمع ہوتے تھے اور سامان سے لدے ہوئے لگ بھگ چودہ ہزار اونٹ کندھار کے راستے ایران جانے کے لئے لاہور ہو کر جاتے تھے۔

لاہور کے بارے میں اسی طرح کے دیگر حقائق موجود ہیں جو اس قدیم شہر کی شاندار تاریخ، اس کی وراثت، اس کے عالیشان محل اور مقبرے، اس کی مسجدیں اور مندر، اس کے گلی

کوچے، باغات اور اس کی انوکھی پہچان کا ذکر کرتے ہیں۔ قدیم لاہور کو تو ہم نے تاریخ کے جھروکے سے جھانکا ہے لیکن حقیقت ہے کہ موجودہ دور کا لاہور گذرے وقتوں کے لاہور کے مقابلے میں کسی بھی طرح سے کم نہیں ہے۔

آج سے لگ بھگ ساڑھے تین سو سال قبل اٹلی ملک کے ایک مسافر نکولائی مانسی، جو مغل درباروں میں مختلف عہدوں پر مامُور رہا، نے لکھا ہے کہ لاہور شہر کے گرد ایک مضبوط فصیل (دیوار) ہے۔ شہر کے بارہ دروازے ہیں۔ قادری دروازہ شمال کی سمت میں دریائے راوی کے کنارے پر کھلتا ہے۔ یکّی دروازہ، دِلّی دروازہ، اکبری دروازہ، ملتانی دروازہ، شاہ عالمی دروازہ، بھاٹی دروازہ، موری دروازہ، گربری دروازہ، کشمیری دروازہ اور لوہاری دروازہ — لیکن اِن ساڑھے تین سو سالوں میں گربری، ملتانی اور قادری دروازوں کے نام بدل کر ٹکسالی دروازہ، مستی دروازہ اور شیراں والا دروازہ ہو گئے۔ لاہور کے گرد بنی فصیل (دیوار) بھی نہیں رہی لیکن لاہور اپنی ماضی کی تاریخ کے ساتھ آج بھی زندہ ہے۔ کچھ دروازے صرف اپنا نام چھوڑ کر شہر سے وِداع ہو چکے ہیں لیکن کئی دروازے شہر میں ابھی بھی اپنا نام و نشان قائم رکھے ہوئے ہیں یہ محض دروازے نہیں، ماضی سے لے کر موجودہ وقت تک کا ثقافتی اتہاس ہے۔ انہیں دروازوں سے ہو کر اتہاس اس لاہور شہر میں اپنے تمام پہلوؤں کو آنچل میں سمیٹے، ماضی کے پل پل کو ساتھ لے کر دستک دیتا رہا ہے۔ یہ دستک بھگوان رام، داتا گنج بخش، حضرت میاں میر، حضرت شاہ حسین (مادھو لال حسین) اور سینکڑوں دیگر رشیوں مُنیوں، پیروں فقیروں کی تھی۔ ان دروازوں نے کئی شہنشاہوں، بادشاہوں، ظالم جنگجوؤں اور لٹیروں کی دستک کو بھی محسوس کیا ہے۔ لاہور شہر کی اس عظیم ثقافتی وراثت کا حصہ علامہ اقبالؔ، فیضؔ احمد فیض، سعادت حسن منٹوؔ اور سینکڑوں دوسرے قلم کار، کلاکار اور موسیقار بھی رہے ہیں جنہوں نے لاہور شہر کے خوبصورت چہرے کو پُر نور کیا ہے۔

لاہور شہر درحقیقت خوبصورتی کا اس قدر دیوانہ ہے کہ ہر حُسن کو — بیشک وہ ادب میں ہو، شاعری میں ہو، علم اور فن میں ہو، ہنر مندی میں ہو، موسیقی میں ہو یا چہروں، ذہنوں اور دِلوں میں ہو، اپنی کشش سے انہیں اپنا نہ صرف بناتا ہے بلکہ انہیں اپنے اندر جذب کر لیتا ہے — انہیں پہلو میں جگہ دیتا ہے، انہیں سر آنکھوں پر بٹھاتا ہے اور ان کی آبیاری اپنی طاقت کے لہو کی موج سے کرتا ہے۔ درحقیقت لاہور کا چہرہ اتنا خوبصورت ہے کہ اس کو الفاظ کا روپ دینا آسان نہیں۔

دو ہزار سال قبل لاہور شہر کی بنیاد جب بھی پڑی ہو تبھی سے یہ شہر عروج اور غروب کے سفر پر آگے گامزن رہا ہے۔ یونانیوں، غزنویوں، تاتاریوں، سکھوں اور انگریزوں کے حملوں کے زخم اپنے سینے پر سہتا رہا لیکن اس شہر کی عظمت کے چراغ کبھی بجھے نہیں۔ بستیاں آباد ہوتی رہیں، عبادت گاہوں کی تعمیر ہوتی رہی، درسگاہوں کے چاند روشن ہوتے رہے۔ مسجدوں، مندروں اور گوردواروں کے کلیساؤں کے مینار، گنبد اور بُرجیاں عروج و غروب کی آندھیوں میں گلی کوچوں اور بازاروں سے اٹھنے والے قہقہے دلوں کے آنگنوں سے ٹکراتے رہے۔ محبتوں، وفاؤں، اور اپنے خوبصورت رواجوں کے سرد سائے میں حوصلے کے قافلوں کی آواز اٹھتی رہی۔ قدم بڑھتے رہے، گجر بجتے رہے، ہنگاموں کے طوفان اٹھتے رہے، نفرتوں کی آندھیاں بھی چلیں، باغ اجڑتے اور بستے رہے لیکن اس شہر کے وقار اور عظمت کا سورج کبھی غروب نہیں ہوا۔ اس شہر میں حُسن کے سورج کبھی غروب نہیں ہوئے۔ لاہور کے پانی اور مٹی میں محبت جتنی اور جیسی پائی جاتی ہے، اتنی اور ایسی محبت کہیں اور کہاں۔

لاہور کلچر اور ثقافت کے حوالے سے ایک ایسا شہر رہا ہے جہاں پرانی روائتیں ہمیشہ نہ صرف پروان چڑھی ہیں بلکہ محفوظ بھی رہی ہیں اور ساتھ ہی جن نئی روایتوں نے جنم لیا ان کا مزاج بدلا نہیں۔ ملک کے بٹوارے سے پہلے تک لاہور مشترکہ تہذیب اور بھائی چارے کی ایک مثال تھا۔ بعدازاں پاکستان وجود میں آیا اور ساتھ ہی ایک نئے مسلم کلچر کا بھی جنم ہوا۔ ہزاروں سالوں سے چلی آرہی روایتوں نے رنگ روپ ضرور بدلا لیکن اپنی قدریں نہیں بدلیں اور نہ ہی اپنی عظمتوں کو الوداع کیا۔ یہی وجہ ہے کہ لاہور کے نقش ضرور بدلے لیکن اس کی روح کی خوبصورتی میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔

لاہور کا سفر

لاہور کی یاترا یا سفر ہم 1849 سے شروع کرتے ہیں جب انگریزوں کی آمد لاہور میں ہوئی۔ اس وقت شہر ایک طرح سے اُجڑا ہوا تھا۔ اس کی وجہ حکومت کی ہوس اور لڑائیاں تھی جنہوں نے اس خوبصورت شہر کا چہرہ بگاڑ دیا تھا۔ گلی کوچوں اور بازاروں میں دلدل اور کیچڑ بھرا ہوا تھا۔ سب سے پہلے انگریزوں نے لاہور شہر کے گلی کوچوں اور بازاروں کو صاف کرایا۔ سارے شہر میں نئے فرش بچھائے، کھنڈروں کا ملبہ اٹھوا کر برابر کیا، زمینوں کو ہموار کیا۔ انار کلی کے علاقے میں نئی عمارتیں، کوٹھیاں، بیرکیں اور دفتر تعمیر کرائے۔ پرانے شاہی محلوں اور کئی دوسری تاریخی عمارتوں کی مرمت کرائی۔ حضرت میاں میر کی طرف خالی پڑے وسیع علاقے میں چھاؤنی بنوائی اور دیکھتے ہی دیکھتے وہاں ایک نیا لاہور آباد ہو گیا۔ شہر کے چاروں طرف ایک نہر کھدوادی اور پھل و پھول دار درخت لگوادیئے۔ نہر پر عورتوں اور مردوں کے لئے الگ الگ پختہ گھاٹ بنوادیئے۔

انگریزوں نے ہی لاہور میں پہلی بار ریلوے اسٹیشن کی ایک شاندار عمارت بنوائی۔ پورے برصغیر میں اس وقت یہ سب سے بڑا وسیع اور خوبصورت ریلوے اسٹیشن تھا۔ گلی گلی کوچے کوچے میں اسکول کھل گئے۔ انگریزوں نے ایک بہت بڑا مشن اسکول بھی کھولا۔ یونیورسٹی بن گئی۔ اسکولوں اور کالجوں میں امیر اور غریب اور تمام طبقوں کے لوگوں کو پڑھنے کا حق حاصل ہو گیا۔ میونسپل کمیٹی بن گئی اور شہر میں صحت عامہ وصاف صفائی کی ان کی ذمہ داری تھی اور ہونے والا سارا خرچہ محصول چونگی سے حاصل کیا جاتا تھا۔ انگریزوں نے جب پہلی بار رائے شماری کرائی تو اس وقت لاہور کی کل آبادی چھ لاکھ پینتالیس ہزار تین سو تھی۔ میو ہسپتال، ریلوے اسٹیشن، دفتر لاٹ صاحب، گورنمنٹ کالج، ضلع کچہری اور دیگر کئی بڑی بڑی عمارتیں انگریز کے زمانے میں

رائے بہادر کنہیالال (جوانگریزی کیٹو انجینئر لاہور تھے) کی زیرِ نگرانی تعمیر ہوئیں۔ رائے بہادر کنہیالال صرف ایک انجینئر ہی نہیں تھے بلکہ لاہور کے بہت بڑے رئیس اور اردو و فارسی کے بہت بڑے شاعر اور قلم کار بھی تھے۔ لاہور کی قدیم تاریخ پر لکھی اُن کی کتاب کو آج بھی اعلیٰ ترین تصوّر کیا جاتا ہے۔ رنجیت نامہ، تاریخ پنجاب، گلزار ہندی، بندگی نامہ، اخلاق ہندی، مناجات ہندی اور یادگار ہندی ان کی کئی دیگر مشہور کتابیں ہیں۔ مُغل دور کی تاریخی عمارتوں، محلوں، باغات اور مقبروں کے علاوہ مسجدوں کی مرمت و دیکھ بھال میں ان کا بہت حِصّہ تھا۔ 22 فروری 1888ء کو لاہور میں رائے بہادر کنہیالال وفات پا گئے۔

بہت سے دوسرے شعبوں میں تعمیری کاموں کے ساتھ لاہور میں 29 پرنٹنگ پریس لگ گئے۔ کتابیں زیادہ اور سستی چھپنے لگیں۔ جب انگریز آئے تب لاہور میں کھڈیوں کا کام بڑے پیمانے پر ہونے لگا تھا۔ بڑے بڑے کارخانے تھے۔ چھوٹے پیمانے پر بھی کام ہوتا تھا۔ اس وقت کے بیش قیمتی کپڑے — پشمینہ، دریائی، ریشم، گلبدن، ریشمی وغیرہ تھے جو بڑے پیمانے پر لاہور میں بُنے جاتے تھے۔ شہر میں ہندو کھتری، اروڑے، مسلمان، سیّد، قریشی، مغل شیخ، خوجے اور کشمیری کافی بڑی تعداد میں رہتے تھے۔ لوگ سادہ اور خوش مزاج تھے۔ لاہور میں ہندو اور مسلمان دونوں قوموں میں بڑے بڑے رئیس بھی تھے لیکن ان میں ہندو رئیسوں کی تعداد زیادہ تھی۔ انگریزوں نے حکومت سنبھالتے ہی اعزازی مجسٹریٹ بنا دیئے جن میں دیوان بھگوان داس، رائے مول سنگھ، پنڈت جوالا ناتھ، نواب نوازش علی خاں، نواب عبدالمجید خاں اور شیخ سِندھے خاں تھے۔ کچھ لوگ شہر کے اندر ہی بیٹھتے تھے اور کچھ کچہری میں بیٹھتے تھے۔ جلد ہی شہر کا رنگ روپ بدل کر یہ جدید اور مغربی انداز کا شہر بن گیا۔ میڈیکل کالج، عجائب گھر، چڑیا گھر، نئے اور خوبصورت باغ، نئے ڈھنگ کی کھلی اور خوبصورت سڑکیں، نئی عمارتیں، اسکولوں، کالجوں، کچہری اور ہائی کورٹ کی عمارتیں بھی بن گئیں۔ شہر کا مزاج بدل گیا اور لاہور کی کایا پلٹ ہوگئی۔

شہر کی سڑکوں پر سائیکل آگئی۔ انگریز نے اپنے لئے کاریں اور موٹر سائیکل منگوا لئے۔ نو سو (900) سال کا مسلمانوں اور سکھوں کا مختصر دور ختم ہو کر انگریز کا دور شروع ہوا۔ دِلّی دربار لگا۔ سلطنت برطانیہ کے شہنشاہ کی تاجپوشی ہوئی۔ ملکہ وکٹوریہ اور ساتویں کِنگ ایڈورڈ کے دور سے نکل کر اس سلطنت میں جارج پنجم کا دور شروع ہوا۔

لاہور میں انگریزی طرز کی زیادہ تر عمارتیں اُنیسویں صدی کے آخری تیس سال اور بیسویں صدی کے شروع کے سالوں میں بنیں۔ لاہور کا چڑیا گھر 1872 میں قائم ہوا اور کئی دوسری بڑی عمارتیں اسی کے آس پاس بنیں۔ 1914 میں پہلی عالمی جنگ شروع ہوئی اور اس وقت جو ہندو، سکھ اور مسلمان انگریز کے وفادار رہے انہیں بڑی بڑی جاگیریں ملیں۔ 1919 تک عالمی جنگ ختم ہونے پر ہندوستان میں آزادی کی مانگ زور پکڑ گئی۔ سارے ہندوستان کی طرح لاہور میں بھی سیاسی سرگرمیاں تیز ہو گئیں۔ نئے اخبار شائع ہونے لگے۔ آزادی کی لڑائی کی چنگاری آگ بن کر بھڑکنے لگی۔ دنگوں اور فساد کا دور بھی آیا اور اگست 1947 میں ملک کا بٹوارہ ہو گیا۔ اس بٹوارے نے سب سے زیادہ زخم، درد اور اُداسی لاہور شہر کو دی۔ یہ لاہور شہر کے ان سالوں کی تاریخ کا مختصر حال ہے۔

لاہور کی طرزِ زندگی

لاہور شہر کے چاروں طرف کی فصیل (دیوار) تو بہت پہلے ختم ہو چکی تھی۔ انگریزوں نے شہر کے چاروں طرف جو نہر بنائی تھی یہ سال بھر بہتی رہتی تھی۔ صُبح سویرے اس میں بچے، بوڑھے، جوان نہا لیتے۔ دن میں اس پر بچّوں اور عورتوں کا راج رہتا۔ نہر کی صفائی با قاعدگی سے ہوتی رہتی اور اس کا پانی صاف شفاف رہتا۔ دن کے وقت عورتیں کپڑے دھوتی تھیں اور بچے نہاتے کھیلتے تھے۔ دو تین بجے کے بعد جب عورتیں چلی جاتیں تو آدمی آنے لگتے۔ اس کے اردگرد سائے دار درخت اور باغ تھے جہاں بچے گُلّی ڈنڈا، لٹّو، کوڑیاں وغیرہ کھیلتے رہتے۔ جب دن ڈھلتا تو اکھاڑوں کی رونقیں بڑھ جاتیں۔ شام کے وقت لوگ منڈوے یا سنیما کی طرف چلے جاتے۔ منڈوے یا سنیما بھاٹی دروازے کے باہر زیادہ تھے۔ دو سنیما ہال ہیرا منڈی میں بھی تھے۔ سنیما میکلوڈ روڈ پر بھی تھے اور ان سب میں خاموش فلمیں چلتی تھیں۔ شام کے بعد زیادہ تر لوگ تھیڑوں پر بیٹھتے تھے، حماموں میں بھی بیٹھتے اور خوب گپ بازی ہوتی تھی۔ تھیڑوں پر بیٹھ کر دُنیا بھر کی باتوں سے لطف اندوز ہوتے۔ انہیں تھیڑوں پر دوستیاں اور محبتیں پروان چڑھتیں اور یہیں دشمنی اور لاگ ڈانٹ کے شعلے پھوٹتے۔ تھڑا کلچر لاہور کی سماجی زندگی کی بنیاد تھا۔ سردیوں میں حماموں کی رونق بڑھ جاتی۔ شعر و شاعری، گانا بجانا، داستان گوئی اور فلموں پر ہر طرح کی باتیں ہوتیں۔ رات نصف سے زیادہ گذر جاتی لیکن حماموں کی رونق ختم نہیں ہوتی۔ دوکانیں بھی صبح کی اذان تک کھُلی رہتیں۔ رات ایک دو بجے منڈوے ٹوٹتے اور لوگ وہاں سے نکلتے تو دوکانداروں کی بکری بڑھ جاتی۔ اکثر فلمیں پچیس ریل کی لمبی لمبی بنتی تھیں اور اگر یہ مسلسل چلتیں تو صبح تک چلتی رہتیں۔ شہر رات بھر کھلا رہتا اور آنے جانے والوں کا تانتا نہیں ٹوٹتا تھا۔ بھاٹی،

لوہاری، شاہ عالمی، موچی، یکی، مستی اور شیراں والا ہر دروازے کے لوگ سینما گھروں کے علاوہ ہیرا منڈی کی طرف زیادہ جاتے تھے۔ منٹو پارک، حضوری باغ اور شہر کے باہر کے باغوں میں عموماً ہر وقت خوب چہل پہل رہتی تھی۔

صبح سے پہلے لاہور میں ایک عجیب و غریب سماں ہوتا — ایک رومانی کیفیت ہوتی۔ ویسے تو لوگ رات بھر پھرتے رہتے لیکن جو جلدی سونے کے عادی تھے وہ رات دو تین بجے جاگ جاتے اور گلیوں، بازاروں، کوچوں اور باغوں میں آنے جانے والوں کا تانتا بندھ جاتا۔ مسلمان خدا کا نام لیتے ہوئے مسجدوں کی طرف جا رہے ہوتے۔ ہندو رام رام کہتے ہوئے دریا کی طرف جاتے۔ ہندو عورتیں، مرد سب منہ اندھیرے دریا پر جا کر نہاتے۔ پھر اذان شروع ہو جاتی۔ مندروں میں گھنٹیاں اور شنکھ بجنے لگتے اور گوردواروں میں شبد کے بول سنائی دینے لگتے۔

دریا پر جانے والی ہندو عورتوں میں بوڑھی عورتیں زیادہ صبح سویرے اٹھ کر دریا پر جاتی تھیں۔ ان کے ہاتھوں میں پیتل کی گڑویاں ہوتیں جن میں وہ پانی بھر کر لاتیں اور گھروں میں اس پانی کا چھینٹا دے کر انہیں مقدس (پوتر) کرتیں۔ ہندوؤں میں چھوا چھوت کا بھی بہت چلن تھا۔ کسی بھی مُسلمان سے چھُو جانے پر انہیں دوبارہ نہانا لازمی تھا۔ پو پھٹنے سے پہلے دریا راوی پر میلہ سا لگ جاتا تھا۔ اکثر نظر بازوں کی ٹولیاں بھی دریا پر پہنچ جاتی تھیں۔ بعد ازاں پھر ایک ایسا وقت بھی آیا جب دریا کے کنارے کے کئی گھاٹ صرف عورتوں کے لئے مخصوص کر دیئے گئے۔

منڈی جانے والے مزدور، سبزی فروخت کرنے والے، ٹم ٹم اور ریڑھوں والے، یہاں تک کہ گلی کُوچوں میں گھوم گھوم کر خیرات مانگنے والے ہندو — مسلمان بھکاری بھی بہت سویرے جاگ کر اپنے کام دھندے پر لگ جاتے۔ بھکاریوں کا کاروبار تو دن بھر چلتا رہتا تھا۔ ہندوؤں اور مسلمان بھکاریوں کے الگ الگ بھیک مانگنے کے طریقے ہوتے تھے۔ سوموار، منگل وار، بدھ وار — یعنی ہفتے کے سبھی دنوں کے مطابق ان کی باتیں اور دعائیں بھی الگ الگ ہوتی تھیں۔ عموماً لوگ سیدھے سادھے، رحمدل اور مذہب کے ماننے والے ہوتے تھے۔

حضرت داتا گنج بخش کے آستانے پر ہمیشہ لنگر چلتا تھا۔ ہندوؤں نے بھی لنگر کھول رکھے تھے۔ سکھ ''عطر فروش بھائیوں کی دوکان'' پہلے شہر کے اندر ڈبی بازار میں تھی۔ پھر روشنائی اور نوگزے پیر کے مزار کے پاس آ گئی جہاں ایک بہت بڑی عمارت میں ان کا کاروبار تھا۔ وہاں

ان کی طرف سے بھی لنگر لگتا تھا۔ ویسے لاہور میں روزانہ کوئی نہ کوئی میلہ یا عُرس ہوتا تھا اور اس طرح ہر قوم کے لنگر بارہ مہینے جاری رہتے تھے۔ نذر۔ نیاز کے سلسلے مدتوں سے چلے آرہے ہیں۔ دیگیں پکتیں اور لنگر لگے رہتے۔

آپسی بھائی چارہ اور میل ملاپ بہت تھا۔ لنگر کی طرح لاہور میں سبیلیں لگانے کا بھی بہت رواج تھا۔ محرّم کے نویں اور دسویں دن شہر بھر میں بڑی سبیلیں لگتیں۔ رائے بہادر سرن داس محرّم پر اکثر اپنی لال کوٹھی کے باہر سبیل لگاتے تھے۔ لال کوٹھی داتا دربار والی سڑک سے لے کر کربلا گامے شاہ تک واقع تھی۔ ساتھ ہی کپڑے کی بہت بڑی مِل "میلا رام مِلز" کے نام سے قائم تھی۔ میلا رام کا خاندان شہر کے بڑے رئیسوں میں سے تھا۔ کراؤن سنیما بھی انہیں کا تھا۔

لاہور شہر میں بجلی 24-1923 میں آگئی تھی۔ شہر کی آبادی زیادہ نہیں تھی اس لیے مکانوں کی قلت بھی نہیں تھی۔ کئی مالک مکان غریبوں کو اپنے مکانوں میں مفت رکھ لیتے تھے تاکہ مکان آباد رہے۔ ایک یا دو روپے ماہوار کرائے پر مکان مل جاتے تھے۔ تب صرف اندورون شہر ہی آباد تھا جس میں گلیاں تنگ، مکان چھوٹے لیکن دو تین منزلہ تھے۔ کئی لوگ اپنی فیملی کے ساتھ ایک کمرے میں بھی گذارا کرتے تھے۔ اس کے برعکس امیر اور رئیس لوگ بڑی بڑی حویلیوں، کوٹھیوں اور کئی منزلہ عمارتوں میں عیش کی زندگی گذارتے تھے۔ بڑے بڑے کاروبار والے لوگ، جن میں زیادہ تر ہندو، مِلوں اور کارخانوں کے مالک تھے۔ شہر کے چاروں طرف پھلوں کے باغ تھے۔ زرخیز کھیت تھے۔ دریا کے آر پار گھنے جنگل تھے۔ باغبان پورہ، کوٹ خواجہ سعید، چاہ میراں اور سُلطان پورہ، جواب لاہور ہی کا حصّہ ہیں، پہلے لاہور کے دیہات ہوتے۔ انگریز کے زمانے میں مغل پورہ میں ریلوے کی ورکشاپ اور انجن شیڈ بننے کے بعد گڑھی شاہو اور ان سارے گاؤں کی بہت ترقی ہوئی۔ اچھرا اور مزنگ جواب لاہور کا خوبصورت علاقہ ہے، کبھی بڑے گاؤں ہی تھے۔ تب شاہدرہ بھی ایک قصبہ ہی تھا اور مقبرہ جہانگیر، مقبرہ نور جہاں اور بارہ دری کامران کی وجہ سے ہی اس کی اہمیت تھی۔ دریا راوی کا رُخ شہر کی طرف تھا اور سیلاب کے دنوں میں اکثر پانی ٹکسالی اور بھاٹی دروازے تک آجاتا تھا۔ لاہور شہر اونچائی پر بسا ہونے کی وجہ سے سیلاب سے محفوظ رہتا تھا۔

انگریز نے بیشک ہندوستان پر حکومت کی، اسے لُوٹا بھی لیکن اپنی قابلیت اور عقلمندی

سے اسے دیا بھی بہت کچھ ہے۔ ریلوے، ڈاک تار، انصاف وقانون، تعلیم، انجینئرنگ، میڈیکل اور انتظامی قابلیت انگریزوں نے ہی دی۔ بجلی، موٹر سائیکل، بسیں، ہوائی جہاز وغیرہ بہت سی جدید اشیاء، سہولیات اور کلچر اُسی کا فراہم کرایا ہوا ہے۔ لاہور کو انگریزوں نے اپنی حکومت کا ایک بڑا مرکز بنایا تھا اور اُس نے اس شہر کو یہ تمام سہولیات میسّر کیں۔

ٹکسالی دروازے کے اندر بازار شیخو پوریاں اپنے قدیم شکل وصورت میں تھا۔ وہاں عزیز تھیٹر کی وجہ سے کافی رونق رہتی تھی۔ یہیں رنڈیوں کی گلی بھی تھی اور لاہور کے سارے رنڈوے اور غیر شادی شدہ نوجوان یہاں آ جاتے تھے۔ اس گلی میں بڑے بڑے ڈرامے ہوتے تھے۔ بہت سی خوبصورت جوان لڑکیاں بھٹکتی ہوئی یہاں دلالوں کے ہتّھے چڑھ جاتی تھیں اور بعد میں ہیرامنڈی کی رونق بن جاتی تھیں۔ چھوٹے پیمانے کا دھندہ اس گلی میں بھی ہوتا تھا۔ کوٹھوں پر عموماً پہاڑی علاقوں کی عورتیں ہی ہوتی تھیں۔ آوارہ گردی کرنے والے آدھی رات تک گلی سے چلے جاتے اور اس کے بعد پیسہ خرچ کرنے والے ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی سبھی طرح کے گاہک آتے تھے۔

مُجرے کا بازار الگ تھا جہاں ناچ گانا سُننے والے امیر لوگ ہی جاتے تھے۔ ناچ گانے کے ساتھ شراب اور کباب کے دور بھی چلتے اور طبلے وسارنگی کے ساتھ گھونگھرُوں کی چھنا چھن کی صدائیں اور نغموں کی محفلیں دیر رات تک قائم رہتیں۔

ہیرامنڈی کا یہ نام کیسے پڑا، کسی کو پتہ نہیں لیکن سچ مُچ تھی یہ ہیروں کی منڈی۔ مُغل شہزادوں اور شہزادیوں کی رہائش گاہیں یہاں سے قریب ہی تھیں اور اُس دور میں سچ مچ یہاں ہیرے ہی بکتے تھے اور اسی لئے یہ جگہ ہیرامنڈی کے نام سے مشہور ہوئی لیکن بعد میں یہی جگہ بدنام ہیرامنڈی ہوگئی۔

ہیرامنڈی کے چاروں طرف کا ماحول اس وقت عجیب تھا۔ دریا سے لے کر بڈھے دریا اور پھر ٹکسالی دروازے کے سامنے والی سڑک تک کھیت اور کوئیں تھے۔ شیخو پوریاں بازار کے پیچھے مُغلوں کے وقت کی خستہ حالت ہو چکی ایک چوڑی اور اونچی دیوار تھی۔ اس سے آگے شاہی مسجد تک کوئی عمارت اور سڑک نہیں تھی۔ بارود خانے کے نزدیک تک کچّی اور قلعے کی سیڑھیوں تک ہموار سپاٹ زمین تھی۔ نوگزے پیر سے قلعے تک گھاس منڈی تھی۔ پانی والا تالاب، چُونا منڈی،

سید مٹھا بازار وغیرہ اس طرف کی آبادیاں کافی خوبصورت تھیں۔ شاہی قلعے کی اُونچی دیواریں، حضوری باغ، شاہی مسجد، مہاراجا رنجیت سنگھ کا مقبرہ اور منٹو پارک کے علاقے بیحد خوبصورت تھے۔ دوسری طرف ٹبّی تھانہ تھا۔ تحصیل بازار تھا جہاں تحصیل داروں کے دفتر تھے جو 1923 میں کچہری میں منتقل ہو گئے تھے۔ بازار حکیماں کی طرف سے آنے والا چوک بھی کافی رونق والا تھا۔ بازار اور کٹڑی لطیف جج، اس کے آگے ٹھٹھی ملاحاں اور اس کے آگے چومالا کا علاقہ شروع ہو جاتا ہے جس کا تعلق بھاٹی گیٹ سے تھا —— یہ تھا ہیرا منڈی کا چوطرفہ!

ٹکسالی دروازے سے بھاٹی دروازے تک گھنے اور بہت خوبصورت باغ تھے جہاں ہمیشہ پھولوں کی بہار رہتی تھی۔ نہر بھی بہتی تھی۔ بھاٹی دروازے کے باہر بکروں کی منڈی اور باہر چوک تک مٹی کے برتنوں کی دوکانیں تھیں۔ رنگ محل، اچھرا اور دوسری طرف جانے کے لیے تانگے اور ٹمٹموں کا اڈہ تھا۔ بھاٹی سے اسٹیشن تک کا کرایہ دو پیسے فی سواری تھا۔ لاہور کے ہر دروازے کے باہر اسی طرح کی دوکانیں وغیرہ ہوتی تھیں اور ایک اکھاڑہ بھی ہوتا تھا۔ موچی دروازے کے باہر مونگ پھلی، چنے، مکھانے وغیرہ کی دوکانیں ہوتی تھیں جو وہاں آج بھی ہیں۔ شاہ عالمی دروازے کے باہر تب سے لے کر آج تک مٹی کے برتنوں کی دوکانیں ہیں۔ موری دروازے کے باہر مچھلی کی دوکانیں، یکی اور مستی دروازوں کے باہر گھاس منڈیاں اور تانگوں کے اڈے تب سے اب تک ہیں۔ دو روپے فی تانگہ رشوت کے علاوہ پاس کرانے کی سرکاری فیس بھی تھی۔ خاکی وردی، پگڑی اور پاجامہ پہننا کوچوان کے لئے لازمی تھا۔ پگڑی کے اوپر پیتل کا ایک بلاّ چوڑی بیلٹ پر لگا کر لپیٹنا ہوتا تھا۔ تانگے میں تین سواریاں اور چوتھا کوچوان ہوتا تھا۔ شام کے بعد تانگے کے دونوں طرف لیمپ جلانے ضروری تھی۔ چالان ہونے پر ایک سے دو روپے جُرمانہ ہوتا تھا اور محفوظ رہنے کے لئے رشوت دو آنے تھی۔ سائیکل کا چالان بھی ہوتا تھا۔ سائیکل پر گھنٹی لگانا لازمی تھی اور رات کو لیمپ بھی جلانا پڑتا تھا ورنہ سائیکل کا چالان ہوتا تھا۔ لوگ سائیکل کو خوب سجا سنوار کر رکھتے تھے۔ اس پر دوسری سواری بٹھانا منع تھا۔ پہلے جب سائیکل ولایت سے آئی تو مہنگی تھی اور جب یہاں بننے لگی تو اس کی قیمت بیس پچیس روپے تھی۔

کلرک اور سپاہی کی تنخواہ دس بارہ روپے فی ماہ تھی۔ پہلے پہل ایک پیسے کی دو روٹیاں اور دال مفت ملتی تھی۔ بعد ازاں روٹی ایک پیسے کی اور دال مفت ملتی رہی۔ بعد میں ایک آنے کی

روٹی دال کے ساتھ ملتی تھی۔ چار آنے سیر چھوٹا اور دو آنے سیر بڑا گوشت فروخت ہوتا تھا۔ لاہور میں آٹا ایک روپے کا تیس سیر ملتا تھا۔ دیسی گھی کی قیمت دس بارہ آنے سیر، چینی ایک روپے کی آٹھ سیر فروخت ہوتی تھی لیکن تب بھی لوگ کہتے تھے کہ مہنگائی بہت ہے۔

چوری اس وقت بھی ہوتی تھی۔ مسجدوں سے ٹوپیاں اُتارنے اور جوتے چُرانے کا رواج تھا۔ جیب کترے بھی ہوتے تھے۔ گھروں میں اس وقت چرخہ کاتنے کا عام رواج تھا۔ کھدّر، کھیس، چادریں وغیرہ چھوٹی چھوٹی کھڈیوں پر بھی بُنی جاتی تھیں۔ تیور، بیور، پھلکاریاں کڑھائی والی عام استعمال ہوتی تھیں اور داج جہیز میں بھی دی جاتی تھیں۔ ہندو عورتیں کالے رنگ کے گھاگرے پہنتی تھیں اور گوالوں کی عورتیں دھاری دار رنگین گھاگرے پہنتی تھیں۔ عام عورتیں شلوار پہنتی تھیں۔ استعمال ہونے والے سبھی طرح کے دھاری دار، سوتی، سوسی، مارکین، ململ، لٹھا اور ریشمی کپڑوں کی قیمت دو سے چار آنے فی گز ہوتی تھی۔ بہت بعد میں بوسکی، جاپانی کا لٹھا، چھیّنٹ کی ململ، کریپ وغیرہ کپڑوں کا رواج شروع ہوا۔ سردی کے موسم میں عورتوں کے لیے خوبصورت گرم چادریں اور مردوں کے لیے گرم کمبل، دُھسّے، گرم پٹی کے کوٹ، فتوحیاں، روئی دار بنڈیاں وغیرہ پہننے کا رواج شروع ہوا۔

کھانے پینے میں ہمیشہ سے لاہور شوقین مزاج رہا ہے۔ صبح سویرے بچّے، بڑے بوڑھے، جوان سبھی دودھ دہی کی دوکانوں اور حلوائیوں کے سامنے موجود ہوتے۔ لسّی، کلچہ، حلوہ۔ پوری یا سری پائے اور کُلچے کا ناشتہ عام تھا۔ گھروں میں بھی عموماً اسی طرح کا ناشتہ کھایا جاتا تھا۔ بعض گھروں میں پراٹھا اور سبز چائے کا ناشتہ بھی چلتا تھا۔ کھانے میں عموماً روٹی ہی کھائی جاتی تھی۔ مٹھائی کی دوکانیں زیادہ تر ہندوؤں کی تھیں۔ مسلمانوں کی دوکانیں کھیر، کھویا اور گاجر کے حلوے کی ہوتی تھیں اور وہ سیخ کباب اور شامی کباب بھی فروخت کرتے تھے۔ دیسی گھی کا استعمال ہوتا تھا۔ سید مٹھا بازار میں ننگو شاہ حلوائی کی دوکان بہت مشہور تھی۔ ذرا آگے لوہاری منڈی کی طرف لبھّا دھوبی پہلوان کی دودھ دہی کی دوکان تھی جس کی لسّی بہت مشہور تھی۔ ڈبّی بازار میں مولا ماش کی دال والا نام سے بہت مشہور تھا۔ لاہور کے چکڑ چھولے بہت مشہور تھے جسے ہندو اور مسلمان دونوں ہی بناتے تھے۔

بچّے صبح سویرے ایک پیسہ لے کر نکلتے تو دوکان والا پُوڑی پر حلوہ رکھ دیتا۔ دودھ دہی

والا کُلچے پر دہی رکھ دیتا۔ کسی دوکان پر کُلچے کے اوپر دو لوچڑے رکھ دیتے۔ لوچڑے گول پکوڑوں جیسے ہوتے تھے۔

ہندو مسلمان مل جل کر رہتے تھے۔ گُلی ڈنڈا ساتھ کھیلتے۔ پتنگیں ساتھ اُڑاتے۔ اکھاڑوں میں زور بھی اکٹھے کرتے۔ شراب، چرس اور بھانگ بھی ساتھ ساتھ پیتے پلاتے۔ کاروبار پر، منڈیوں، کارخانوں اور فیکٹریوں پر ہندوؤں کی حکومت تھی لیکن وہاں کام کرنے والے مزدور کاریگر مسلمان بھی ہوتے تھے۔ کاریگر زیادہ مسلمان ہوتے تھے۔ شادی بیاہ میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں بھاجی وغیرہ کا لین دین ہوتا تھا۔

بیاہ شادی کے رسم ورواجوں میں پرانے وقتوں سے لے کر اب تک بنیادی طور پر کوئی خاص فرق نہیں پڑا۔ زیادہ تر رسم ورواج وہی ہیں۔

آج لوگ دن دہاڑے بے پردہ ہوگئے ہیں۔ تب پردے کا بہت رواج تھا۔ عورتوں نے کہیں آنا جانا ہوتا تو تانگہ گھر کی سیڑھیوں کے ساتھ لگا دیا جاتا۔ عورتوں کے تانگے میں سوار ہونے کے بعد تانگے کے دائیں، بائیں اور پیچھے سے کپڑے سے ڈھانپ دیا جاتا۔ مسلمان عورتیں بھاری بُرقعہ پہنتی تھیں۔ گھونگھٹ کا بہت زیادہ رواج تھا۔ دُلہنیں دو دو سال تک اپنے خاوند سے گھونگھٹ نکالتی تھیں۔ سُسر، جیٹھ، گھر کے اور بڑے بزرگ اور محلّے کے بڑے بوڑھوں سے عمر بھر گھونگھٹ نکالا جاتا تھا۔

ہندوستان میں سب سے زیادہ ''سر'' کہلانے والے لوگ لاہور میں تھے۔ سب سے زیادہ ''خان بہادر'' اور ''رائے بہادر'' بھی اس شہر میں تھے۔ ان میں سے کچھ مشہور نام اس طرح تھے — سر گنگا رام، سر چھوٹو رام، سر شادی لال، سر صنوبر لال، راجہ سر یندر ناتھ، سر عبدالقادر، سر سکندر حیات، سر خضر حیات ٹوانہ — اور بہت سے مزید ''سر''، رائے بہادر اور خان بہادر تھے۔ انہیں انگریزوں کے وفادار کہا جاتا تھا۔ لوگ انہیں ''ٹوڈی بچہ'' بھی کہتے تھے۔

1930 تک سماج میں کافی تبدیلی آچکی تھی۔ تعلیم کا چلن بڑھ چکا تھا۔ لڑکے لڑکیاں برابر تعلیم حاصل کرنے لگے تھے۔ مندروں اور مسجدوں کا شہر لاہور اسکولوں اور کالجوں کا شہر بنتا جا رہا تھا۔ گورنمنٹ کالج، اسلامیہ کالج، دیو سماج کالج، دیال سنگھ کالج اور ایف سی کالج تو برسوں پہلے ہی سے قائم تھے۔

آواز یعنی بولنے والی فلمیں بھی آ گئیں تھیں۔ لاہور کی سڑکوں پر موٹر سائیکلوں اور موٹروں کاروں کی تعداد میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ بس سروس شروع ہو گئی تھی اور سب سے پہلی نندہ بس لاہور میں شروع ہوئی تھی۔ آبادی میں اضافہ ہونے لگا۔ کارخانے اور کاروبار بھی بڑھنے لگے۔ لوگوں کا رہن سہن بھی بدلنے لگا۔ اندرون شہر لاہور سے باہر کے علاقوں میں نئی بستیاں بھی آباد ہونے لگیں۔

ہندوؤں کے مرگھٹ (شمشان)، سمادھیاں، گئو شالائیں، اناتھ آشرم، وِدھوا آشرم، دھرم شالائیں اور بہت سی دُوسری ایسی جگہیں شہر میں تھیں۔ ہندو زیادہ امیر بھی تھے اور رحمدل بھی تھے۔ دوسری طرف مسلمانوں میں امیر، رئیس اور نواب تھے لیکن فلاح کے کاموں میں وہ ہندوؤں سے پیچھے تھے۔ مسلمانوں کا سب سے بڑا تعلیمی ادارہ اسلامیہ کالج تھا جبکہ ہندوؤں کی طرف سے بہت سے کالج، اسکول اور لائبریریاں قائم کئے گئے تھے۔ ان کے علاوہ لاہور میں گنگا رام ہسپتال، گلاب دیوی ہسپتال (گلاب دیوی لالہ لاجپت رائے کی ماتا کا نام تھا اور گلاب دیوی ہسپتال انہوں نے اپنی ماتا کی یاد میں قائم کیا تھا)، جانکی دیوی ہسپتال، سِکھ نیشنل کالج، لاہور کالج فار وومن، فتح چند کالج فار وومن وغیرہ بھی قائم کئے گئے تھے۔ انگریز سرکار کی طرف سے لاہور میں میو ہسپتال، میڈیکل کالج، ریلوے کا کیرین ہسپتال، ڈینٹل کالج اور لیڈی ویلینگٹن کالج کھولے گئے تھے۔ لاہور میں ہر سطح پر ہر طرح کے تعلیمی اداروں کا جال سا بچھا ہوا تھا۔

کپڑوں کی سلائی یعنی ٹیلرنگ میں بھی لاہور کا بڑا نام تھا۔ مال روڈ پر پٹ مین (Pitman) بال مودی اور ریکن نام سے ٹیلرنگ کی تین بڑی دوکانیں تھیں اور ان کے مالک انگریز تھے۔ ان کے علاوہ شہر میں مسلمان اور ہندوؤں کی بہت سی دوکانیں تھیں جہاں سلائی کا بہترین کام ہوتا تھا۔

اس سب کے علاوہ لاہور میں ہر شعبے میں ترقی کے ساتھ تبدیلی بھی آئی اور اس کا اثر ان کی سماجی زندگی پر بھی پڑا۔

لاہور کے میلے، تیوہار، بارہ دروازے، انارکلی، مال روڈ، ہیرا منڈی، عُرس، فلمیں، اخبار اور لاہور شہر کی بہت سی خصوصیات کا تفصیلی ذکر آگے چل کر کریں گے۔

میں لاہور ہوں

کہتے ہیں کہ ہر بڑے شہر کا ایک دریا ہوتا ہے — لندن کا ٹیمز، پیرس کا سین، نیویارک کا ہڈسن، واشنگٹن کا پوٹومیک، آگرہ کا جمنا اور میونخ کا نار۔ سب دریا اپنے اپنے شہر کے ساتھ صدیوں سے بہہ رہے ہیں لیکن لاہور کے دریا راوی کی ادا ہی نرالی ہے۔ رُوٹھ کر دُور چلے جانے اور پھر جوشِ محبت میں قریب آجانے کی ادا بس اِسی دریا کی ہے۔ کبھی راوی شہر کی فصیل (دیوار) کے ساتھ ساتھ بہتا تھا۔ پھر جب ایک بار روٹھ کر دُور گیا تو پہلے لاہور نے اُسے بڈھا راوی کہنا شروع کر دیا۔ مصر کے نیل اور یورپ کے نیلے ڈینیوب کا پانی نیلا نہیں لیکن لاہور کے حُسن میں اضافہ کرنے والے راوی کا پانی گلابی رنگ سا ہے — گلاب جیسا!

لاہور شہر میں ہر چیز رنگین ہے۔ لاہوری دروازے پر مچھلی کھائیں، سُرخ رنگ سے رنگی ہوئی۔ چائے پئیں تو معلوم ہو کہ دودھ کو گلابی رنگ میں رنگ دیا گیا ہے۔ مونگ پھلی یا چنے کھائیں تو وہ بھی سُرخ — شاید اس لئے کہ راوی جس شہر کا دریا ہے وہ رنگوں اور رنگینیوں کا شہر ہے۔ بسنت کے موسم میں تو لاہور کا آسمان تک بسنتی رنگ کا ہو جاتا ہے۔ بسنت کے روز پورا لاہور پتنگیں اڑاتا ہے اور پتنگیں لُوٹتا ہے۔

لگ بھگ پانچ ہزار سال قبل اسی شہر کے دریا راوی کے کنارے رِشی بالمیک نے رامائن لکھی تھی۔ کہتے ہیں، اس شہر کو بھگوان رام کے بیٹے لَو نے بسایا تھا اور لاہور کے قریب ایک دوسرے شہر قصور کو ان کے دوسرے بیٹے کُش نے قائم کیا تھا۔ لاہور تاریخی، ثقافتی، ادبی، جنگی، روحانی اور بسنتی شہر ہے۔ دھارمک گرنتھ رِگ وید کے کئی حصّے اس شہر میں لکھے گئے اور ہندو مذہب کے پھیلاؤ میں اس شہر کا بڑا دخل رہا۔ بدھ دھرم کا آغاز یہاں سے ہوا۔ راجہ اشوک اور اُن کے دادا

چندر گپت موریہ اسی شہر کے باشندے تھے۔ سِکھ دھرم کے بانی گورونانک دیوجی دریاراوی کے نزدیک شرق پور کے علاقے گاؤں تلونڈی میں پیدا ہوئے تھے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی قیادت میں سِکھ حکومت کی راجدھانی کا فخر بھی اسی شہر لاہور کو حاصل ہوا۔ سِکھ حکومت سے قبل مغل حکومت اور بعد میں انگریز حکومت کا مرکز بھی یہ شہر رہا۔

لاہور آزادی کی لڑائی کا شہر بھی ہے۔ مشترکہ ہندوستان کے دور میں انگریزوں کے خلاف آزادی کی لڑائی میں اس شہر نے بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔ لاہور تحریکِ پاکستان کا شہر بھی ہے۔ 23 مارچ 1940 کو اس شہر کے منٹو پارک میں پاکستان کے لئے تجویز پاس ہوئی تھی۔ لاہور آزادی کے پروانوں بھگت سنگھ، راجگورو اور سُکھ دیو کے حوالے سے بھی جانا جاتا ہے۔ اسی شہر نے آزادی کی لڑائی کو ایک تحریک کی شکل دی تھی۔

لاہور کی پہلی مسجد 912 ہجری میں محمود غزنوی نے بنوائی تھی۔ بعد میں یہاں سینکڑوں مسجدیں بنیں جن میں ''مسجد شب بھر'' بھی ہے۔ کہتے ہیں کہ اسے رات بھر میں تعمیر کردیا گیا تھا اور اس کے معماروں میں علامہ اقبال اور گاما پہلوان بھی شامل تھے۔ اسی مسجد کے حوالے سے علامہ اقبال نے یہ شعر کہا تھا ——

مسجد تو بنا دی شب بھر میں
ایماں کی حرارت والوں نے
من اپنا پُرانا پاپی ہے
برسوں میں نمازی بن نہ سکا

لاہور شہر میں کبھی مندر، گورودوارے اور شوالے بھی بے شمار تھے۔ بادشاہ جہانگیر کا مقبرہ بھی لاہور میں ہے۔ کھجوروں کے باغات میں گھری ہوئی اس عمارت میں چار مینار ہیں۔ یہاں نور جہاں کی قبر بھی ہے ''جس پر نہ پھول ہوں گے اور نہ چراغ'' —— ایسا ملکہ صاحبہ کے حکم کی وجہ سے ہے جو آج بھی چل رہا ہے۔ لاہور کے لوگ داتا کی نگری کے نام سے بھی جانے جاتے ہیں۔ یہاں داتا گنج بخش کا مزار ہے جس سے لاہور والے بے پناہ عقیدت بھی رکھتے ہیں اور محبت بھی۔ اسی شہر میں حضرت میاں میر کا مزار بھی ہے جو انسانیت کا درس دیتا ہے۔ حضرت میاں میر وہ صوفی سنت ہوئے ہیں جنہوں نے دربار صاحب امرتسر کا سنگِ بنیاد رکھا تھا۔ لاہور

کے مندر، مسجد اور گورودواروں نے جہاں دھرم کے یقین کو ایک مقدس یقین عطا کیا ہے وہاں شالیمار باغ، شاہی قلعہ، انار کلی، مال روڈ وغیرہ نے اس شہر کو خوبصورتی اور رونق عطا کی ہے۔

لاہور مشترکہ ہندوستان کا بالی وُڈ بھی تھا۔ فلمی دُنیا میں ایک سے بڑھ کر ایک ستارے یہیں چمکے اور بیشمار کامیاب فلمیں بھی یہیں بنیں۔ لاہور تعلیمی اداروں کا بھی شہر ہے۔ پہلے یہاں پنجاب یونیورسٹی تھی، اب بہت سی یونیورسٹیاں موجود ہیں۔ پاکستان کا سب سے بڑا ریلوے اسٹیشن بھی یہیں قائم ہے۔

لاہور کسی وقت چھپائی (طباعت) اور صحافت کا بھی مرکز رہا ہے۔ یہاں سے ایک زمانے میں ''پیسہ'' اخبار جاری ہوا پھر ''زمیندار'' کے چرچے ہوئے۔ انگریزی روزنامہ ''ٹربیون'' اور اُردو اخبارات ''ملاپ''۔ ''پرتاپ''۔ ''پربھات''۔ ''نوائے وقت''۔ ''کوہستان'' وغیرہ اخبار لاہور کی صحافت میں انقلاب لے کر آئے۔
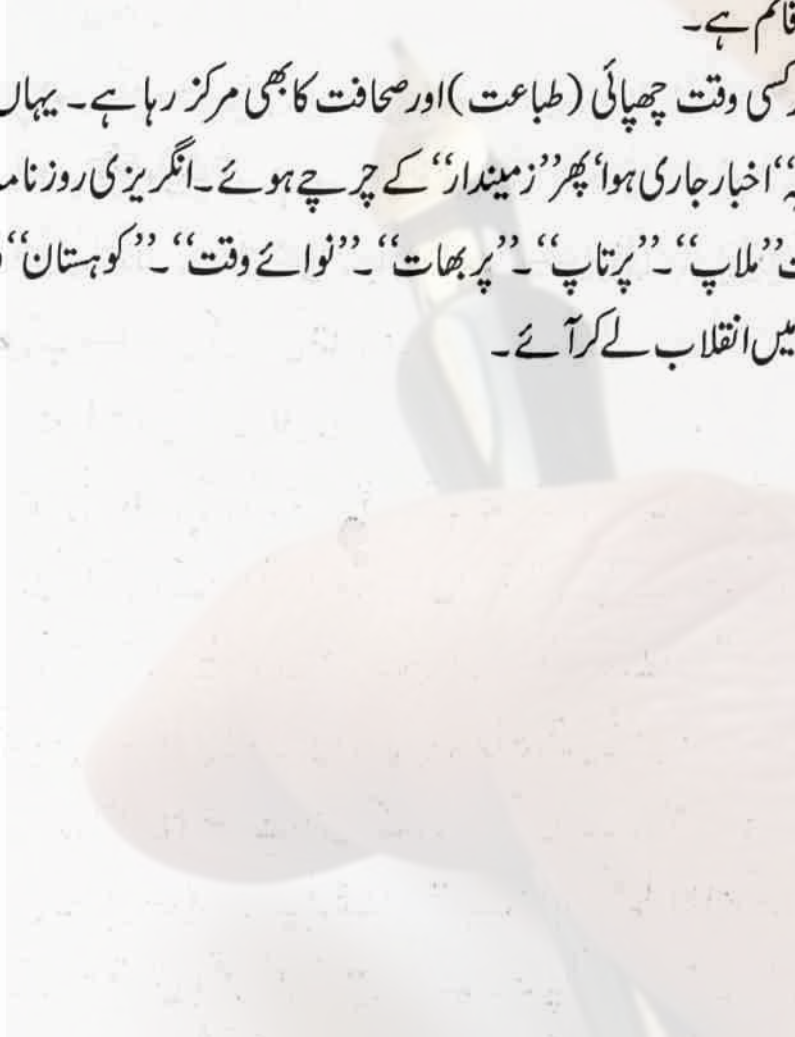
یادوں کا ذائقہ

لاہور روشنیوں کا شہر ہے۔

اس کے نظارے دل میں سما جانے والے — اس کی بہاریں دل نشیں — اس کی ادائیں دلفریب — اوراس کی تاریخ شاندار۔

لاہور کی تاریخ بہت پرانی ہے۔

تاریخ گواہ ہے کہ وقتاً فوقتاً کئی شہر آباد ہوئے، پھر برباد ہوئے لیکن دوبارہ آباد نہیں ہو سکے۔ تاریخ دانوں کے مطابق لاہور، اربیل اور دمشق دُنیا کے ایسے قدیم ترین شہر ہیں جو صدیوں سے مسلسل آباد چلے آ رہے ہیں۔ ماہرین آثار قدیمہ کے مطابق لاہور وقتاً فوقتاً نیا پرانا ضرور ہوا لیکن ہڑپا اور موہن جوداڑو کی طرح تباہ ہو کر آثار قدیمہ نہیں بنا۔

لاہور کتنا پُرانا شہر ہے، اس کے بارے یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ چوتھی صدی ہجری یا نویں عیسویں صدی سے پہلے تک اس شہر کے نام اور تفصیل کا ذکر کہیں نہیں ملتا بلکہ محض اندازے کے مطابق ہی باتیں کہی گئی ہیں۔ سب سے پہلے 1695 میں مورّخ سبحان سنگھ دھیر (بٹالوی) نے یہ روایت پیش کی کہ لاہور کو راجا رام چندر کے بیٹے لَو نے آباد کیا۔ ان کے علاوہ کئی دوسرے مورخوں نے بھی اسی بات کی تائید کی۔ جیمز ٹاڈ نے لکھا ہے کہ ''رام چندر کے دو بیٹے تھے — لو اور کُش۔ ان میں سے لو نے لاہور بسایا۔''

سر رچرڈ ٹیمپل کے خیال میں — ''لاہور لاہو اور سے ہے جس کے معنی ہیں لاہ کا قلعہ اور یہ عام طور پر لو سے متعلق ہے۔''

بُوٹے شاہ، محمد باقر، نور احمد چشتی وغیرہ مشہور تاریخ دانوں نے بھی اسی بات کی تائید کی

ہے۔رائے بہادر کنہیالال نے اپنی کتاب ''تاریخ لاہور'' میں لکھا ہے—''مہاراجہ رام چندر کے بیٹے لو نے یہ شہر آباد کیا اور اس کا نام ''لو پور'' رکھا۔ ہزاروں سال گذرنے کے بعد لو پور لفظ بگڑ کر لاہور مشہور ہو گیا۔''—بارہویں صدی کے ایک مورّخ مرتضیٰ حسین نے بھی اس کی تائید کی ہے۔ ایک اور مورّخ گلاب سنگھ نے اس کی تائید ان الفاظ میں کی ہے——''لاہور کے مختلف نام ہیں— مثلاً لاہار، لوہاور، الاہاور وغیرہ۔'' ہندو خیال کے مطابق مہاراجہ رام چندر کے بیٹے لو سے یہ شہر تعلق رکھتا ہے۔لو کی حکومت کے خاتمے کے بعد اس شہر کی جگہ سیالکوٹ نے لے لی۔ محمود غزنوی کے دورِ حکومت میں لاہور شہر کو دوبارہ آباد کیا اور یہاں ایک مضبوط قلعہ بنوایا۔''

اگرچہ زیادہ تر مورّخ اور تاریخ دان راجہ رام چندر کے بیٹے لو کو ہی شہر لاہور کو قائم کرنے والا راجہ مانتے ہیں لیکن کہیں کہیں اس بات سے اختلاف رکھتے ہوئے ''بعض لوگ مختلف رائے رکھتے ہیں۔ خواجہ عبدالرشید نے جدید ریسرچ کے مطابق لکھا ہے کہ جب آریہ ونش کے لوگ اس خطّے میں آئے اور وہ سندھ وادی میں بڑھتے ہوئے لاہور پہنچے تو انہوں نے اس کا نام ''لاآر'' رکھ دیا، جو بعد میں آہستہ آہستہ لاہور ہو گیا۔ اس بات کو لگ بھگ پانچ ہزار سال ہو چکے ہیں۔

تاریخ داں شیخ احمد زنجانی نے ہجری 435 میں لکھا تھا کہ اس شہر کو سب سے پہلے راجہ پریکشت (جو پانڈوؤں کی اولاد میں سے تھا) نے آباد کیا۔ بعد میں یہ شہر قہر کا شکار ہو کر اُجڑ گیا اور سینکڑوں سال تک یہ دھرتی اجاڑ اور ویران رہی۔ جب راجہ وِکرماجیت کا دور آیا تو اس شہر کو دوبارہ آباد کیا گیا۔ مگر یہ شہر ابھی اچھی طرح سے آباد بھی نہیں ہوا تھا کہ راجہ وِکرماجیت مر گیا اور سمند پال نے اس شہر کا نام ''سمند پال نگری'' رکھا۔ پھر جب راجا دیپ چند دہلی کے تخت پر بیٹھا تو اس نے پنجاب کا علاقہ اپنے بھائی لاہور چند کو جاگیر میں دے دیا۔ اس نے اس شہر کو اپنی راجدھانی بنایا اور اس کا نام ''لوہار پور رکھا اور بعدازاں یہ شہر آہستہ آہستہ لاہور ہو گیا۔

تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ جب محمود غزنوی نے پنجاب پر حملہ کیا تو اس وقت اس شہر کا نام لاہور مشہور تھا اور یہاں جے پال کی حکومت تھی۔ محمود غزنوی نے اسی شہر کو اپنی راجدھانی بنایا۔ اس کے بعد تُغلق اور خلجی لگ بھگ اڑھائی سو سالوں تک حاکم رہے۔ یہاں لودھیوں نے بھی حکومت کی اور ان کے بعد مُغل حکومت کا دور شروع ہوا۔ بابر، ہمایوں اور پھر اکبر بادشاہ آئے۔ اکبر کے عہد میں لاہور نے سب سے زیادہ ترقی کی۔ اکبر نے لاہور شہر کے اردگرد فصیل (دیوار)

کی تعمیر کرائی۔ لاہور کے بارہ دروازے بھی اسی زمانے میں بنے۔ اکبر کے بعد بادشاہ شاہجہاں نے بھی لاہور کی عظمتوں کو برقرار رکھا۔ اس کے بعد اورنگ زیب کا دور آیا۔ اگرچہ وہ لاہور کم ہی آئے لیکن اس شہر کی آن۔ بان اور شان میں کوئی کمی نہیں آئی۔

لاہور نے اس کے بعد سکھ حکومت کو بھی اپنی آغوش میں پالا اور انگریزی حکومت کے ناز نخرے بھی برداشت کیے۔ پھر ہندوستان کا بٹوارہ ہوا تو اس بڑے شہر نے بڑے صدمے برداشت کیے لیکن اس کی عظمتوں میں کوئی کمی نہیں آئی۔ یہ پاکستان کے عوام کے دلوں کی دھڑکن بن کر آج بھی اپنی عظمتوں کا پرچم بلند کیے ہوئے ہے۔

لاہور کل بھی لاہور تھا، آج بھی لاہور ہے۔ ہزاروں سال کے اتہاس کی پوری شان و شوکت، آب و تاب اور بے پناہ عظمتوں کو اپنی آغوش میں سمیٹے لاہور زندہ دلوں کا گہوارا ہے۔

لاہور کی گلیاں

کئی بار آپ کسی کی آنکھوں سے سفر کرتے ہیں۔ وہ سفر سب سے الگ ہوتا ہے، بہت خوب ہوتا ہے۔ اس میں تاریخ ہوتی ہے، یادیں ہوتی ہیں، وعدے ہوتے ہیں اور دُور کہیں بچپن کی پریوں کی کہانیاں بھی۔

رائے صاحب سنتوش کمار کا جنم لاہور میں ہوا۔ اُن کا بچپن اور جوانی لاہور میں گذری۔ ملک کی تقسیم یعنی بٹوارے کے بعد وہ لاہور سے دہلی آ گئے — لیکن لاہور کو اپنے آپ سے الگ نہیں کر سکے — لاہور محض ایک شہر ہی نہیں، لاہور بے شمار طویل کہانیوں کا ایک انوکھا، شاندار اور خوبصورت شہر ہے۔ لاہور کی ان طویل کہانیوں کو سُننے سے پہلے ہم رائے بہادر سنتوش کمار کی لاہور کی کہانی سُنتے ہیں — اور اُس کے بعد لاہور کی داستان۔

رائے بہادر سنتوش کمار کی خواہش تھی کہ مرنے سے پہلے ایک بار وہ لاہور جانا چاہتے ہیں۔ لاہور کی ہواؤں اور فضاؤں کی مہک محسوس کرنا چاہتے ہیں۔ لاہور کی ان گلیوں میں جہاں بچپن گذرا، ان سڑکوں پر جہاں جوانی نے جذبات کو دھڑکنا سکھایا — وہ ایک بار پھر اُسی دھرتی کا لمس حاصل کرنا چاہتے ہیں — اور آخر ایک دن ایسا آ ہی گیا کہ اُن کے دل کی مُراد پوری ہو گئی اور وہ ہمارے ساتھ لاہور پہنچ گئے۔

میں جب جب بھی لاہور آتا ہوں تو مجھے مال روڈ پر واقع جیم خانہ کلب میں قیام کا موقع میسّر ہوتا ہے۔ اب کی بار بھی جب ہم جیم خانہ کلب پہنچے تو رائے صاحب فوراً بولے — ''یہ شہر انگریزوں کا ہے۔ آؤ، تمہیں میں اپنا شہر دکھاؤں'' — اور جب ہم پُرانے شہر میں پہنچے تو پہلی بار لاہور کو میں نے رائے صاحب کی آنکھوں اور قدموں سے دیکھا۔ وہ دیوانہ وار بڑھتے چلے

جارہے تھے۔ ان کے ایک ایک قدم میں کئی قدم اٹھ رہے تھے۔ اسی حالت میں ہم لاہوری دروازے سے سُوتر منڈی پہنچ گئے۔ ان کا بچپن موہلیاں محلّے میں پروان چڑھا تھا۔ وہاں سے ہوکر ہم کوچہ شامی ہوکاں کے آگے سے نکلے۔ بچپن میں وہ یہاں سے مُرغ خرید کرلڑایا کرتے تھے۔ کوچہ لیلیٰ مجنوں اور کوچہ پیر شیرازی سے گذرتے ہوئے ادھر جا نکلے جہاں گوکل پنڈت کا اکھاڑا اور اس کے سامنے ایک مشہور جنج گھر ہوا کرتا تھا۔

گمٹی بازار میں بالا کی بلڈنگ کے سامنے پانی والا تالاب سے ہوتے ہوئے ٹوٹیوں والے بازار سے گذرے۔ رائے صاحب نے بتایا کہ یہاں جو رونق پہلے ہوا کرتی تھی وہ اب بھی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے کوئی بھگوان داس مال بیچتا تھا، اب عبداللہ بیچ رہا ہے۔ پہلے یہاں بے پردہ ہندو عورتوں کی بھیڑ ہوتی تھی، اب بے پردہ مسلم عورتوں کے ٹھاٹھ تھے۔ دوکاندار پہلے بھی ''بہن جی'' کہہ کر عورتوں سے بات کرتے تھے اور آج بھی ''بہن جی'' ہی کہتے ہیں۔ ہم برہما ناتھ کے شوالے کے آگے سے بُچھوں والی میں داخل ہوئے (جسے اب وچھو والی کہا جاتا ہے) جبکہ شوالہ کا کوئی نام ونشان وہاں باقی نہیں تھا۔

اس کے آگے تنگ بازار سے گذرتے ہوئے رائے صاحب اچانک ایک بڑی عمارت کے آگے رُک گئے، بولے، یہاں سناتن دھرم سبھا کا اسکول اور پاٹھ شالا تھی۔ چھٹی جماعت تک میں بھی یہیں پڑھا ہوں۔ ہندی پڑھتا تھا۔ اسی جگہ ایک مندر بھی تھا لیکن اب یہاں کچھ بھی نہیں ہے۔ میں نے دیکھا، رائے صاحب کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ قدم کچھ آگے بڑھے۔ موڑ پر ''گنج دی ہٹّی'' ہوتی تھی جہاں گرمی کے موسم میں شربت اور سردی میں پتنگیں بکتی تھیں۔ بسنت سے پہلے بہت بھیڑ بھاڑ رہتی تھی۔ بچّے اکثر گایا کرتے تھے۔

گُنج دی ہٹّی جاواں گے
تے گُڈی ڈور لیانواں گے

بائیں طرف اننت شاہ حلوائی کی دوکان تھی، جواب نہیں تھی۔ تھوڑا آگے ''تیلیاں دی کھوئی'' سے ہوتے ہوئے ڈاکٹروں کے محلّے میں داخل ہوئے۔ اس تنگ راستے کے دونوں طرف لاہور کے مشہور ڈاکٹروں کے دوا خانے تھے۔ ایک کلینک میں ڈاکٹر گوپی چند بھارگو، ڈاکٹر نہال چند اور ڈاکٹر شنکر داس مہرہ اکٹھے پریکٹس کرتے تھے۔ ان کے کلینک کے پڑوس میں

پنڈت جواہرلعل نہرو کے ننہالی تھے۔ جواہر لال نہرو جی کے والد پنڈت موتی لال نہرو کی شادی راولپنڈی میں ہوئی تھی لیکن شریمتی سکارانی بچپن میں اسی محلّے میں کھیلا کرتی تھیں۔ لیکن بیتے دنوں کی کوئی چیز اب باقی نہیں تھی۔ یہاں سے پچھواڑے کی طرف سر گنگا رام ہسپتال وہاں اب بھی قائم تھا۔ اس کے پچھلی طرف آریہ سماج بچھووالی کا شاندار مندر بھی اب وہاں نہیں ہے۔

تقسیم کی درندگی نے شاہ عالمی دروازے کے آس پڑوس کی آبادی اور محلّے نگل لیے تھے اور یہاں سے رنگ محل تک کے حصّے کو بہت کھُلا کر دیا ہے، جو کہ دہلی کے چاندنی چوک سے زیادہ چوڑا اور خوبصورت نظر آتا ہے۔ اندرون شہر کے اس حصّے سے باہر نکل کر ہم نے مندر کا چمکتا ہوا ایک کلش دیکھا۔ شاید یاد کی طرح یہ محض ایک نشانی بچی تھی۔

مندر کے سامنے پہلے خیراتی شاہ کا ایک آیورویدک ہسپتال ہوتا تھا لیکن اب وہاں پر کوئی یونانی دواخانہ ہے۔ مندر کے بالکل قریب سے گذرتی ایک چھوٹی نہر ہوتی تھی جہاں چھوٹے بچے نہاتے تھے اور لوہاری دروازے کے باہر والی مسجد کے نمازی اس کے پانی سے وضو کرتے تھے اور کبھی کبھی منوہر لال کے مندر کی مورتیوں کو اسی کے پانی سے نہلایا جاتا تھا لیکن یہ نہر بھی اب وہاں نہیں تھی۔

رائے صاحب یادوں کے بھنور میں گھرے بہت دیر تک مندر کے کلش کو دیکھتے رہے ـــ وہ شاید اپنے ماضی کو ٹٹول رہے تھے۔

اُستاد دامن کے ساتھ

اُستاد دامن ہمارے پیر شاعر ہیں۔ ان کی شاعری کے دیوانے دونوں پنجابوں میں ہیں۔ پنجابی ناول نگار فرزند علی کا ناول ''پُھل'' انہیں کی زندگی پر ہے جسے دونوں پنجابوں کے لوگ اپنے سینے سے لگا کر رکھتے ہیں۔

لاہور ان گِنت لوگوں کے ماضی کا شہر — بے شمار لوگوں کے خوابوں کا نگر! میں اور رائے صاحب چیمبرلین روڈ اور نسبت روڈ کے چوراہے پر اُس جگہ کھڑے ہیں جہاں ملک کی تقسیم سے قبل اخبار روزانہ ''پرتاپ'' کا دفتر ہوا کرتا تھا۔ رائے صاحب بتا رہے تھے کہ یہاں کھڑے ہو کر ہم ان جلوسوں کو دیکھا کرتے تھے جو مارچ 1947 میں مشترکہ پنجاب کے آخری وزیر اعظم سر خضر حیات ٹوانہ کے استعفیٰ سے قبل مسلم لیگ نکالا کرتی تھی۔ فروری کے آخری ہفتہ میں ایک روز زوروں سے یہ خبر پھیلی کہ خضر حیات نے استعفیٰ دے دیا ہے۔ بہت بڑی تعداد میں سینکڑوں مسلم لیگ نوجوان خضر حیات کے خلاف نعرے لگا رہے تھے۔ جلوس میں سے کسی نے کہہ دیا کہ خضر حیات اب مسلم لیگ میں شامل ہو گیا ہے۔ تبھی بات کی بات میں کسی نے یہ نعرہ لگا دیا — ''تازہ خبر آئی اے — خضر ساڈا بھائی اے۔'' کچھ دیر یہی نعرہ لگتا رہا اور جلد بعد ہی جب اس خبر کے جھوٹ ہونے کا پتہ چلا تو پھر سے وہی پرانا نعرہ لگنے لگا۔ رائے صاحب تقسیم سے ٹھیک پہلے کی ایسی کئی کہانیاں سُناتے رہے جو آج بھی اُن کے ذہن میں زندہ تھیں۔

نسبت روڈ پر ہی ہمارے دوست مقبول دہلوی کا گھر ہے جو تقسیم کے وقت اپنے سپنوں کی دِلی چھوڑ کر رائے صاحب کے یادوں کے شہر لاہور آ بسا تھا۔ اس وقت وہ بھی ہمارے ساتھ تھا۔ اُس وقت جہاں سے ہم گذر رہے تھے وہاں فاطمہ میڈیکل کالج کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ رائے

صاحب چونک گئے، کچھ سوچتے ہوئے بولے، یہ تو پہلے بالک رام میڈیکل کالج تھا۔یہیں پر میں نے زندگی میں پہلی بار فسادات میں زخمیوں کے لئے خون دیا تھا۔اُن کا پورا وجود درد سے جیسے بھر گیا تھا۔قدم آگے بڑھے۔ چیرنگ کراس تھانہ سے آگے مال روڈ کو پار کرتے اسمبلی ہال کو دیکھا۔ دائیں طرف فلیٹیز ہوٹل تھا جواب کئی منزلہ ہو گیا تھا۔رائے صاحب بتا رہے تھے کہ اس زمانے میں آج جیسا ایئر کنڈیشن کا انتظام نہیں تھا۔ہال کو ٹھنڈا کرنے کے لئے تہہ خانے میں برف کی سِلیں ڈالی جاتی تھیں۔سردی کے موسم میں ہال کو گرم رکھنے کے لئے کوئلے کی انگیٹھیاں جلائی جاتی تھیں۔

ہم لوگ لاہور کے ٹکسالی دروزے کے باہر پہنچے تو مقبول نے بتایا کہ استاد دامن یہیں رہتے ہیں۔رائے صاحب اور میں نے ایک ساتھ ان سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔مقبول ہمیں سامنے خستہ حال عمارت کے ایک کمرے کی طرف لے گئے، دستک دی، دروازہ کھلا، سامنے استاد دامن خود تھے۔مقبول نے ہمارا تعارف کرایا تو استاد دامن ایک دم جذباتی ہوگئے اور اندر لے جا کر اپنی چارپائی پر اپنے ساتھ بٹھایا— گلے لگایا اور کہنے لگے— دنیا میں ہزاروں پیر پیغمبر آئے ہیں اور آج کے جدید دور میں گاندھی جیسے سنت بھی آئے ہیں۔سب نے انسانوں کو انسانیت کا درس دیا ہے لیکن کیا بات ہے کہ انسان پھر بھی درندے کا درندہ ہے۔جب اور جہاں موقع ملتا ہے، انسانیت کا جامعہ اتار کر درندگی کا ننگا ناچ دکھانے لگتا ہے۔سمجھ نہیں آتا کہ اس کا حل کیا ہے۔نہ جانے آدمی کب انسان بنے گا۔

استاد دامن کو خواجہ دامن اور پیر مُرشد بھی کہا جاتا ہے— پنجابی کے بہت بڑے شاعر، فلسفی اُردو کے استاد اور کئی زبانوں پر مہارت! چارپائی کے نزدیک کتابوں سے بھری ایک میز تھی۔ میز پر رکھا ایک لیمپ روشن تھا۔دو کرسیاں تھیں۔ادھر اُدھر پڑی سینکڑوں کتابیں تھیں۔باتیں کرتے کرتے اُستاد نے سرہانے رکھے ایک بڑے لفافے سے کھا نکال کر میز پر پڑی پلیٹ میں اُلٹ دیا— کہنے لگے، کھاؤ اور ہم سب دانے چُگنے گئے اور استاد اپنی زندگی کی باتیں، دیش بدیش کی باتیں اور پھر اچانک کہنے لگے— تم جانتے ہو، میں نے گیتا پڑھنے کے لئے سنسکرت سیکھی تھی۔

استاد دامن سے وِداع ہو کر چلے تو میں سوچ رہا تھا کہ بھگوان رام چندر کے بیٹے لَو کے شہر لاہور کی آتما جیسے تھے لوگ، سچ مچ لاہور کے دامن کا ہیرا ہے۔

نہ یہ دُنیا۔ نہ وہ دُنیا

لاہور کی وہ گلیاں ابھی بھی اپنے ساتھ اُن پرانی یادوں کو لئے ادھر اُدھر ٹہلتی ہیں۔ انہیں یادوں میں بہت ساری یادیں شاعری جیسی ہیں اور بہت ساری ان عمارتوں جیسی جو لاہوری اینٹوں سے بنی ہوئی ہیں۔

سفر جاری ہے اور اس وقت ہم حویلی دھیان سنگھ کے پاس تھے جس کے اتہاس میں کئی رنگینیاں سمائی ہوئی تھیں۔ اسی حویلی میں کبھی دیال سنگھ ہائی اسکول بھی ہوا کرتا تھا لیکن کھنڈر سی بن گئی یہ حویلی آج بہت اداس تھی۔ ہم شاہی محلّے کی طرف بڑھ گئے۔ راستے میں عطر کی مشہور ''بھائیوں کی دوکان'' ہوا کرتی تھی اور یہاں لٹکتا بڑا گھڑیال ہر گھنٹے بجایا جاتا تھا۔ جب بارہ بجے کا وقت ہوتا اور چوکیدار بڑے ہتھوڑے سے گھڑیال بجاتا تو دیال سنگھ اسکول کے بہت سے طالب علم شرارت کے موڈ میں وہاں جمع ہو جاتے اور زور زور سے پکارنے لگتے — ''بھائیاں دے بارہ بج گئے۔''

روشنائی دروازے کی طرف بڑھتے، قلعے کی سیڑھیوں کے نیچے واقع ہم نے وہ بڑا میدان دیکھا جہاں جمعہ یا اتوار کے دن پتنگ بازی کے مقابلے ہوا کرتے تھے۔ میدان پہلے کے مقابلے کچھ چھوٹا ہو گیا تھا اور یہاں پرانے وقتوں جیسی پتنگ بازی بھی اب نہیں ہوتی۔ ہم آگے بڑھ گئے اور روشنائی دروازے سے حضوری باغ میں داخل ہو کر ہم بادشاہی مسجد کی طرف بڑھے۔ مسجد کے زینے پر بائیں طرف علامہ اقبال کا خوبصورت مزار تھا۔ جوتے اتار کر ہم نے مزار کی دہلیز کو پار کیا تو اگر بتیوں کی خوشبودار فضاؤں میں کھو گئے۔ اس دور کے بہت بڑے شاعر علامہ اقبال کے چند اشعار میرے ذہن سے زبان پر آ گئے —

خُدا تو ملتا ہے، انسان ہی نہیں ملتا
یہ چیز وہ ہے کہ دیکھی کہیں کہیں میں نے

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

تیرے آزاد بندوں کی نہ یہ دُنیا نہ وہ دُنیا
یہاں مرنے کی پابندی، وہاں جینے کی پابندی

ان اشعار کو گنگناتے ہوئے، اقبال کے جادو سے باہر آتے ہوئے، جب میری نظروں نے سامنے دیواروں پر اقبال کے فارسی اشعار دیکھے تو پاکستان میں اس بڑے شاعر کے حوالے سے، اُردو کی صورتِ حال پر دُکھ ہوا۔ سجدہ کر ہم آگے بڑھ گئے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی سمادھی سے ہو کر ہم گوردوارہ ڈیرا صاحب کے آگے پہنچے جس کا بڑا جنگلے دار دروازہ اندر سے بند تھا۔ ہم نے باہر سے ہی سر جھُکا کر ربّ کو یاد کیا اور آگے بڑھ گئے۔ سامنے منٹو پارک میں مینار پاکستان دیکھا۔ قلعے کی دیوار کے ساتھ ساتھ دائیں طرف ستی دروازے کی جانب مُڑ گئے۔ اس دروازے کے باہر کبھی سُتھرے شاہ کا دربار ہوا کرتا تھا۔ اُن کے دیدار تو مقررہ وقت پر ہی ہوتے تھے لیکن بھنگ چوبیس گھنٹے ملا کرتی تھی۔ آگے بڑھتے ہوئے ہم چونا منڈی سے ہو کر پُرانی کوتوالی کے سامنے سے گذرے۔ یہاں ہم ممتاز کی کٹڑی، چوک مسجد وزیر خاں، کشمیری بازار، ڈبّی بازار، سنہری مسجد اور چوک سُرجن سنگھ سے ہوتے ہوئے ٹکسالی دروازے کی طرف بڑھ گئے۔

ٹکسالی دروازے سے نکل کر ہم اندرون شہر کی جانب چل پڑے۔ اب ہم ہیرا منڈی میں تھے۔ حُسن کا یہ بازار متحدہ ہندوستان کے زمانے میں اپنا خاص نام و مقام رکھتا تھا۔ ویسے تو لاہور کے نوجوان اس بازار کی رنگینی کا کئی بار مزہ لوٹتے تھے لیکن زیادہ تر ان پڑھ زمیندار اُٹھتی جوانی میں کمسن حسیناؤں کی نتھ اتارنے اور الّھڑ رئیس زادے آدابِ محفل سیکھنے یہاں آتے تھے اور دونوں ہاتھوں سے دولت لٹاتے تھے۔ ہیرا منڈی کے بازار میں رونق اتنی تھی کہ بے پناہ بھیڑ کی

وجہ سے ٹریفک جام ہوگیا۔ ہم نے یہاں کی رنگینیوں کی رونق بخشنے والی کئی الّہڑ حسیناؤں کو دیکھا۔ وہ سب مومن تھیں لیکن کافرادائی میں کسی سے کم نہ تھیں۔

ہیرا منڈی سے نکل کر ہم نوگزے کی قبر سے ہوتے ہوئے پانی والے تالاب تک پہنچے۔ رائے صاحب کی آنکھوں میں بے پناہ حیرانی اور تعجّب تھا۔ یہاں کے ہر گلی کوچے کو وہ اپنے ذہن کی گہرائیوں میں بسے لاہور کی یادوں کی سمو رہے ہے۔ ہمارے قدم اب گمٹی بازار کی جانب بڑھ رہے تھے۔ وہاں سے بائیں طرف کی گلی کے نکڑ پر لکھا تھا ''کوچہ اورنگ زیب''۔ رائے صاحب بولے— ''یہ تو کوچہ کالی ماتا تھا اور اس میں کالی ماتا کا مندر بھی ہوا کرتا تھا۔'' میں نے سوالیہ انداز میں کہا— ''اورنگ زیب اور مندر؟'' رائے صاحب اور مقبول دونوں دھیمے سے مسکرا دیئے —اور ہمارے قدم آگے بڑھ گئے۔

جگ مائی کی میّت

لاہور میں بہت بڑی بڑی مسجدیں بھی ہیں اور قلعے بھی! مگر لاہور کے دلوں میں بہت کچھ ایسا ہے جسے سُنتے آنکھ خون کے آنسو روتی ہے —!

ہم لاہور کے کوچہ کالی ماتا میں تھے وہاں مقبول کے ایک صحافی دوست مل گئے۔ ہم ہندوستانیوں سے متعارف ہوئے تو جیسے زبردستی ہی چائے کے لئے ہمیں سامنے اپنے مکان میں لے گئے۔ وہی اپنا پن، وہی محبت، وہی بیتابی اور بے قراری — جو لاہور میں ہر ملنے والے پاکستانی کے ذہن وقلب میں ہم نے پائی تھی۔ رائے صاحب نے اس صحافی دوست سے پوچھ لیا — اس کمرے کی چھت سیمنٹ اور لینٹر کی ہے جبکہ اس کوچے کے سبھی مکانوں کی چھتیں لکڑی کے بالوں۔شہتیروں کی ہوا کرتی تھیں۔ جواب میں اُس نے بتایا کہ پہلے یہ بھی ایسا ہی مکان تھا جب میں نے اسے نیلامی میں خریدا تھا، تو یہ گر چُکا تھا۔ میں نے اس کی تعمیر بعد میں کرائی۔ اس صحافی دوست نے اس مکان میں رہنے والی ایک عورت کی کہانی بھی سُنا دی۔

تقسیم کے وقت 1947 میں ان سبھی علاقوں کے ہندو اور سِکھ لاہور چھوڑ کر جا چکے تھے۔ محلّوں کے محلّے اور بازاروں کے بازار ویران ہو گئے۔ تب ادھیڑ عمر کی ایک عورت نہ جانے کیسے اسی مکان میں رہ گئی۔ بیٹے کا نام کشن لال بتاتی تھی جس کی سُنار کی دوکان تھی۔ آہستہ آہستہ ہندوستانی پنجاب کے مسلمانوں کے قافلے یہاں آکر آباد ہونے لگے اور یہ کوچہ نئی تبدیلیوں کے ساتھ پھر سے بس گیا۔ یہاں آکر بسے مہاجنوں نے اس بُڑھیا کو مکان چھوڑ کیمپ میں پناہ لینے کو کہا تو وہ بولی — ''نہیں جاؤں گی۔ یہ میرا گھر ہے۔ میں یہیں رہوں گی۔'' شروع شروع میں ہی کوئی سر پھرا اسے قتل کر دیتا تو بات آئی گئی ہو جاتی لیکن مہینے گذر گئے اور وہ زندہ رہ گئی وہ گھر میں پڑے اناج سے پیٹ کی آگ، بجھاتی رہی۔ جب دل کرتا وہ اپنے تھڑے پر بیٹھ کر چرخہ کاتنے لگتی۔ کبھی

موج میں آتی تو راوی تک نہانے چلی جاتی۔ 1947 کی دیوالی آئی تو اسی کے گھر چراغ جلے۔ خود ہی مٹھائی بنائی اور خود ہی محلے والوں میں بانٹتی رہی۔ آہستہ آہستہ محلّے والوں نے بھی اُس کا حال چال پوچھنا شروع کر دیا تھا۔ پھر یہ ہوا کہ کسی کے گھر کوئی بیمار پڑا تو سُن کر وہ اُس کی تیمارداری کے لئے پہنچ گئی اور پہروں وہیں گذارنے لگی۔ بیمار ٹھیک ہوا تو وہ روزانہ آکر بڑھیا کو دعا سلام کرنے لگا۔ پھر اور زیادہ گھروں میں اس کا آنا جانا شروع ہو گیا۔ نہ جانے اس کے قدموں میں کیسی مسیحائی تھی کہ جس گھر میں قدم پڑے، دِلی مُرادیں پوری ہونے لگیں۔ کسی کے بیٹے کو روزگار مل گیا۔ کسی کی بیٹی کو اچھا گھر نصیب ہو گیا۔ کسی کا کوئی اپنا اُس کی دُعاؤں سے ترقی کر گیا۔ کسی بے اولاد کی گود ہری بھری ہو گئی۔ محلّے والوں سے اس کی محبت بڑھتی چلی گئی۔ محلّے والوں نے ہر گھر کی باری لگا دی کہ اس کے لئے صبح و شام روٹی سبزی یا دال پہنچ جائے۔ چائے تو جب جس کے گھر بنتی، ایک پیتل کا گلاس بھر کوئی بچہ اس کے لیے بھی لے آتا۔ آہستہ آہستہ اُس کی شہرت علاقہ بھر میں پھیل گئی اور گُمٹی سے لے کر سید مٹھے تک تمام گھروں میں وہ ''جگ مائی'' کہلانے لگی۔ سالوں سال اسی طرح گذر گئے۔ ہر کوئی اپنے کو اس کا اپنا کہلانے میں فخر محسوس کرنے لگا۔ آخر 1962 میں ایک دن وہ بڑھیا وفات پا گئی۔ محلّے والوں نے اکٹھا ہو کر فیصلہ کیا کہ میّت کو بہت عزت و احترام کے ساتھ قبرستان لے جا کر دفن کر دیا جائے۔ اسلئے کہ شہر لاہور کا قدیم شمشان ''رام کا باغ'' اب بند ہو چکا تھا۔ ڈولا لانے کے لئے ایک محلّے دار مسجد پہنچا تو فرشتہ سیرت مولوی صاحب پوچھ بیٹھے کہ موت کس کے گھر ہوئی۔ بتانے پر کہ وہ ہندو بُڑھیا چل بسی ہے، اُسے قبرستان لے جانا ہے۔ مولوی صاحب سُن کر خود کوچے میں آ گئے اور سب کو اکٹھا کر کے بولے ''دیکھو، وہ اب مر چکی ہے۔ اسے کچھ فرق نہیں پڑتا کہ اس کا مردہ جسم کیسے ٹھکانے لگتا ہے۔ لیکن ہمیں نہیں بھولنا چاہئے کہ وہ آخری سانس تک ہندو رہی تھی ہمارے ایمان کا تقاضہ ہے کہ اس کی آخری رسومات بھی ہندو رسم و رواج کے ساتھ ادا کی جائیں'' مولوی صاحب کی بات لوگوں کی سمجھ میں آ گئی۔ ہندو طور طریقے سے اس کی ارتھی سجائی گئی اور کندھا دینے والے ''رام نام ست ہے'' پکارتے ہوئے اُسے راوی کے کنارے لے گئے۔ محلّے والوں نے چِتا جلائی اور تیسرے دن اُس کی راکھ دریا میں بہا دی گئی۔

رائے صاحب زار و قطار رونے لگے تھے اور میری آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔

بچپن کی پرچھائیاں

لاہور کی ہر عمارت بچھڑ گئے کو اپنی طرف بلاتی نظر آتی ہے۔ گورنمنٹ کالج اب بھی اپنی شان سے کھڑا ہے لیکن بہت ساری عمارتیں وقت نے اپنی لپیٹ میں لے لی ہیں۔

عوام دن رات مر رہے ہیں، خواص پر کچھ اثر نہیں ہے
جو وقت ، نزدیک آ رہا ہے، کسی کو اس کی خبر نہیں ہے
نہ جانے کس دن عوام بگڑیں، خواص ظلم و ستم بڑھا دیں
نہ جانے کس دن یہ جھونپڑیوں کے مکیں محلوں کو لڑ کھڑا دیں
نہ جانے کس دن غریب گاہک دوکانداروں کا زعم ڈھا دیں
نہ جانے کس دن خاموش فوجیں نظام نو کا علم اُٹھا دیں

ایک طویل نظم کا یہ حصّہ اُردو اور پاکستان کے بہت بڑے شاعر احسان دانش کا ہے جنہیں ملنے کے لئے ہم مال روڈ سے ہوتے ہوئے انارکلی میں داخل ہوئے۔ مقبول صاحب آج بھی ہمارے ساتھ تھے بلکہ نئے لاہور میں ہمارے راہنما تھے۔ کمرے میں احسان دانش تو تھے ہی، لاہور کے کئی دوسرے شاعر بھی موجود تھے۔ بھارت اور پاکستان میں دونوں طرف کے عوام ایک دوسرے سے بے پناہ محبت کرتے ہیں۔ اسی محبت کا اظہار یہاں بھی ہوا۔ اس کے لئے شدید خواہش، بیتابی اور بے قراری بھی دکھائی دی کہ دونوں ممالک کے شاعر ادیب اور عوام اِدھر اُدھر کُھل کر آ ئیں جائیں، تو ماحول سنور نے لگے گا۔ وہاں موجود ایک صاحب نے تجویز پیش کی دونوں حکومتیں سرحد پر ایک مشاعرہ منعقد کرنے کی اجازت دیں۔ دونوں طرف لاؤڈ اسپیکر لگوا دیئے جائیں اور ادھر لاہور، اُدھر امرتسر تک لوگ دونوں دیشوں کے شاعروں کو سُن لیں۔

اپنی صداقت پسندی اور حقیقت نگاری کے جُرم میں زندگی بھر طرح طرح کی مشکلات اور پریشانیوں سے دوچار رہنے والے اس بڑے شاعر احسان دانش نے پاکستان کے گھٹن بھرے ماحول میں بھی بہت کھل کر لکھا ہے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ پاکستانی ادیب اور شاعر آج کہاں ہیں، تو وہ بولے، کچھ کھڑے ہیں، لیکن کچھ لیٹ گئے ہیں۔ پھر ایک نامور ادیب کا نام لے کر بولے — کل تک ترقی پسند تھے، اب آرام پسند ہیں۔ چولا بدلنے کے عوض میں حکومت نے لاکھوں روپیوں کے ایک سرکاری انعام سے نواز دیا ہے — لگ بھگ گھنٹہ بھر کی بات چیت کے بعد اجازت لے کر ہم وہاں سے روانہ ہو گئے۔

انار کلی سے نکل کر سرکلر روڈ پر بھاٹی دروازے کی طرف ہم چل دیئے اور پھر بریڈلا ہال جانے کے لئے کربلا گامے شاہ کی طرف ہو لیے۔ آج سو سال ہو گئے، پنجاب کانگریس نے اس عمارت کو تعمیر کرایا تھا۔ رائے صاحب بتا رہے تھے کہ سریندر ناتھ بینرجی نے اس کا سنگ بنیاد رکھا تھا اور اس عمارت کو تحریک آزادی کے حامی ایک انگریز بریڈلا سے منسوب کر دیا گیا تھا۔ ملک کی تقسیم تک پنجاب کانگریس کمیٹی کا صدر دفتر یہی ہوتا تھا۔ جواہر لال نہرو، سبھاش چندر بوس، جے پرکاش نارائن وغیرہ کئی بڑے لیڈر کبھی نہ کبھی اس ہال میں منعقد جلسوں میں بولے تھے۔ کانگریس کی راہنمائی میں آزادی کی لڑائی کا مرکز یہی ہال تھا۔

اب ہم ضلع کچہری کے سامنے تھے۔ وہاں سے گورنمنٹ کالج کے پاس لوئر مال اور گول باغ سے ہوتے ہوئے عجائب گھر کے باہر بھنگیوں کی توپ تک آ گئے۔ بائیں طرف یونیورسٹی کے باہر تاریخ داں والنسر کا بُت اب بھی قائم تھا۔ شاید پورے لاہور میں یہی ایک بُت تھا جسے توڑا نہیں گیا تھا۔

رائے صاحب کی خواہش نسبت روڈ پر واقع گیتا بھون دیکھنے کی تھی۔ بچپن میں گیتا بھون کے اسکول میں ہی انہوں نے سنسکرت کی تعلیم حاصل کی تھی۔ کچھ دیر کے بعد ہم گیتا بھون کے باہر تھے۔ بھون کی عمارت کھنڈر میں تبدیل ہو چکی تھی۔ اندر جانے اور دیکھنے کے لئے کچھ باقی نہیں تھا۔ رائے صاحب کو بے حد مایوسی ہوئی۔ سڑک کے کنارے کھڑے گیتا بھون کی عمارت کے سیمنٹ کے پلاستر پر چُونے سے سنسکرت زبان میں لکھا گیتا کا فرمان دیکھ کر اسے پڑھنے کی کوشش کرتے رہے۔ اس فرمان کے دو شلوک تھے جس کا ترجمہ خواجہ دل محمد نے اُردو زبان میں

کچھ اس طرح کیا تھا—

تنزّل پہ جس وقت آتا ہے دھرم
ادھرم آ کے کرتا ہے بازار گرم
اندھیرے یہ جب دیکھ پاتا ہوں میں
جنم لے کے دُنیا میں آتا ہوں میں

رائے صاحب شاید اپنے بچپن کی پرچھائیں کی دُنیا میں گُم وہ پاٹھ شالا تلاش کر رہے تھے جہاں انہوں نے سنسکرت کی ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی لیکن شاید اس وقت ان کا معصوم بچپن شری کرشن کے اس اُپدیش کے معنی نہیں جانتا تھا جو آج لاہور کے ویران پڑے گیتا مندر کی گرتی ہوئی دیوار پر اُن کی آنکھوں کے سامنے تھا۔

رائے صاحب نے لاہور کو دیکھا— قلب و ذہن پر یادوں کے عکس کا درد لیے شاید وہ اسے برداشت نہیں کر سکے اور ہفتہ بھر بعد وہ بھارت واپس لوٹ گئے۔

راوی میرا پیر

لاہور والوں کی زندگی میں کبھی کبھی روانگی آتی ہے اور کبھی کبھار یہی روانگی کسی درد میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ بٹوارے کا درد بھی یہیں کہیں ٹس ٹس کرتا رہتا ہے اور مستقبل کے نقش بھی دکھائی دے جاتے ہیں—!

راوی محض ایک دریا نہیں، پنجاب کا سہاگ ہے اور لاہور کے ماتھے کا جھومر! اس کی لہراتی، بل کھاتی موجیں دھرتی کے سینے پر سے تاریخ کے کئی ورق پلٹ دیتی ہیں پنجاب پانچ دریاؤں کی دھرتی ہے اور ان میں سے سب سے چھوٹا دریا راوی ہے۔ کہتے ہیں کہ پہلے اس کا نام ''اراوتی'' تھا، جو آہستہ آہستہ راوی ہو گیا۔ اس کے بائیں کنارے لوگوں نے آباد ہونا شروع کیا۔ یہ بہت پہلے کی بات ہے، جسے کوئی دس ہزار سال سے زیادہ کا وقت گذر گیا۔ بعد میں لوگوں کے بائیں کنارے آباد ہونے کی وجہ یہ بھی تھی کہ حملہ آور شمال کی طرف لے آتے تھے اور راوی دریا لاہور کو ان سے محفوظ رکھتا تھا لیکن جب طوفانی سیلاب آتے تھے تو یہی راوی دریا لاہور کی آبادیوں کو بہا لے جاتا تھا۔ اسی لئے لوگوں نے زیادہ اونچائیوں پر آبادیاں بنائیں۔ دریا اپنا راستہ بھی بدلتا رہا، آبادیاں مٹتی رہیں لیکن لوگ شہر کو دوبارہ آباد کر لیتے۔ لاہور جب جب بھی برباد ہو کر آباد ہوا، یہ راوی کے بائیں کنارے ہی ہوا۔ لاہور کے کئی علاقوں اِچھرا، مزنگ، قلعہ گجر سنگھ وغیرہ کی طرف ہی دریا بہتا تھا۔ اورنگ زیب کی حکومت کے زمانے میں دریا راوی قلعے کی فصیل سے ٹکرا کر نکلتا تھا۔ وہ وقت بھی تھا جب یہ شاہی قلعہ اور شاہی مسجد کی در و دیوار کو چھوتا تھا اور کبھی چوبُرجی سے لے کر شالیمار تک کے پیڑوں کی ٹھنڈک کے گیت گاتا تھا۔ باغ جناح کی پھول بھری روشوں سے فطرت کی دلکشی اس کے پانیوں میں گھل مل کر لاہور سے دور چلا گیا۔ لیکن آج بھی

لاہور اور راوی ایک دوسرے کی پہچان ہیں۔آج بھی جوگیا لباس پہنے بابا چوہارے شاہ لاہور کی گلیوں میں یوں حق مولا کی صدا دیتا ہوا گذرتا ہے—

راوی میرا پیر، ایہہ راوی دیاں لہراں
کراں عبادت رب دی، میرے لاہور دیاں خیراں

راوی کے سینے پر بارہ دری کے کھنڈرات بکھرے ہوئے ہیں اور اس کے پہلو میں عدل و انصاف کے شہنشاہ جہانگیر اور محبت کی ملکہ نور جہاں آرام کر رہے ہیں۔تاریخ گواہ ہے کہ پانی پت کے میدان میں مغل بادشاہ بابر نے لودھیوں کو شکست دے کر خود آرا میں قیام کیا اور اپنے بیٹے کامران کو لاہور پہنچ کر سب سے پہلے راوی دریا کے کنارے ایک وسیع باغ تعمیر کرایا اور اس پر بارہ دری اور دیگر عالیشان عمارتیں تعمیر کرائیں۔ جب بابر لاہور آیا تو کامران نے اُسے اسی بارہ دری میں ٹھہرایا۔لاہور کی یہ بارہ دری اُسی زمانے کی یادگار ہے لیکن اب یہ صرف کھنڈرات کی شکل میں موجود ہے۔1955 میں آئے زبردست سیلاب نے اس کی شکل وصورت اور بھی بگاڑ دی تھی۔اب اس کے چاروں طرف پانی بہتا ہے اور لوگ کشتیوں میں سوار ہو کر اسے دیکھنے وہاں جاتے ہیں۔ شروع میں کامران باغ کی لمبائی 1600 فٹ تھی اور بارہ دری اس کے عین وسط میں بنی ہوئی تھی۔

لاہور کے آسمان میں جب سُرمئی سایوں کی لہروں میں سنیچروار کا سورج اپنی زرد کرنوں کو سمیٹتا ہوا مغرب کی گہرائیوں میں چھپ جاتا ہے تو لاہوریوں کے چہروں پر خوشی اور شادمانی جھلکنے لگتی ہے۔ پھر جب رات کی زلفیں بھیگتی ہیں تو چاند بھی شرمانے لگتا ہے۔دُور کہیں ایسے محسوس ہوتا ہے کہ جیسے لہروں کی آغوش میں بانسری کی سُریلی دُھن پر کوئی گیت گا رہا ہو۔ یہ گیت راوی کی ابھرتی اور ڈوبتی مچلتی، کھیلتی لہراتی اور گنگناتی لہروں کی دھڑکتی آواز ہے جو صبح و شام لاہور کے لوگوں کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ ہفتے کے دنوں میں لوگ راوی کے پانیوں سے کھیل کر اپنے من کی پیاس بجھاتے ہیں۔ ہر لاہوری کا دل چاہتا ہے کہ شہر کی شور بھری فضا سے نکل کر قدرت کے حُسن کے نظارے کو اور چھاؤں لٹاتی پیڑوں کی ٹھنڈک کو اپنی آنکھوں میں سمیٹ لیں— نیلے آکاش کے ستاروں کی رہگذر پر چل پڑیں اور راوی کی پُرسکون لہروں کی آغوش میں پانی کے ترنّم کے مدھر گیتوں میں ڈوب جائیں۔

اِس دروازے پر

لاہور کی زندگی ہو، عمارتوں کا اتہاس ہو، دروازوں کی داستان ہو، وقت کی دستک صاف سنائی بھی دیتی ہے اور دکھائی بھی۔ یہ دستک کہیں کہیں خوشی کی لہر لگتی ہے اور کہیں کوئی کہتا ہے ——یہ کیسی دستک——!

لاہور شہر کے بارہ دروازے جب بنائے گئے تھے تب ان کو شاید کوئی نام نہیں دیا گیا تھا لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ہر دروازے کے ساتھ جُڑی کسی داستان نے جنم لیا اور انہیں نام ملتے چلے گئے۔

شہر لاہور کے بارہ دروازوں کی مفصّل بات ہم آگے چل کر کریں گے لیکن ابھی صرف دو دروازوں کا ذکر کریں گے ——شیراں والا دروازہ اور یکّی دروازہ۔

شیراں والا دروازہ—— اس دروازے کے دو نام ہیں اور ان ناموں کی دو ہی کہانیاں ہیں۔ پُرانے وقتوں میں یہ خِضری دروازے کے نام سے مشہور تھا۔ اس وقت راوی دریا لاہور شہر کے دامن میں بہتا تھا اور اس دروازے کے آگے کشتی پڑتی تھی۔ حضرت خِضر علیہ السلام" (پیغمبر) کو دریاؤں اور سمندروں کے ساتھ خاص نسبت رہی ہے اور شاید اسی نظریئے سے اس کا نام خضری دروازہ رکھا گیا تھا۔ کشتی سے لوگ دریا راوی پار کرتے اور اپنے خضر کو یاد کرتے ہوئے اس دروازے سے ہو کر شہر میں داخل ہوتے۔ اس کا نام شیراں والا دروازہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زمانے میں مشہور ہوا۔ کہتے ہیں کہ اس دروازے کے دائیں بائیں دو بہت بڑے بڑے مضبوط پنجروں میں دو خونخوار شیر بند رکھے جاتے تھے۔ یہ پالتو شیر مہاراجہ رنجیت سنگھ نے شاید حفاظت کے نظریئے سے یہاں رکھوائے ہوں گے۔ ان شیروں کی موجودگی کی وجہ سے ہی اس کا نام شیراں

والا دروازہ پڑ گیا۔ جب انگریز آئے تو انہوں نے یہ شیر پنجروں سے نکال کر کسی دوسرے ملک بھیج دیئے۔ یہ جگہ آج بھی شیراں والا دروازہ کے نام سے مشہور ہے۔

یکّی دروازہ ـــــــ اس کا نام درحقیقت ''ذکی دروازہ'' ہے جس کا تعلق پیر ذکی نام کے ایک شخص سے ہے۔ مُغل حملے کے وقت پیر ذکی اس دروازے کا محافظ تھا۔ مغلوں کے ذریعے لاہور کے محاصرے کے دوران لڑائی میں بہت خون بہا۔ اس وقت پیر ذکی نے اپنی بہادری کے جوہر دکھائے اور وہ شہید ہو گئے۔ لڑائی کے دوران اس کی موت اسی دروازے میں ہوئی۔

پیر ذکی کی دو قبریں ہیں۔ ایک قبر دروازے کے اندر ہے جہاں اس کا سر دفن ہے۔ دوسری قبر دروازے کیساتھ ہی ایک طبیلے میں ہے جہاں اس کے جسم کا باقی حصّہ یعنی دھڑ دفن ہے۔ یہ دروازہ بھی خستہ حالت میں ہونے کی وجہ سے انگریز کے زمانے میں گرا دیا گیا تھا۔

لاہور شہر کے اردگرد بنائی گئی فصیل (دیوار) اور فصیل میں بنے بارہ دروازوں اور ایک موری کا آغاز اکبر بادشاہ کے دورِ حکومت میں ہوا اور سکھوں کی حکومت تک لاہور شہر کی عظمت اس کی فصیل اور بارہ دروازوں کے ساتھ برقرار رہی لیکن مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دورِ حکومت میں لاہور کو بہت نقصان ہوا۔ اسلامی تاریخ سے جُڑی عمارتوں سے قیمتی پتھر اور ہیرے جواہرات غائب ہو گئے۔ یہاں کے باغ اُجڑے اور دلہن جیسے لاہور کا حُسن کسی جوان وِدھوا جیسا ہو گیا۔ جب انگریزوں نے لاہور کو اپنے قبضے میں لیا اس وقت شہر کی نصف سے زیادہ فصیل اور باغات اُجڑ چکے تھے۔ رہی سہی کسر انگریزوں نے پوری کر دی اور شہر کی باقی بچی فصیل کو بھی فضول قرار دے کر گرا دیا گیا۔

یہی نہیں، شہر کے بارہ دروازے بھی ماضی کی داستان بن گئے۔ اس طرح قدیم لاہور کا وہ حُسن جو ایک دوشیزہ کے پردے میں چھپا ہوا تھا، ختم ہو گیا۔ اس سے نہ صرف لاہور کی کلچرل وراثت کو نقصان ہوا بلکہ اس جیسی بہشت نگری کا سارا حُسن ختم ہو گیا۔

وہ گلیاں — وہ چوبارے

لاہور کی گلیوں سے گذرتے ہیں تو پرانی فلمیں دل دماغ میں گھومنے لگتی ہیں۔ فلموں کے ساتھ ہی لاہور میں رہنے والی فلمی ہستیاں اور ان کا رہن سہن سامنے آجاتا ہے۔ یہ گلیاں ان یادوں کو سمیٹے ہوئے ہیں جو کبھی ہمارے دل سے ہو کر گذری تھیں ——!

دسہرہ، دیوالی، بیساکھی، ہولی، عید بکر عید وغیرہ مختلف دھرموں اور قبیلوں کے بڑے تیوہاروں پر لاہور کی ہیرا منڈی میں بہت رش ہوتا تھا۔ ان دنوں یہاں کئی ایسے جھگڑے بھی ہو جاتے تھے جو آناً فاناً بازار بند کرا دیتے تھے لیکن جھگڑا ختم ہوتے ہی یہاں پہلے جیسی چہل پہل واپس آجاتی تھی۔ یہ بازار رات سے لے کر صبح تک کھلا رہتا تھا۔ بازار کے وسط میں جہاں ملک کی تقسیم سے پہلے بنی فلم ''زمیندار'' کی ہیروئین رہتی تھی، اس کے نیچے شراب کا ٹھیکہ تھا جہاں شراب پی کر شور شرابہ کرنے پر بھی کسی کو گرفتار نہیں کیا جاتا تھا۔

فلم دُلاّ بھٹّی کے ہیرو ایم۔ ڈی۔ کنور، قلم کار یوسف سلیم جیسے اس وقت کے کئی مشہور لوگوں کا ان طوائفوں کے کوٹھوں پر آنا جانا عام تھا۔ ہیرا منڈی میں ان کی آمد سے ہلچل سی مچ جاتی تھی اور طوائفیں اپنے کمروں سے نکل کر دروازوں اور کھڑکیوں میں کھڑی ہو جاتی تھیں۔ ہار بیچنے والے اور طوائفوں کے ملازم ان کے آگے پیچھے ہوتے تھے۔ معراج شریف اور شبِ برات کے موقع پر مسجدوں میں چراغاں کرنے کے لئے بچّے گلی گلی اور گھر گھر جا کر چندہ مانگتے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں مٹّی کے لوٹے ہوتے تھے جن میں کڑوا تیل ہوتا تھا۔ وہ معراج شریف مانگنے کے لیے ہیرا منڈی چلے جاتے تھے۔ چوک ناولٹی سنیما اور ٹکسالی سنیما کے ساتھ سبز پیر اور ٹبّی گلی تھی۔ ان دونوں گلیوں میں جسم فروشی کرنے والی عورتیں بیٹھتی تھیں اور وہ دل کھول کر چندہ دیتی تھیں۔

عید بکرعید کے موقع پر نماز شاہی مسجد میں پڑھ کر نمازی جب ہیرا منڈی سے گذرتے تھے تو طوائفیں اور دھندہ کرنے والی عورتیں صبح سے ہی کھڑکیوں اور دروازوں میں کھڑی ہو جاتی تھیں۔

ہیرا منڈی میں ناولٹی اور ٹکسالی گیٹ کے دونوں سینما بہت مشہور تھے۔ ان میں تھرڈ کلاس کا ٹکٹ ڈھائی آنے کا ہوتا تھا اور فلم شروع ہونے کے بعد گیٹ کیپر ایک ایک آنا لے کر تھرڈ کلاس میں داخل کر دیتا تھا۔ اگر سیٹیں پوری ہو جاتیں تو لوگ سٹیج پر بیٹھ کر سینما دیکھ لیتے تھے۔ ناڈیا، جان کاؤس، گل حمید، خورشید، انل کمار، بھگوان، سیمسن اور علی گنجا کی فلمیں بہت پاپولر تھیں۔ ناڈیا ایک ایسی ہیروئن تھی جو اکیلی وِلن کے سپاہیوں سے لڑتی تھی، جمپ مارتی تھی اور کیمرہ ٹرک سے اُچھل کر محل کی دیوار پر چڑھ جاتی تھی اور جمپ لگا کر نیچے گھوڑے پر کود پڑتی تھی۔ انل کماری شاہی فقیر، خورشید کی افلاطون عورت اور گل حمید کی فلم باغی سپاہی کے علاوہ ''شاہی جادوگر'' — ''طوفان میل'' — ''نقاب پوش حسینہ'' — ''حکم کا یکّہ'' — ''ہنٹر والی'' — ''ٹارزن'' اور 17 پارٹ کی لمبی فلم ''حاتم طائی'' اس وقت کی بننے والی مشہور فلمیں تھیں۔

تیوہاروں کے دنوں میں ہیرا منڈی کا رش بڑھ جاتا تھا اور اکثر لڑائیاں ہوتی تھیں۔ ہیرا منڈی میں برف توڑنے والے سوئے اور سوڈے کی بوتلیں چلتی تھیں۔ زیادہ سے زیادہ چاقو گھونپے جاتے تھے اور طوائفوں کے کوٹھوں پر گانے کے دوران شرابیوں کی ڈانٹ سُن کر راہگیر کھڑے ہو جاتے تھے۔ دوسری عالمی جنگ شروع ہوئی تو نوگزا پیر اور ٹکسالی دروازے کے باہر ''آؤٹ آف بونڈ'' کے بورڈ لگ گئے تھے اور ملٹری پولیس والے ٹبی گلی اور کوچہ سبز پیر میں سفید کپڑوں والے چھٹی پر آئے ہوئے فوجیوں کو پکڑ لیتے تھے جبکہ ان دونوں گلیوں کی عورتیں لام پر جانے والے سپاہیوں سے زیادہ پیسے وصولنے کے لئے ان کا انتظار کرتی رہتی تھیں۔ ہیرا منڈی میں جتنے نئے مکان طوائفوں نے بنوائے وہ سب دوسری عالمی جنگ کے دوران بنے۔ اس دور میں ہیرا منڈی کی بوڑھی طوائفیں عام طور پر کوچہ شاہباز خاں کے مکانوں کے تھڑوں پر بیٹھ کر آتشک اور سوزاک جیسی بیماریوں کی دوائیاں فروخت کرتی تھیں۔ ان میں کچھ ایسی بھی تھیں جنہوں نے سِکھوں کا آخری اور انگریزوں کی آمد کا دور دیکھا ہوا تھا۔

بازارِ حُسن

لاہور کے اسی بازار نے کسی وقت بہت بڑے موسیقاروں، آرٹسٹوں، گلوکاروں اور رقاصاؤں کو سنبھالا ہوا تھا۔ کبھی وقت تھا کہ لاہور کا یہ بازار ''بازارِ حُسن'' کہلاتا تھا۔

ہم لاہور کے طوائفوں کے بازار ہیرا منڈی کی بات کر رہے تھے۔ مُغل دور میں لاہور کے حوالے سے طوائفوں کے کاروبار پر سرکاری حفاظت کی چھاپ نظر آتی تھی۔ دور دور سے موسیقار، سازندے اور گلوکار لاہور میں آباد ہونے آتے اور انہیں راجاؤں، حاکموں، نوابوں، جاگیرداروں اور امیروں وزیروں کی سر پرستی حاصل ہوتی تھیں۔ موسیقی کی آڑ میں طوائفوں کا دھندہ اس عہد کی یادگار ہے۔ اس زمانے میں حاکموں کی عملداری کے علاقے میں کمزور طبقوں کی عورتوں کو پکڑ لیا جاتا تھا۔ خوبصورت عورتوں کو حویلیوں میں رکھ لیتے تھے اور دوسری عورتوں کو فروخت کر دیتے تھے۔

ملک کی تقسیم سے پہلے تک لاہور کی ہیرا منڈی پنجاب کے گانے بجانے والے گھرانوں کا سٹاک ایکسچینج بنی ہوئی تھی۔ اسے سبھی طرح کے امیروں، جاگیرداروں، راجاؤں، نوابوں اور تاجروں کی سرپرستی حاصل تھی۔ ان میں ایسی طوائفیں بھی تھیں جن کے گھروں کے باہر گائے بھینس بندھی ہوئی تھی۔ یہ تمام ایسی طوائفیں تھیں جن کی اپنی جائیدادیں تھیں۔ جو مر جاتی تھیں وہ اپنی جائیدادیں دینی خیراتی اداروں کے نام کر جاتی تھیں۔ موتی بازار کے چوک سرجن سنگھ میں ایک طوائف کے ذریعے بنوائی مسجد کے آثار وہاں آج بھی موجود ہیں۔ لاہور کی ہیرا منڈی کی خوشحالی اور کاروباری اہمیت انگریزوں کے دور میں اتنی مشہور تھی کہ پنجاب کے دوسرے علاقوں کے لوگ کاروبار کے لیے لاہور میں آباد ہو جاتے تھے۔ ان میں سیالکوٹ، قصور، لکھن والی،

فیض آباد، فیروز پور، لدھیانہ، جالندھر، پھگواڑہ وغیرہ شہروں کی طوائفوں کے کئی گھرانے لاہور آ کر خوشحال ہو چکے تھے۔ لاہور اور امرتسر کے گانے والوں کے خاندان زیادہ بااثر ہوتے تھے جن کے تین تین منزلہ مکان تھے اور وہ ہیرا منڈی کے چودھری تھے۔ ان خاندانوں میں کئی لڑکے کرکٹ کے کھیل میں نام پیدا کر چکے تھے چودھری، حاجی، ہجروں کے خاندان سے کرکٹر نذر محمد کا نام بہت مشہور تھا۔ اس کے علاوہ کچھ نوجوان پہلوانی میں بھی حصّہ لیتے تھے۔ مشہور موسیقار فیروز نظامی قلم کار سراج نظامی بھی اسی خاندان سے آئے اور انہوں نے موسیقی اور ادب میں بھی بہت نام پیدا کیا۔

گانے کا دھندہ کرنے والی طوائفوں میں الماس کے نام کا بہت چرچا تھا۔ مائی عیداں کا خاندان بھی لاہور کی ہیرا منڈی کا ایک پرانا حصّہ ہے۔ چیت رام روڈ پر آج کل مائی عیداں کے نام سے امام باڑہ موجود ہے جہاں سے ہر سال پانچویں محرّم کو ایک بہت بڑی زیارت نکلتی ہے اور سارے پنجاب کے شیعہ مسلمان اس ماتمی زیارت کے جلوس میں شرکت کرتے ہیں۔

اس دور میں ٹنڈی بائی کا نام بہت مشہور تھا۔ اس کا ایک بازو آدھا کٹا ہوا تھا۔ وہ مرزا صاحباں گانے کی بہت ماہر تھی۔ لاہور کے گُجروں کے خاندان بیاہ شادی کے موقع پر صرف مرزا صاحباں سننے کے لئے ٹنڈی بائی کو ہی بلاتے تھے۔ اس کے ساتھ اس کی بیٹی مجرا کرتی تھی جو جھومر ڈال کر گاتی تھی اور ٹنڈی بائی اپنے ٹنڈے ہاتھ سے تالی بجانے میں بھی بہت ماہر تھی۔ ہیرا منڈی میں ضلع گوجرانوالہ کے شہر علی پور چٹھا کے کئی مشہور گلوکار خاندان لاہور کی ہیرا منڈی میں آباد تھے۔ ان کی بھی اپنی بڑی جائیدادیں تھیں۔

ہیرا منڈی کی داستان لمبی اور دلچسپ ہے۔ شورش کاشمیری لکھتے ہیں کہ پرانے قدیم لاہور کے 'بازارِ حسن' کو شاہی محلہ 'ٹبّی' ہیرا منڈی وغیرہ ناموں سے پکارا جاتا ہے۔ انہوں نے شاہی محلّے کو دریا راوی کا ہم عمر قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ شاہی محلّے کی جوانی اور راوی کی روانی میں کبھی فرق نہیں آیا۔ قدیم وقتوں میں شاہی محلہ انارکلی تک پھیلا ہوا تھا اور اس تمام علاقے میں طوائفیں بیٹھتی تھیں۔ شورش کا ماننا ہے کہ حضرت قاسم شاہ کی آمد کے بعد ملیّاں اور شیخ پورہ کے کئی خانہ بدوش لاہور آئے۔ اُن کی عورتیں بہت خوبصورت تھیں اور انہوں نے پیشہ کرنا شروع کر دیا —خانہ بدوشوں ہی کی اولاد ہیرا منڈی کی وارث ہے۔

اس شہر دے بارہ بُوہے

'' اس شہر دے بارہ بُوہے ''۔۔۔ یعنی اس شہر کے بارہ دروازے اور بارہ دروازوں کے اندر پورا لاہور آباد ہے۔ ان مضبوط دروازوں کے علاوہ لاہور میں داخلے کا کوئی اور راستہ نہیں۔

ان دروازوں کے ساتھ بے شمار دلچسپ کہانیاں جڑی ہیں جو اتہاس اور وراثت کی گواہ ہیں۔

لاہور بارہ دروازوں کا شہر ہے اور یہ دروازے بیتے یگ کی عظمتوں کی یادگار ہیں۔ آج بھی جب کوئی ان دروازوں سے شہر میں داخل ہوتا ہے تو اُسے یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے وہ ماضی میں کھو گیا ہے اور شاندار روایتوں کا ایک لمبا اتہاس اُسے آواز دے رہا ہے۔

بابر نے جب مُغل حکومت قائم کی تو لاہور کو اس کی راجدھانی بنایا گیا۔ کہتے ہیں کہ اُس زمانے میں لاہور کے اِرد گرد ایک فصیل (دیوار) بنائی گئی تھی۔ یہ 1525 کی بات ہے۔ بادشاہ اکبر 1584 میں لاہور آیا اور اُسے یہ شہر اتنا پسند آیا کہ وہ چودہ سال یہاں سے گیا ہی نہیں اُس نے نہ صرف شہر کی فصیل کو بڑی اینٹوں سے زیادہ اونچا بنوایا بلکہ قلعے کو بھی بڑا کیا، اس کے دو بڑے دروازے بنوائے اور قلعے میں سب سے اونچی جگہ پر اپنا دربار بنوایا۔ لاہور شہر کے بارہ دروازوں اور تیرہویں موری کی تعمیر بھی اکبر بادشاہ نے ہی کرائی۔ فصیل کی دیوار بہت اونچی اور چوڑی تھی اور اسی فصیل پر ایک ایک دروازے کے درمیان دس دس بڑے بُرج تھے۔ سبھی دروازے بے حد مضبوط اور عالیشان تھے۔ ان تاریخی دروازوں کے علاوہ لاہور شہر میں داخل ہونے کا دوسرا کوئی راستہ نہیں تھا۔ رات کا پہلا پہر گذرنے کے بعد شاہی قلعے کے نقارے پر چوٹ پڑتی تھی، محافظ چوکنا ہو جاتے تھے اور شہر کے تمام دروازے بند کر دیئے جاتے تھے۔ اس کے بعد کسی کو بھی شہر میں داخل ہونے کی اجازت نہیں تھی۔ فصیل کے باہر بنی ہوئی سرایوں اور باغوں میں ہی مسافروں کو

رات گذارنی پڑتی تھی۔ ان بارہ دروازوں کے اندر ہی پورا لاہور شہر آباد تھا۔

اگر ہم بہت مختصر طور پر دروازوں کا ذکر کریں تو پہلے مسجدی دروازہ آتا ہے جو شہر کو قلعے کے ساتھ ملاتا تھا اور مریم زمانی مسجد اور قلع لاہور کے اکبری دروازے کے درمیان واقع تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس کا نام بگڑ کر پہلے مسیتی اور پھر مستی گیٹ پڑ گیا دوسرا دروازہ شاہی قلعے اور بعد میں تعمیر ہوئی بادشاہی مسجد کے درمیان دریا راوی میں اُترنے والی سیڑھیوں کے شروع میں بنا تھا۔ یہاں رات کے وقت شاندار روشنی کی جاتی تھی اور اسی سے اس کا نام روشنائی دروازہ پڑ گیا۔ اپنے وقت میں لاہور کی ٹکسال بہت مشہور تھی۔ راوی روڈ کی نکّڑ پر تیسرا ٹکسالی دروازہ واقع تھا۔ چوتھا بھاٹی دروازہ ہے جو داتا دربار کے نزدیک ہے۔ کہتے ہیں کہ یہاں بھٹّی قوم آباد تھی اسی لئے اس کا نام بھاٹی دروازہ پڑ گیا۔ مشہور ہے کہ لاہور کے بارہ دروازے اور تیرہویں موری ہے۔ یہ دروازہ نہیں بلکہ شہر کی گندگی باہر نکالنے کی موری تھی۔ کئی لوگ اسے موری دروازہ بھی کہتے ہیں۔ اس کے آگے چلیں تو پانچواں اور شہر کا سب سے پُرانا لاہوری دروازہ ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ اس کا نام شہر لاہور سے تعلق رکھتا ہے اور کچھ کا کہنا ہے کہ یہاں لوہار لوگ کام کرتے تھے اس لئے یہ لاہوری دروازہ مشہور ہوا۔ آگے بڑھیں تو چھٹا شاہ عالمی دروازہ آجاتا ہے کہ جسے بہت عالم دوست بادشاہ شاہ عالم نے بنوایا تھا۔ لاہور آنے والے یہ آخری مغل بادشاہ تھے۔ 1947 کے بٹوارے کے وقت شاہ عالمی کے اندرونی حصّے فسادیوں کی آگ کی نذر ہوگئے تھے لیکن دروازہ بچ گیا تھا۔ بعد میں اسے توڑ کر دوبارہ تعمیر کرنے کے چکر میں اسے ختم ہی کر دیا گیا۔ چلتے چلیں تو آگے ساتواں موچی دروازہ آجاتا ہے۔ جیسا کہ نام سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں زیادہ تر موچی کام کرتے تھے اس لئے اس کا نام موچی دروازہ پڑ گیا۔ اس کے بعد آٹھواں اکبری دروازہ تھا اور اُس کے بعد نواں دِلّی دروازہ تھا۔ 1870 میں اسے دوبارہ انگریزی اینٹوں سے بنایا گیا تھا۔ دسواں دروازہ چکّی دروازہ تھا جو خضری گیٹ بھی کہلاتا تھا۔ گیارہواں شیراں والا دروازہ تھا۔ اس کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہاں بڑے پنجروں میں شیر بند کر کے رکھے جاتے تھے۔ بارہواں کشمیری دروازہ ہے جس کا منہ کشمیر کی طرف ہے۔ لاہور کے ان بارہ دروازوں کے ساتھ جڑی بہت سی دل چسپ کہانیاں ہیں جو گزرے زمانے کے اتہاس اور وراثت کی گواہ ہیں۔

کبھی در کانپ جاتا ہے

آیئے — لاہور کے بارہ دروازوں کے ماضی کی داستانیں سنیں یہ داستانیں محض کہانیاں نہیں، ہمارے ماضی کی آنکھیں ہیں جنہوں نے جانے کیسے سپنے دیکھے — کیسی خُوشی اور کیسے غم دیکھے —!

○ دہلی دروازہ

دہلی دروازہ اکبری دور کی یادگار ہے جو لاہور کی عظمتوں کی کہانی کہتا آج بھی موجود ہے۔ کہتے ہیں کہ لاہور کے بارہ دروازوں میں سے یہ سب سے بڑا تھا اور دوسرے شہروں سے آنے والے قافلے اسی دروازے سے شہر میں داخل ہوتے تھے۔ یہ مشرق کی سمت میں بنایا گیا تھا کیونکہ اس سمت میں امرتسر، جالندھر، لدھیانہ سے ہوکر دہلی تک کے شہر واقع ہیں۔ اس کا نام بھی اسی لئے دہلی دروازہ رکھا گیا۔

○ اکبری دروازہ

یہ دروازہ جلال الدین اکبر بادشاہ کے نام سے منسوب ہے اور اکبر کے دورِ حکومت میں ہی اس کی تعمیر ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اکبری منڈی بھی تھی۔ خستہ حالت ہونے کی وجہ سے 67-1866 میں برطانوی عہد میں اس کی تعمیر دوبارہ کی گئی لیکن پہلے جیسے فن کی عظمت کو برقرار نہیں رکھا جاسکا۔ دروازے کا نام بدل کر ''ایچیسن گنج'' رکھ دیا گیا لیکن لاہور نے نئے نام کو قبول نہیں کیا اور یہ ہمیشہ کی طرح اکبری دروازہ ہی کہلاتا رہا۔ 1947 کے بٹوارے کے وقت یہ زمین دوز ہوگیا۔

○ موچی دروازہ

موچی دروازہ اکبری عہد کے ایک ہندو جمعدار موتی رام سے منسوب ہے جو زندگی بھر اس کا محافظ رہا۔ سِکھوں کے دورِ حکومت میں اس کا نام موچی دروازہ رکھ دیا گیا۔ ممکن ہے کہ یہاں زیادہ موچی کام کرتے ہوں۔ اس کے مشرق کی طرف دالان میں ایک قبر موجود ہے اور وہاں پانی کی جھیل بھی ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ مزار پیر مُراد کی ہے جسے آج بھی بہت مانا جاتا ہے۔

○ شاہ عالمی دروازہ

پہلے اس دروازے کا نام کچھ اور تھا لیکن بعد میں یہ اورنگ زیب کے بیٹے شاہ عالم سے منسوب تھا۔ انگریزی زمانے میں اسے دوبارہ بنوایا گیا۔ 1947 تک یہاں پولیس چوکی تھی لیکن آج یہاں نہ دروازہ ہے اور نہ ہی اس کا کوئی نام ونشاں!

○ موری دروازہ

یہ چھوٹا دروازہ لاہوری اور بھاٹی دروازے کے درمیان فصیل کے بُرج کے کونے میں بنا ہوا تھا۔ اگرچہ اس کا شمار لاہور کے بارہ دروازوں میں نہیں ہوتا بلکہ اسے موری کہا جاتا تھا اور اس کا استعمال لاہور شہر کا کوڑا کرکٹ باہر نکالنے کے لئے ہوتا تھا لیکن اس کے ساتھ عشق کی ایک کہانی وابستہ ہونے سے یہ چرچا میں رہا۔ کہتے ہیں کہ موراں نامی لاہور کی ایک مشہور طوائف مہاراجہ رنجیت سنگھ کی محبوبہ تھی۔ مہاراجہ پر عشق کا جنون اس حد تک پہنچ چکا تھا کہ اُس کا حکم تھا کہ ان کے دربار میں حاضر ہونے سے پہلے موراں کے دربار میں سلام کیا جائے۔ یہی نہیں، مہاراجہ نے موراں شاہی گز، موراں شاہی باٹ اور موراں شاہی سکّے تک رائج کر رکھے تھے۔ 1874 میں جب موراں کی وفات ہوئی تو مہاراجہ نے اُس کی عالیشان قبر بنوائی۔ شاہ عالمی دروازہ اور چوک مستی کے درمیان ایک مسجد بنوائی اور موری دروازے کے باہر ایک باغ بھی لگوایا۔ اس باغ میں ہندو سنت کی عقیدت میں اُس نے ایک مندر بھی تعمیر کرایا تھا۔ موری دروازے کو ان روایتوں سے جوڑ کر بھی دیکھا جاتا ہے لیکن آج لاہور میں اس دروازے کا کوئی نشان باقی نہیں ہے۔

کوئی دروازہ کھولے تو

فلسفے کی بات ہے — میں باہر سے دروازہ کھٹکھٹا رہا ہوں، کوئی اندر سے دروازہ کھولے، تو میں اندر جاؤں۔ اس میں بہت گہری کہیں روشنی کی بات پوشیدہ ہے — اس روشنی کی جو اندر سے دوازہ کھلنے پر ہی اندر آئے گی — ایسے ہی ہیں لاہور کے یہ دروازے!

لاہور کے بارہ دروازوں کے اندر اس شہر میں پیار کرتی، مسکراتی اور کبھی کل اور کبھی آج بنتی زندگی ہمیشہ زندہ رہی ہے۔ لاہور کا ہر دروازہ اتہاس کی داستانیں بیان کرتا ہے۔

○ لوہاری دروازہ

لوہاری دروازہ لاہور سے منسوب ہے اور اس کا نام لاہوری دروازہ تھا جو بگڑ کر لوہاری دروازہ ہو گیا۔ یہ شہر کا مرکزی دروازہ تھا۔ اس کی اہمیت اس بات سے واضح ہو جاتی ہے کہ جب محمود غزنوی نے منصوبہ بنایا کہ راجہ جے پال کو لاہور سے بے دخل کر کے وہ خود پنجاب پر پوری طرح سے قبضہ کر لیں تو اس نے راجا کو کئی مہینوں تک شہر کے اندر ہی گھیرے رکھا اور آخر کار اسی دروازے کے راستے بھاگ نکلا۔ محمود غزنوی نے اسی دروازے کے پاس پڑاؤ ڈالا تھا اور لاہور پر قبضہ کرنے کے بعد اس شہر کو آگ لگا دی تھی اور اسے ویران کر دیا تھا۔ جب بعد میں ملک ایاز کو پنجاب کا ناظم مقرر کیا گیا تو اس نے لاہور کو دوبارہ آباد کیا اور تعمیری کام اسی دروازے سے شروع کئے۔ اس کے بعد اس علاقے کو لاہوری منڈی کہا جانے لگا۔ انگریزوں کے زمانے تک اس دروازے کے نشان بھی مٹ چکے تھے لیکن اس جگہ کچھ کمرے موجود ہیں جو آج کل پولیس چوکی کے طور پر استعمال ہو رہے ہیں۔

○ بھاٹی دروازہ

بھاٹی دروازہ بھاٹ قوم سے منسوب ہے جو ملک ایاز کی حکومت کے دور میں یہاں آ کر بسے تھے۔ ایک دوسری روایت کے مطابق حضرت داتا گنج بخش نے جب اس دروازے کے باہر آ کر ڈیرا ڈالا تو انہوں نے اس کا نام بھاٹی دروازہ تجویز کیا تھا۔ لاہور میں انگریزوں کی آمد تک یہ دروازہ بوسیدہ ہو چکا تھا اور اس کی تعمیر بھی نئے سرے سے کی گئی تھی لیکن اس کی اصلی پہچان ہی گم ہو گئی تھی۔ اسی طرح ٹکسالی دروازہ کسی زمانے میں یہاں قائم سرکاری ٹکسالی کی وجہ سے مشہور ہوا جو لاہور شہر کی مغربی فصیل کے ساتھ تھا لیکن آج نہ تو یہاں کوئی ٹکسال ہے اور نہ دروازہ، صرف نام ہی باقی ہے۔

○ روشنائی دروازہ

یہ قلعہ لاہور اور شاہی دروازے کے درمیان واقع ہے۔ قلعہ لاہور کے شاہی کارندے، شہزادے اور شہزادیاں اسی دروازے سے شاہی مسجد اور اندرون شہر آتے جاتے تھے۔ اس لئے یہاں روشنی اور سجاوٹ کا خاص انتظام ہوتا تھا۔ شاہی تام جھام کے مطابق اس کا نام روشنائی دروازہ رکھا گیا۔ درحقیقت یہ لاہور کے شاہی قلعے کا بڑا دروازہ تھا لیکن قلعے کی مغربی دیوار کے باہر اور فصیلِ شہر کی دیوار کے اندر واقع ہونے کی وجہ سے اس کا شمار لاہور کے بارہ دروازوں میں ہوتا ہے۔ سمجھا جاتا ہے کہ یہ قدیم ترین دروازہ ہے اور اس کے پرانے موٹے موٹے چوبی کواڑ اب بھی موجود ہیں۔

○ مستی دروازہ

یہ دروازہ مست خاں بلوچ نامی ایک شاہی ملازم کے نام سے مشہور ہے۔ ایک طویل مدّت تک وہ اس دروازے کی حفاظت کے کام پر معمور رہا اور یہ اسی کے نام سے منسوب ہو گیا ایک اور سوچ کے مطابق اس کا اصلی نام مسجدی دروازہ ہے' کیونکہ اس کے قریب ہی بادشاہ اکبر کی والدہ مریم زمانی نے ایک مسجد بنوائی تھی جسے بیگم شاہی مسجد بھی کہا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے اس کا

نام مسجدی دروازہ کہلایا جو بعد میں آہستہ آہستہ بگڑ اور بدل کر مستی دروازہ ہوگیا۔ لاہور کے کئی دوسرے دروازوں کی طرح انگریزوں کی آمد تک یہ بھی ختم ہو چکا تھا۔

○ کشمیری دروازہ

کشمیری دروازہ اپنے نام کی طرح کشمیریوں سے منسوب ہے اور اس کا رُخ کشمیر کی طرف ہے۔ یہاں نہ صرف کشمیری قوم آباد تھی بلکہ کشمیر جانے کا راستہ بھی یہی تھا۔ اس کی عالیشان تعمیر بادشاہ شاہجہاں نے مکمل کرائی تھی۔ اس دروازے کے ٹوٹنے کے بعد انگریزوں نے اس کی تعمیر دوبارہ کرائی تھی۔

ماضی کی داستان

لاہور کا بھاٹی دروازہ صوفی فقیروں کی آمد کی نشاندہی ہے۔ بہت سارے حملہ آور اسی دروازے سے لاہور پہنچے۔ یہ دروازہ لاہور کی وراثت ہے۔ آج کل اس دروازے کے سامنے اور اِردگرد بیشک تاریخی یادیں دکھائی نہیں دیتیں مگر لوگوں کے دلوں میں وہ ابھی بھی تازہ ہیں ـــ!

لاہور کے بارہ دروازوں میں سے ایک بھاٹی دروازے کی کہانی سب سے مختلف ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس دروازے پر لاہور کے اُتار چڑھاؤ کے نشان بہت گہرے ہیں۔ بھاٹی دروازے کی کہانی شاید مہاتمابُدھ سے پہلے ہی شروع ہوچکی ہوگی کیونکہ دریا راوی اس کے پاس سے گذرتا تھا اور صدیوں سے اس جگہ پر ایک گذرگاہ تھی۔ اس دور میں جب بُدھ کے بھکشوؤں کی یہاں سے گذرنے کی جھلکیاں نظر آتی ہیں تو اس سے پہلے بھی مسافر اپنی اپنی تہذیب کے ساتھ یہاں سے گذرتے ہوں گے۔ وہ اپنا بہت کچھ چھوڑ جاتے ہوں گے اور بہت کچھ لے جاتے ہوں گے۔ ملک کے بٹوارے سے پہلے تک لاہور میں بُدھ بھکشوؤں اور جین مُنیوں کا آنا ہوتا تھا۔ ان کے اپنی اپنی دھرم اور پُوجا کے مقام تھے۔ پرانی انارکلی کے آخری کنارے سے ذرا آگے جین مندر کے گنبد دیکھ کر قدیم لاہور کا تصوّر کچھ اس طرح کیا جاسکتا ہے کہ جیسے اس شہر کی کلچرل یاترا کا آغاز بھاٹی دروازے سے ہی ہوا تھا۔

لاہور پر صدیوں پہلے چندر ونشی خاندان کی حکومت تھی۔ بھارت پر دارا اور سکندر کی چڑھائی کے وقت لاہور کی بھاٹی دروازے والی جگہ پر فوجی چوکیاں قائم کی گئیں تھیں اور سکندر یہاں تک پہنچ کر واپس چلا گیا تھا۔ اس سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ بھاٹی دروازہ لاہور کی حفاظت کی کُنجی تھا۔ اس لحاظ سے لاہور کے ہر طرح کے پھیلاؤ کا مرکزی نقطہ بھاٹی دروازہ ہی تھا۔

ہر دور میں جیسے جیسے لاہور کا رنگ روپ بدلا اس کے افسانے بھی بدلتے گئے اور سماجی و کلچرل پرتوں پر نئی پرتیں پڑتی گئیں۔

قدیم لاہور کی تاریخ میں بھاٹی دروازہ کبھی تیزی سے اُبھر کر سامنے آ جاتا ہے اور کبھی پوری طرح کہیں چھُپ سا جاتا ہے۔ اس دروازے پر لاہور میں داخل ہونے کے لئے لڑائیاں بھی ہوئیں اور اس کے قریب ہی واقع راوی دریا کے گھاٹ پر ایسے مُسافروں کی آمدورفت کے مناظر بھی دکھائی دیتے ہیں جن کی شخصیت سے لاہور نے اپنی خاص پہچان قائم کی تھی اور جن کے علم کی روشنی بھاٹی دروازے سے ہی لاہور میں آئی تھی۔ اس طرح بھاٹی دروازہ لاہور کے دوسرے دروازوں کے بڑے بھائی کا درجہ رکھتا ہے۔ اس برصغیر میں مسلمانوں کی باقاعدہ آمد سے قبل لاہور میں جس صوفی درویش نے قدم رکھا ان کا نام حضرت اسماعیل بخاری تھا۔ انہوں نے بھاٹی دروازے کے باہر ہی اپنا ٹھکانہ بنایا۔ اس کے بعد علی ہزویری آئے تو وہ بھی بھاٹی دروازے کے باہر ہی ٹھہرے۔ یوں بھاٹی دروازہ سبکتگین، محمود غزنوی، غوری خلجی، بلبنی، سوری اور مغل حکمرانوں کے دور میں اہم کردار ادا کرتا رہا۔ اس کے بعد مہاراجہ رنجیت سنگھ اور آخر کار انگریزوں کے قدموں کی چاپ بھی بھاٹی دروازے پر پڑی۔

بھاٹی دروازے میں مسلمانوں کی آبادی زیادہ تھی لیکن ہندوؤں میں دیوان بیج ناتھ، دیوان اودھیا پرشاد، دیوان شنکر ناتھ، پنڈت پریم ناتھ اور شونا تھ نے لاہور میں بہت نام کمایا۔ مولانا حالی، علاّمہ اقبال، مولانا ظفر علی، پنڈت شونارائن شمیم، محمد شاہ دین، منشی محمد دین فوق جیسے نامور لوگ بھاٹی دروازے کے مکیں رہے۔ لاہور کی پہلی ادبی انجمن بھی بھاٹی دروازے میں قائم ہوئی تھی جس کی بنیاد مشہور ڈرامانویس احمد شجاع پاشا کے والد محترم نے رکھی تھی۔ فلمی اداکار یعقوب اور اس کی بیوی خورشیدہ بیگم، فلم ڈائریکٹر کاردار، فلم ''منگتی'' کی ہیروئن راگنی اور بہت سے دوسرے فنکار بھی بھاٹی دروازے میں رہتے رہے۔

تاریخ بن چکا بھاٹی دروازہ لاہور کے کلچر کا اہم حصّہ ہے جسے ماضی کی داستان کی طرح اب صرف یاد ہی کیا جا سکتا ہے۔

روشنائی دروازے سے

لاہور کے کسی بھی دروازے سے گزرنے کا مطلب اتہاس کے پنّوں سے گذرنے جیسا ہے۔ روشنائی دروازہ اپنے ساتھ ہیرامنڈی لاہور کی یادیں لئے ابھی بھی موجود ہے۔

روشنائی دروازہ ــــــ شہر لاہور کے باہر کا یہ علاقہ سب سے زیادہ خوبصورت لگتا تھا۔ حضوری باغ کے مغرب میں شاہی مسجد ہے اور مشرق میں شاہی قلعے کا دروازہ۔ اس کے باہر مہاراجہ رنجیت سنگھ کی سمادھی ہے۔ اندر جائیں تو نوگزہ پیر سے تعارف ہوتا ہے جس کے سامنے بٹوارے سے کافی پہلے نامور موسیقار برکت علی خاں کی بیٹھک تھی۔ ہیرامنڈی جو نئے، پرانے اور بڑے شہر لاہور کے اندر ایک لازمی حصّے کی طرح ہمیشہ سے موجود رہی ہے، کہتے ہیں کہ یہ پہلے کبھی شہر سے باہر قائم ہوئی تھی۔ بڑے بوڑھوں کا کہنا ہے کہ ہیرامنڈی ایک طرف سے پرانی انار کلی کی طرف سے لوہاری دروازے میں داخل ہوئی تھی، جہاں آج بھی ''چوک متی'' موجود ہے۔ یہ چوک مرحوم متی بائی کے نام سے مشہور ہے جو اپنے وقت کی بہت مشہور طوائف تھی اور اس کا چار منزلہ نانک شاہی اینٹوں سے بنا ہوا مکان چند سال پہلے تک موجود تھا۔

طوائفوں کا یہ بازار (ہیرامنڈی) اس طرف سے رینگ رینگ کر چلتا ہوا اپنی آخری منزل تک پہنچ کر رُک گیا اور دوسری طرف سے یہ بازار سے دِلّی دروازے کے باہر ہی سے موجودہ ہیرامنڈی میں سمٹ گیا۔ پرانے شہر لاہور میں ہیرامنڈی کا اپنا ایک الگ سماجی اور مالی کردار ہے۔ اس علاقے کو لاہور کے تین چار تاریخی دروازے لگتے ہیں۔ شمال میں روشنائی دروازہ ہے جس کے باہر شاہی مسجد ہے۔ مغرب میں ٹکسالی دروازہ اور جنوب کی طرف بھاٹی گیٹ ہے لیکن لاہوری دروازہ اور موری دروازہ اپنی پُر پیچ گلیوں کے حال سے ہوتے ہوئے جب ایک

طرف گمٹی بازار اور دوسری طرف نوگزا پیر شروع ہو جاتا ہے جہاں استاد برکت علی خاں اور استاد مبارک علی خاں کی بیٹھکیں تھیں۔ یہ دونوں بڑے خاں صاحب غلام علی خاں کے چھوٹے بھائی تھے۔ ان کی بیٹھکیں موسیقی کی تعلیم کے مرکز تھے۔ نوگزہ پیر کے پیچھے کوچہ شاہباز خان تھا جہاں پنجاب کے دیہاتوں سے تعلق رکھنے والی مسلمان طوائفوں کے گھرانے آباد تھے۔ شاہی مسجد کی طرف سے جانے والے چوک سے مغرب کی طرف، جہاں اب ناولٹی سینما ہے، ہیرا منڈی کا صدر بازار تھا اور یہاں سے دو راستے چیت رام روڈ اور بازار شیخو پوریاں میں کھلتے تھے اور ان کا تعلق ٹبی تھانے کے پیچھے کوچہ سبز پیر اور ٹبی گلی سے تھا جہاں غریب اور مظلوم عورتیں اپنا جسم فروخت کرتی تھیں۔

چوک نوگرہ پیر کے پیچھے کی گلی میں تصور والی بائی فیروزاں کا گھر تھا جہاں بچپن میں نور جہاں اکثر آیا کرتی تھی اور محلّے کے بچّوں کے ساتھ کھیلتی رہتی تھی۔ وہی نور جہاں بڑی ہو کر ملکۂ ترنّم بنی۔ صدر بازار میں اختری کا گھر تھا جس نے مشہور فلموں ''خاندان'' اور ''زمیندار'' وغیرہ میں کام کیا تھا۔ یہاں ہزاروں کہانیاں اور ہزاروں کردار تھے اور ترقی پسند اردو افسانہ نگار غلام عبّاس کی کہانی ''آنندی'' نے بھی اسی ہیرا منڈی میں جنم لیا تھا۔ غلام عبّاس بھی محلّہ ستھاں کے رہنے والے تھے اور اندرونی شہر لاہور میں پیدا ہونے والے ہر بچّے کی طرح ان کا بچپن بھی انہیں راستوں سے گذر کر جوانی کے دور میں داخل ہوا تھا۔

لاہور میں ہیرا منڈی کے وجود میں آنے سے قبل طوائفیں لاہور کے نوابوں، جاگیرداروں اور امیروں وزیروں کے حرم سراؤں میں ہوتی تھیں جنہیں سالانہ تنخواہ ملتی تھی اور ان پر منحصر سازندوں اور دیگر لوگوں کو الگ خرچہ دیا جاتا تھا۔ پھر انہیں الگ رہائش گاہیں مہیا کرنے کی ضرورت پڑی تو لاہور کے کئی حصّوں میں طوائفوں اور مراثیوں کے محلّے آباد ہو گئے جن میں ان سے متعلق کئی گلی محلّے آج بھی لاہور میں موجود ہیں۔

لاہور کی گلیاں

انہیں گلی کوچوں میں وارث کی ہیر کا پیار پروان چڑھا تھا۔ انہیں گلی کوچوں میں آج محبت کھیلتی ہے۔ ان گلیوں نے اتہاس کو بھی سنبھال کر رکھا ہے اور لاہور کے کلچر کو بھی۔ وقت بدلتے لاہور نے بھی کروٹ لی ہے اور نئی سمت میں قدم بڑھایا ہے۔

لاہور کی گلیاں قیس اور لیلا کی گلیوں جیسی ہیں کیونکہ ان گلیوں کی فضاؤں میں روحانی زندگی کے روز نئے پھول کھلتے ہیں رنگین آنچلوں میں لہراتے جھمکے، چلمنوں سے جھانکتی شرمیلی آنکھیں، چکوں کے پیچھے کی دھیمی دھیمی سرگوشیاں، معصوم بچوں کی آنکھ مچولی، بوڑھوں کے حقوق کی گڑگڑاہٹ اور گلی کوچوں کے تھڑوں پر بیٹھنے والوں کی گپ شپ — ان گلیوں میں کیا کچھ نہیں زندگی کا ہر رنگ روپ یہاں ملتا ہے۔

پرانے زمانے کا لاہور تنگ تاریک، ٹیڑھی میڑھی گلیوں کا شہر ہے۔ انسانی تہذیب کے اتار چڑھاؤ کی ان گنت داستانیں ان گلی کوچوں میں بکھری پڑی ہیں۔ یہاں اس شہر کی پُرانی تہذیب کے آثار ملتے ہیں اور قومی ثقافت کا پتہ چلتا ہے۔ یہاں کے سماجی اور مالی حالات سامنے آتے ہیں، رسم ورواج اور روائیتوں کے نقش اجاگر ہوتے ہیں اور بیتے یگوں کی کہانیاں، کامرانیوں اور تباہیوں کے قصے یہی گلیاں کوچے سناتے ہیں۔ یہیں اس شہر کا ماضی میٹھی نیند سو رہا ہے۔

تاریخی حقائق بتاتے ہیں کہ قدیم لاہور میں کئی طرح کی ہندو قوم آباد تھی۔ لگ بھگ ایک ہزار سال قبل یہاں ہندوؤں کے علاوہ کوئی دوسری قوم نہیں تھی۔ محمود غزنوی کے حملوں کے وقت مسلمان بھی کافی تعداد میں یہاں آ کر بس گئے۔ پھر عیسائی کچھ تعداد میں یہاں آئے لیکن اس وقت ہندو قوموں میں برہمن، کھتری، اروڑہ، راجپوت وغیرہ آباد تھے۔ پھر ایک وقت ایسا بھی

آیا کہ اس شہر میں کھتریوں (کشتریوں) کی تعداد بڑھ گئی جو کافی مالدار قوم تھی۔ لاہور میں مقیم مسلمانوں قاضی، قریشی، مغل، پٹھان، شیخ، خوجے، پراچے، گمنیز ئی نے لاہور کے گلیاں کوچے اور محلے آباد کیے اور ان قدیم محلّوں کوچوں میں محلّہ لنگر خاں بلوچ، کوچہ مہر آرائی، بستی کوٹ عبداللہ شاہ، محلّہ موج دریا بخاری، کوچہ شاہ چراغ، کوچہ خوجیاں، محلّہ جاٹ پورہ، محلّہ میانی صاحب، کوچہ مائی لاڈو، محلّہ دائی انگاں، کوچہ پیر، محلّہ گنج، گلی بچھوں والی، کوچہ قصاباں وغیرہ لاہور کے قدیم ترین گلی محلے ہیں اور یہ آج بھی اس شہر میں موجود ہیں۔

آج نیا لاہور وجود میں آچکا ہے لیکن پرانی گلیاں تو پرانی گلیاں ہی ہیں جو دلچسپ ناموں کے علاوہ زندگی کے مختلف پہلوؤں کی نمائندہ اور کئی خاندانوں اور قوموں کی داستانیں سمیٹے ہوئے ہیں اور ان کی تعمیر، بناوٹ اور ناموں میں برادریوں، انسانوں اور کام کاج (کاروبار) کا بھی خاص تعلق ملتا ہے۔ ایسے گلی محلّوں میں گلی گوجراں، کوچہ کمھاراں، گلی کبوتر شاہ، گلی چڑی ماراں، گلی ماتا والی، کوچہ چابک سواراں، گلی پھلیراں، گلی ارائیاں، کوچہ رڑا وغیرہ بطور خاص قابلِ ذکر ہیں۔ لاہور کی کئی گلیاں رومانوں کی یادیں بھی تازہ کرتی ہیں جیسے کوچہ سیف الملوک، گلی موراں، اور کوچہ سوہنی مہیوال۔

پرانے لاہور کی پرانی گلیاں اتنی تنگ، اندھیری اور ٹیڑھی ہیں کہ ان کے آمنے سامنے کے مکان ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں اور عورتیں چھجّوں کو آسانی سے پھلانگ کر ایک دوسرے کے گھر آتی جاتی ہیں۔ ان گلیوں نے لوگوں کو ''تھڑا پالیٹکس'' مہیا کی ہے اور ماجھے و گامے جیسے پیارے نام دئے ہیں۔ آج بھی لاہور کو چھوڑ کر آئے بٹوارے کا درد اپنے سینے میں چھپائے بیٹھے بزرگ لاہور کی گلیوں کو یاد کر کے اداس ہو جاتے ہیں۔ ان کی آنکھوں کے آگے وہی منظر گھومنے لگتے ہیں۔ اسی لئے اکثر لوگ کہتے ہیں کہ آپ سارا جہاں گھوم آئیں لیکن لاہور جیسے گلی کوچے کہیں نہیں ملیں گے۔ لاہور کے بارے میں اپنے دل کی بات کرتے ہوئے ایک شاعر نے کیا خوب کہا ہے کہ

بہت دیکھی دِلّی اور اندور کی گلیاں
نہ بھولی ہیں، نہ بھولیں گی لاہور کی گلیاں

سارا جہان میرا

لاہور کی اس سیر میں پنجابیت کا جہان دھڑکتا ہے۔ایک ایسا احساس ہے ان گلیوں میں جسے پنجابی کے شاعر اُلفت باجوہ ''سارا جہان میرا'' کہتے ہیں——!

لاہور کے اتہاس، کلچر اور روایتوں کے حوالے سے ہم نے لاہور کے بارہ دروازوں، تیرہویں موری اور شہر کی فصیل کی کہانی سُنی ۔ یہ لاہور بیتے یگ کا لاہور تھا۔ایک لاہور وہ بھی تھا جو بٹوارے سے پہلے مشترکہ پنجاب کا لاہور تھا اور یہی وہ لاہور تھا جو سب کا مشترکہ تھا۔اس لاہور کے بارہ دروازوں کے اندر ہندو، مسلمان، سِکھ آباد تھے۔کہیں کہیں وہ الگ الگ اکائیوں میں رہتے تھے اور کہیں مشترکہ آبادی تھی۔ مندر، مسجدیں، خانقاہوں اور سِکھوں کی باؤلیاں پورے لاہور میں پھیلی ہوئی تھیں۔عید، شب برات، دیوالی، دسہرہ اور بسنت وغیرہ تمام مذاہب کے سبھی تیوہار دھوم دھڑاکے سے منائے جاتے تھے۔ملی جُلی آبادی اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے ایک دوسرے پر منحصر تھی۔ ہندو سود کا کاروبار، کپڑے کا بیوپار، سونے چاندی کی تجارت اور غلّے کا لین دین کرتے تھے۔ بجاج ہٹّاں، گمٹی بازار، سوہا بازار، مچھّی ہٹّا اور شاہ عالمی تک کا کاروبار ہندوؤں کے ہاتھوں میں تھا اور وہ اونچی اونچی عمارتوں اور جائیدادوں کے مالک تھے۔مسلمان لاہور سے باہر کھیتوں میں کام کرتے تھے۔ وہ اناج اور سبزیوں کی کاشت کرتے تھے۔زیادہ تر یہ لوگ ہنرمند اور کاریگر تھے۔برِٹش حکومت میں بھی لاہور میں مسلمانوں کے چند ہی گھرانے ہوں گے جو جائیدادوں کے مالک تھے یا جن کی کھیت زمینیں تھیں۔ ہندوؤں اور سکّھوں کی بڑی حویلیاں—— حویلی راجا دھیان سنگھ، حویلی بلی مل اور حویلی رائے دیوان چند وغیرہ کے مقابلے میں صرف ایک حویلی میاں خاں کسی مسلمان کے نام سے مشہور تھی۔

انار کلی لاہور کا سب سے بڑا کاروباری مرکز تھا جہاں سب کی سب دوکانیں ہندوؤں

اور سکھوں کی تھیں۔ ایک چھوٹی سی دوکان شیخ عنایت اللہ مسلمان کی تھی۔ اسی بازار میں بیلی رام کی دوائیوں کی صرف ایک اور بہت بڑی دوکان تھی۔ انارکلی کے سرے پر سکھوں کی دہی لسّی کی بہت بڑی دوکان تھی جس کا نام ''بھائیاں دی ہٹّی'' تھا۔ ہندو، مسلمان اور سکھ تمام لوگ اس دوکان سے لسّی پیتے تھے اور ان کے برتن الگ الگ ہوتے تھے۔ انارکلی بازار میں ہی بھلّہ شو کمپنی جوتوں کی بہت بڑی اور مشہور دوکان تھی۔ لوہاری دروازے کے باہر تانگوں کا ایک بہت بڑا اڈہ تھا جس کے لوہے کے شہتیروں پر لوہے کی چادروں کی چھت تھی۔ اس کے ٹھیک سامنے شراب کا ٹھیکہ ہوتا تھا اور ساتھ ہی بھنگ کا ٹھیکہ بھی تھا۔ اندرونی لاہور میں بھی بے شمار ٹھیکے زیادہ تر مسلمان شراب، افیم اور بھنگ کا استعمال کرتے تھے۔ یہ محنت مزدوری کرنے والے لوگ تھے۔ ڈھلائی کے کارخانوں، کپڑا بننے والی کھڈیوں، درزی خانوں وغیرہ میں دن بھر کام کرنے اور زیادہ پیسہ کمانے کے لئے نشہ کرتے تھے۔

لاہور میں سونے کی بڑی بڑی دوکانیں ہندوؤں کی تھیں اور ان کی دوکانوں پر سونے کی اینٹ کھلی پڑی ہوتی تھی اور ان دوکانوں میں رات بھر چراغ جلتے تھے۔ لاہور کے دروازے تو اب نہیں ہیں لیکن ان کی نشانیاں کہیں کہیں موجود ہیں۔ چاروں طرف پھلدار درخت تھے۔ درمیان میں چمکتے ہوئے پانی کی نہر بہتی تھی اور شہر کے مقیم ان باغوں میں وقت گذارتے تھے۔ اندرونی شہر کی گلیاں تنگ لیکن سڑکیں چوڑے چوڑے پتھروں سے بنی ہوئی تھیں۔ ان سڑکوں اور باغوں کی بہت اہمیت تھی۔ یہاں محفلیں جمتی تھیں، جلسے ہوتے تھے، مشاعرے بھی ہوتے تھے۔ موری دروازے کے باغ میں ہی سائمن کمیشن کے خلاف لالہ لاجپت رائے نے جلسہ کیا تھا جس پر پولیس نے لاٹھیاں برسائیں اور لالہ جی زخمی ہوگئے تھے۔ دلّی دروازے کی اہمیت جلسوں سے تھی اور استاد دامن اکثر ان جلسوں میں اپنی نظمیں پڑھتے تھے۔

قابلی مل کی حویلی کے پاس کوچہ کندی گراں صرف اس لئے مشہور ہوتا تھا کہ یہاں بابے مُولے کا تندور ہوتا تھا جو پورے لاہور میں مشہور تھا۔ یہاں پنچولی اسٹوڈیو سے مینا شوری، منورما اور کئی دوسرے مشہور فنکار دال کھانے کے لئے اکثر یہاں آیا کرتے تھے اور لوگ قطار میں کھڑے ہوکر دال کے لئے اپنی باری کا انتظار کرتے تھے۔

وقت میں کھوئے دِن

وقت نے کروٹ لی اور سارا پرانا کلچر اتہاس کی بانہوں میں چلا گیا۔ اب وہ دن وقت کی دھول میں کھوئے سے نظر آتے ہیں جو کبھی چمچماتے تھے ———!

میں لاہور ہوں اور کبھی ختم نہیں ہونے والی میری کہانی جاری ہے ——— کئی طرح کے الیکشن پہلے بھی ہوتے تھے اور اب بھی ہوتے ہیں لیکن ان کا رنگ روپ اور تیور سب بدل گئے ہیں۔ 1947 کی تقسیم سے قبل لاہور میں جب کوئی الیکشن ہوتے تو گلیوں اور بازاروں میں جلوس نکلتے تھے۔ بھنگڑے ڈالے جاتے تھے۔ محلّوں میں دفتر کھل جاتے تھے۔ لاہور کے لوگ الیکشن میں اس طرح حصّہ لیتے تھے جیسے بیاہ شادی میں مصروف ہوں۔ وہ جہاں جہاں بھی کوئی کام کرتے تھے وہاں سے چھٹیاں لے لیتے تھے۔ میلوں، تیوہاروں، چہلم، ولیموں میں ساتھ ساتھ شامل ہونے والے یہ لوگ الگ الگ اُمیدواروں میں تقسیم ہو جاتے تھے۔ ایک دوسرے کے خلاف افواہیں اڑاتے، نعرے لگاتے، طعنے کستے اور جیوں ہی الیکشن گذر جاتے وہ پھر سے راوی دریا کی سیروں، محفلوں، مقبرہ جہانگیر اور چراغوں کے میلے کے جشنوں میں ساتھ ساتھ دکھائی دینے لگتے تھے۔ الیکشن کی تلخیوں کو پتنگوں، بٹیروں اور چوپٹ کے مقابلوں میں بالکل بھول جاتے تھے۔

وہ کیا زمانہ تھا اور کیسے کیسے شاندار لوگ تھے۔ لاہور کے مندروں، گوردواروں اور مسجدوں سے ایک ساتھ صبح کی عبادتوں کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ مندروں کی گھنٹیوں، گوردواروں کے پاٹھ اور مسجدوں کی اذانوں کا آپس میں کبھی کوئی جھگڑا نہیں ہوا تھا۔ ہندوؤں کی باراتیں مسجدوں کے سامنے سے گذرتے وقت بینڈ باجہ بند کر دیتی تھیں اور مسلمانوں نے کبھی کسی گائے کی ہڈی مندر کے سامنے نہیں پھینکی تھی۔ ہولی، دیوالی، دسہرہ اور جوڑ میلہ جیسے بڑے تیوہاروں پر کبھی کوئی فساد نہیں ہوا تھا۔ اندرونی لاہور میں محرّم کے جلوسوں پر گذرتے ہوئے ہندو

گھروں سے گلاب چھڑکا جاتا تھا۔ دیوالی اور ہولی کے تیوہاروں پر مسلمانوں محلّوں میں بہت رونق ہوتی تھی۔ بسنت اور لوہڑی کے تیوہار نہ مسلمان تھے اور نہ ہندو تھے۔ دیوالی پر چینی کے کھلونے مسلمان بچے بھی خریدتے تھے اور ہندو مسلمان ایک ساتھ جوا بھی کھیلتے تھے۔ ہولی، دیوالی اور دسہرے پر مشاعرے ہوتے تھے جس میں سبھی مذہبوں کے لوگ شرکت کرتے تھے۔

عید اور شب برات پر مسلمان اپنے ہندو سِکھ دوستوں اور ملنے جلنے والوں کو مٹھائی کے تحفے بالکل اسی طرح بھجواتے تھے جیسے دیوالی اور دسہرے پر ہندو اپنے مسلمان دوستوں کو بتاشے، مِشری، پھول اور مٹھائیاں پیش کرتے تھے۔ ان تمام باتوں کے باوجود ہندو، سِکھ اور مسلمان اپنی اپنی پہچان رکھتے تھے اور ہندو، ہندو ہی نظر آتا تھا — سِکھ، سِکھ ہی تھا اور مسلمان، مسلمان ہی تھا۔ اس دور کی زندگی نہ تو ہندو تھی، نہ مسلمان تھی — بس زندگی تھی۔ لوگ صدیوں پُرانی بے خبری میں گُم تھے۔ ہر محلّے، ہر گلی میں کوئی فرق نہیں تھا۔ اگر مسلمانوں کے محلّے میں کوئی مزار تھا تو ہندوؤں کے محلّے میں ہر کی پوڑی ضرور ہوتی تھی، اندرونی لاہور کا رہن سہن کئی طبقوں میں بٹا ہوا تھا۔ محلّوں، گلیوں میں غریب لوگ زیادہ تھے اور ایک دوسرے کے گلی کوچوں میں یہ لوگ آسانی سے گھومتے پھرتے تھے۔ کھانے پینے کی دوکانوں کے معیار الگ الگ تھے لیکن سودا سلف، کپڑے وغیرہ کی خریداری میں ہندو مسلمان میں کوئی فرق نہیں تھا۔ مسلمان ہندو اور سکھ ڈاکٹروں سے علاج کراتے تھے اور ہندو سِکھ مسلمان حکیموں اور ڈاکٹروں کو نبض دکھاتے تھے۔

اندرونی شہر میں کبھی کبھی جب ہیضہ، چیچک وغیرہ کی بیماری پھیل جاتی تو دواخانوں کے آگے قطاریں لگ جاتیں۔ اردو کے مشہور افسانہ نگار و ادا کار انور سجّاد کے والد ڈاکٹر دلاور حسین چُونا منڈی میں، ڈاکٹر بھگت رام، سَید مٹھا اور کُمٹی بازار میں، ڈاکٹر بسنت سنگھ بانسانوالہ طبیلہ میں اور اندرون موچی دروازے میں ڈاکٹر بہادر چند اس وقت کے مشہور ڈاکٹر تھے۔

شاہ عالمی دروازے کے باہر اور مستی دروازے کے اندر حویلی راجہ دھیان سنگھ کے سامنے آیورویدک ہسپتال تھے اور بھاٹی دروازے کے اندر ڈاکٹر بخاری کا شفاخانہ تھا۔ بیماری کی وبا پھیلنے سے جب ان ہسپتالوں اور ڈاکٹروں کے آگے مریضوں اور مرنے والوں کی بھیڑ بڑھ جاتی تو دعائیں مانگنے کے لئے لاہور کے مندروں، مسجدوں اور مزاروں کے آگے بھی ہجوم بڑھ جاتا۔

فصیلوں والے شہر میں

اپنے آغوش میں بہت ساری یادوں کو لے کر اونگھ رہے اس شہر میں کہیں کہیں کئی طرح کے کلچر دھڑکتے تھے۔ وقت کے ساتھ آہستہ آہستہ ان میں تبدیلی آتی گئی۔ اتہاس کروٹ بدلتا گیا۔ لاہور دوسرے رنگ میں رنگتا گیا اور پہلے رنگ وقت کے ساتھ ساتھ پھیکے پڑتے گئے۔

لاہور تب کے دور میں گورکی اور دوستو وسکی کے ناولوں کے کرداروں جیسے ذِلّتوں کے مارے لوگوں کا شہر بھی تھا۔ مقامی کاریگروں اور بے ہُنر شہریوں میں کشمیر کے ہاتھ اور بیکانیر کے پُور بیئے بھی تھے جو چھوٹی چھوٹی کوٹھڑیوں میں رہتے تھے جہاں مٹی کے تیل کی لالٹینیں اور سرسوں کے تیل کے دِیے جلتے تھے۔

انگریزوں کا زمانہ تھا اور اس وقت فصیلوں والے شہر لاہور کے اندر کوئی ایسا محلّہ یا گلی نہیں تھی جہاں اپنچی، شرابی، چنڈو باز، بھنگی اور چرسی نہ ہوں۔ افیم، بھنگ اور شراب کے سرکاری ٹھیکے تھے۔ چنڈو اور چرس فروخت کرنے پر پابندی تھی لیکن پینے کی عام آزادی تھی۔ کئی چنڈو خانے بہت مشہور تھے۔ ان میں سے ایک نیتی کا چونا منڈی والا چنڈو خانہ بھی تھا جہاں مستی دروازے کی پولیس اکثر چھاپے مارتی تھی۔ محلّے اور گلیوں میں نشے بازوں کو لڑکوں، راہگیروں، دوکانداروں کے مذاق کا نشانہ بننا پڑتا تھا۔ کسی نشئی پر ٹھنڈا پانی ڈالا جاتا تھا تو کسی کے منہ پر تندور کی کالکھ پوتی جاتی تھی۔ جوئے خانوں پر چھاپے پڑتے اور پولیس ان کا منہ کالا کرکے محلّے سے گذرتی تو گھروں کی کھڑکیوں میں سے عورتیں اور بچّے دیکھتے تو اس جلوس کی خبریں آس پاس کے گلی کوچوں میں پھیل جاتیں۔

اندرونی شہر لاہور میں اس زمانے میں پیدا ہونے والے بچّوں کو رات کو سُلانے کے

لئے مائیں افیم کھلاتی تھیں ۔ بھنگ شغل کے طور پر بھی پی جاتی تھی اور یہ نشہ بھی تھا۔ بھنگ کے ٹھیکوں پر صبح ہی قطاریں لگ جاتی تھیں اور افیم کے ٹھیکے دیر رات تک کھلے رہتے تھے۔گلی محلے میں بھنگ شرارت کے طور پر بھی پلا دی جاتی تھی۔ پکوڑے، پاپڑ، بادام کی سردائی، قیمے والی روٹی کی شکل میں بھنگ کے استعمال کی کئی معصوم حرکتیں کئی دنوں تک فصیلوں کے اندر آباد شہر میں قہقہوں کو جنم دیتی رہتی تھیں۔ یوں لگتا ہے کہ اس وقت کے لاہور کی زندگی جیسے نشے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ گھروں میں پوست کے ڈوڈے ہمیشہ موجود رہتے تھے۔شدید سردی کے موسم میں نمونیا مرض کا شکار ہونے والے، بچّوں کے گھریلو علاج کے طور پر پوست کا قہوہ پلایا جاتا تھا اور مسلمانوں میں ختنہ کرنے سے پہلے بچّوں کو پوست کا حلوہ کھلایا جاتا تھا تاکہ وہ ختنے کے زخم کو برداشت کرسکیں اور سوئے رہیں۔

ان دنوں کے لاہور کی زندگی میں نشے کی لہر بہت طاقتور تھی۔کئی گھرانوں میں شادی بیاہ اور منگنی کے موقع پر بے پناہ شراب پی جاتی تھی اور شوروغل مچاتے باراتیوں کو دیکھنے کے لئے مکانوں کی کھڑکیوں اور دروازوں پر لگی ہوئی چکوں کے پیچھے عورتیں اور لڑکیاں گھنٹوں کھڑی تماشہ دیکھتی رہتی تھیں۔ ہر کوچے اور گلی میں کوئی شرابی لالو، محمدا اور لاڈا ضرور ہوتے تھے جو شراب کے نشے میں سارے محلّے کی چرچا کا موضوع بن جاتے تھے اور کئی دن ایسے شرابی کی باتیں جاری رہتیں جو نشے کی حالت میں ہڑدنگ مچاتا ہے— بھڑکیں لگاتا ہے اور لڑکھڑا کر گر پڑتا ہے۔عید بکرعید پر ایسا عام ہوتا تھا۔دیوالی، دسہرہ اور بیساکھی کے تیوہاروں پر ہندو سِکھ بھی پیچھے نہیں رہتے تھے۔

جب ہم لاہور کو اپنے دل میں بسے لاہور کے رُوپ میں سوچتے اور دیکھتے ہیں تو نشے میں ڈوبے لاہور کی یہ تصویر ہمیں بے حد ناگوار لگتی ہے لیکن حقیقت یہی ہے کہ ہر چیز کے دو رُخ ہوتے ہیں— خوبصورت اور بدنما۔تب ہم قبول کرنے کے لئے مجبور ہو جاتے ہیں کہ ہمارا کلچر خوبصورت بھی ہے اور خوبصورت نہیں بھی ہے۔ہم یہ قبول بھی کرتے ہیں کہ کلچر کے اس دوسرے روپ کو گورکی اور دوستووسکی نے صرف روس میں ہی نہیں دیکھا، یہ لاہور میں بھی ہے،لندن، دہلی اور نیویارک میں بھی ہے۔

مشترکہ پنجاب کی وراثت

وقت نے اپنے ساتھ سماج کو بدلنا بھی ہوتا ہے مگر یہ رفتار اتنی دھیمی ہوتی ہے کہ برہنہ آنکھ کو دکھائی نہیں دیتی۔ پھر جب وہی آنکھ ماضی کی پرچھائیں کی طرح اُس ماحول کو ڈھونڈتی ہے تو اداسی ہی اُس کی جھولی میں پڑتی ہے۔

لاہور کی ہر ادا نرالی تھی۔ اس شہر میں خوشی کی ہر تقریب کے موسم بس اچانک ہی آجایا کرتے تھے۔ بیاہ شادیوں پر اندرونی شہر میں کئی کئی دن رونق رہتی تھی۔ شہر میں بڑے بڑے جنج گھر تھے جہاں مقامی اور باہر سے آنے والی باراتیں ٹھہرتی تھیں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کا ان پر مشترکہ حق ہوتا تھا۔ ان کا استعمال سماجی اور فلاح کے کاموں کے لئے سخت ہوتا تھا۔ ان کی دیکھ بھال اور مرمّت وغیرہ اس علاقے کے امیر لوگوں کی کمیٹی کے ذریعے کی جاتی تھی جن میں ہندوؤں کی تعداد زیادہ ہوتی تھی۔ لاہور شہر میں بیاہ شادیوں کا جلوس جلسے ہفتہ ہفتہ جاری رہتے تھے۔ امیر گھرانے کے ہندوؤں کی باراتیں بہت پُر رونق ہوتی تھیں۔ ہندو دولہا ہاتھ میں تلوار لے کر گھوڑے پر بیٹھتا تھا اور اس کے گھوڑے کے پیچھے سُرخ جنات اور سنہری ساز و سامان سے سجے گھوڑوں کی قطاریں ہوتی تھیں۔ ان کے پیچھے باراتی چلتے تھے۔ سب سے آگے بینڈ باجے والے فلمی اور غیر فلمی دُھنیں بجاتے تھے۔ شادی والے گھروں میں حلوائیوں کی بھٹیاں لگی ہوتی تھیں اور کئی کئی دن طرح طرح کی مٹھائیاں تیار ہوتی رہتی تھیں۔ ہفتہ بھر بارات ٹھہرنے کا عام رواج تھا۔ بارات کی خدمت کے لئے پان کی دوکانوں بوٹ پالش، دھوبی، حجّام وغیرہ کا خاص انتظام رہتا تھا۔

مسلمانوں اور ہندوؤں کی بیاہ شادی کی رسمیں لگ بھگ ایک جیسی تھیں۔ مسلمان دولہا بھی ہندو دلہے کی طرح گھوڑی پر چڑھتا تھا۔ دونوں کے یہاں عورتیں ایک جیسے لوگ گیت گاتی تھیں۔ مسلمان شادیوں میں صرف اپنی اپنی برادری کے لوگ شریک ہوتے تھے۔ پلاؤ، زردہ اور

شوربے کی دیگیں پکتی تھیں، گانے والے اور بھانڈ موقع پر پہنچ جاتے تھے۔ طوائفوں کا مُجرہ ضرور ہوتا تھا۔ دھوبیوں، گوجروں اور درزیوں کے یہاں مجرہ لازمی ہوتا تھا اور رات گئے تک چوکوں یا بڑی بڑی بیٹھکوں میں مُجرے ہوتے تھے جن میں بچے، جوان، بوڑھے اور عورتیں بھی بھرپور انداز میں شریک ہوتے تھے۔ 1940 کے آس پاس نیتی دیکھوالی اور ٹنڈی بائی دو بہت خوبصورت طوائفوں کا خوب چرچا تھا۔

اندرونی شہر لاہور میں شادی بیاہ کے علاوہ عقیقہ، ختنے اور ایسی دوسری تقریبات پر اس دور کے ثقافتی طائفے بھی شریک ہوتے تھے۔ ان دنوں حُسینہ بھنڈ کا طائفہ بہت مشہور تھا۔ اس میں طبلہ، سارنگی، ہارمونیم کے ماہر اور ہیر و مرزا صاحباں اور ماہیا گانے والوں کے علاوہ ایسے لڑکے بھی تھے جو ہیر اور سوہنی کا کردار ادا کرتے تھے۔ یہ محلّے کے کسی چوک یا مکان کی کھُلی بیٹھک یا چھت پر سیٹ لگاتے تھے اور رات بھر ہیر کا ڈرامہ کھیلا جاتا تھا۔ ہیر اور رانجھا کا کردار ادا کرنے والے دونو جوان سلیم اور اقبال ان دنوں لاہور میں بہت مشہور تھے۔

وارث شاہ کا کلام وہ بہت خوبصورت انداز اور سریلی آواز میں گاتے تھے۔ بعد میں یہ دونوں بھائی فلمی دُنیا میں موسیقار سلیم اقبال کے طور پر بے حد مقبول ہوئے۔ استاد اقبال حسین نے تو غزل گائیکی میں بہت نام پیدا کیا اور ملک کی تقسیم کے بعد بھی بہت طویل عرصے تک جانے جاتے رہے۔ بھاٹی دروازے کا حکیم سراج عرف ساجھی ہیر پڑھنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا۔ جب وہ ہیر پڑھنے کے مقابلوں میں شریک ہوتا تو سُننے والوں کی بے پناہ بھیڑ ہوتی اور رات گئی تک گیسوں کی روشنی میں ہیر وارث شاہ پڑھی جاتی۔

لاہور کی محفلوں کے کئی رُوپ اور بھی تھے۔ ہر محلّے میں کسی نہ کسی بزرگ کا مزار ہوتا تھا اور ان کے عُرس باقاعدگی سے منائے جاتے تھے۔ محلّہ وارتکیوں میں چوپٹ اور تاش کی بازیاں بھی لگتی تھیں۔ کبوتروں اور بٹیروں کے مقابلے بڑے زور و شور سے ہوتے تھے۔ ہر تیسرے گھر کی چھت پر کبوتروں کی چھتری لگی ہوتی تھی اور اندرونی شہر کی زیادہ تر دوکانوں سے بٹیروں اور تیتروں کے بولنے کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ مشترکہ پنجاب کی وراثت کا حصّہ رہی بینڈ باجے، ہیر رانجھا، ثقافتی طائفے، بھانڈوں اور گانے والیوں کی تمام آوازیں نہ جانے آج کہاں گُم ہوگئی ہیں۔

شاہ عالم سے شیتلا مندر تک

ہندو سکھوں کی مشترکہ وراثت والا لاہور اب بھی ہمارے دِلوں میں کہیں دھڑکتا رہتا ہے۔ وقت اور حالات کے ذریعے بدلے جانے کے باوجود ابھی بھی پرانا لاہور ہے ہماری آنکھوں میں ——— !

مُلک کی تقسیم سے پہلے ہی پُرانے لاہور کے باہر نیا لاہور ابھرنا شروع ہوگیا تھا۔ حالانکہ شہر سے باہر زنگ اور ساندا کلاں کی لاہوری بستیاں دُلّا بھٹی کی پھانسی سے پہلے بھی موجود تھیں لیکن اندرونی شہر میں پیدا ہونے والے بچّے مزنگ اور سانداں کلاں کے بجائے ''ٹھنڈی سڑک'' اور ''کیلیاں والی سڑک'' کا نام زیادہ جانتے تھے۔ نئی نئی اور خوبصورت مال روڈ کو ٹھنڈی سڑک کہتے تھے۔ برانڈرتھ روڈ پر کیلوں کے درخت تھے بھی یا نہیں لیکن یہ ''کیلیاں والی سڑک'' کے نام سے مشہور تھی اور لاہور تیزی کے ساتھ ان دونوں سڑکوں کے نام سے مشہور ہو رہا تھا۔ مال روڈ پر بڑا ڈاکخانہ، عجائب گھر، نقی بلڈنگ، پنجاب یونیورسٹی، ٹولنٹن مارکیٹ، کمرشی اور سِول ملٹری گزٹ بلڈنگ، لکشمی مینشن، گنگا رام ٹرسٹ اور وکٹوریہ بلڈنگ بہت مشہور تھے۔ لیکن اندرونی شہر میں بسنے والے لوگوں کی زندگی شہر کی فصیل کے اندر تک ہی محدود تھیں۔ ان کی واقفیت بھی محدود ہی تھی۔ ان کی واقفیت کا ذریعہ صرف وہ درزی، راج، ترکھان، لوہار وغیرہ لوگ ہی تھے جو فصیلوں سے باہر تعمیر ہونے والے نئے لاہور سے روزی روٹی کماتے تھے۔

اندرونی لاہور کے حماموں، تندوروں اور نائیوں کی دوکانوں پر نئے لاہور کی اسطرح بات ہوتی تھی جیسے کوئی ولایت سے ہوکر آیا ہو۔ ولایت کی طرز کی ٹھنڈی سڑک پر گھومنے پھرنے اور چڑیا گھر کی سیر کے شوق میں اندرونی شہر کے گھروں کے بچّے آئے دن راستہ بھول کر رات گئے کو گھر لوٹا کرتے تھے اور مائیں اپنے بچوں کو ٹھنڈی اور کیلیاں والی سڑک سے ڈرایا کرتی تھیں کہ

وہاں انگریز بچوں کو اٹھا کر لے جاتے ہیں۔

ان دنوں انارکلی بازار کے قصّے بڑے عام تھے۔اندرونی شہر کے بازاروں کے مقابلے میں انارکلی بے حد پُرکشش بازار تھا۔ جوان ہورہے بچّے شاہ عالم بازار سے نکل کر شیتلا مندر کے سامنے سے ہوتے ہوئے اندرونی لاہور کے باہر انارکلی میں آجاتے تھے اور کوٹ پتلون والے مردوں اور بغیر بُرقعے کے نظر آنے والی عورتوں کو بہت حیرت سے دیکھا کرتے تھے کیونکہ اندرونی شہر میں ابھی تک لاہوریئے کالی کنّی والی دھوتی، ڈھاکہ کی ململ کے کُرتے، چابی مارکہ لٹھے کے پاجامے اور شلواریں پہنے تھے۔ کندھوں پر پرنے رکھتے تھے۔ بوڑھی سے بوڑھی عورتیں سفید بُرقعہ پہنتی تھیں اور کچھ کالے تُرکی طرز کے بُرقعے بھی اونچے گھروں میں مقبول تھے۔

انارکلی اور مال روڈ کے بارے میں قصّے شائع ہوتے رہتے تھے جنہیں کان پر ہاتھ رکھ کر گانے والے ہر چوک چوراہے پر فروخت کرتے تھے۔ ان قصّوں میں بال کٹوا کر انگریزی پڑھنے والی لڑکیوں کو نشانہ بنایا جاتا تھا ــــ

ہُن میں انگریزی پڑھ گئی آں
تے انار کلی وچ وڑ گئی آں

اسطرح کے بے شمار قصّے کشمیری بازار میں شائع ہوتے تھے۔ کچھ قصّے فروخت کرنے والے ہاتھوں میں لوہے کے کڑے پہنتے تھے اور لکڑی کے ڈنڈے سے کڑوں کو بجا کر رِدم حاصل کرتے تھے۔

اندرونی شہر میں عورتوں اور لڑکیوں پر پردے کی سخت پابندی تھی۔ کاریگروں، ہنرمندوں اور محنت کش گھرانے کی عورتیں اور لڑکیاں برقعوں سے آزاد تھیں لیکن دوپٹے سے سر ضرور ڈھانپ کر رکھتی تھیں۔ ترکھانوں، دھوبیوں، ماشکیوں، رنگ ریزوں، گوجروں، راج مزدوروں، درزیوں، چھابڑی فروشوں، ریڑھی والوں، کوچوانوں اور چھوٹے موٹے کام کرنے والوں کے گھروں میں بُرقعہ داخل ہی نہیں ہوسکا تھا۔ اس سے اوپر کے طبقوں میں سفید ٹوپی والے بُرقعے کا عام رواج تھا۔ ہندو اور سِکھ عورتیں پردہ نہیں کرتی تھیں۔ مسلمان عورت کی صاف پہچان یہی بُرقعہ تھی لیکن ہندو لڑکیاں اور سِکھ عورتیں ہمیشہ سر کو دوپٹے سے ڈھانپ کر رکھتی تھیں۔ بُرقعہ ہو یا گھونگھٹ، اس زمانے میں پردہ عورت کی حیا اور شرم سمجھا جاتا تھا۔

لاہور کی کوکھ سے جنمے فنکار

لاہور نے فنکار پیدا کئے ہیں۔ موسیقی کے شاہسوار پنجاب کو لاہور نے دیئے ہیں۔
لاہور نے دی ہے ایک کلچرل اور تہذیب کی وراثت ——— !

وقت کی پرواز کے ساتھ بہت کچھ نیا ہو رہا تھا۔ باہر نیا لاہور تعمیر ہو رہا تھا اور اس کا اثر اندرونی لاہور پر بھی پڑنے لگا تھا۔ شہر سے باہر کئی سینما گھر بن چکے تھے اور دیکھتے دیکھتے اندرونی شہر کی دوکانوں پر فلمی پوسٹر اور تصویریں دکھائی دینے لگی تھیں۔ فلمی اداکار پران، اوم پرکاش اور درگا موٹا اپنی فلمی زندگی شروع کر چکے تھے۔ یہ سب اندرونی شہر لاہور میں رہتے تھے اور شام کے وقت اکثر پانی والا تالاب کے چوک میں گھومتے نظر آتے تھے۔ دُرگا موٹا چونا منڈی میں رہتا تھا۔ اوم پرکاش گمٹی بازار کے کوچہ بلاقی شاہ میں رہتا تھا۔ پران محلہ ستّھاں میں رہتا تھا۔ کاردار، مرزا سردار علی اسمٰعیل اور کئی دوسرے منچلے قسمت آزمانے بمبئی پہنچ چکے تھے۔ کلکتہ اور بمبئی فلم نگری تھے اور لاہور کے محلّوں کے نوجوان جب بھی گھروں سے بھاگتے تھے تو انہیں شہروں کا رُخ کرتے تھے۔ اندرونی شہر میں فلموں کے خلاف بہت نفرت پائی جاتی تھی اور فلم دیکھنے کے شوقین لڑکوں کو بدچلن سمجھا جاتا تھا اور کہا جاتا تھا ———

مُنڈا گیا تماشیوں
تے کڑی گئی ہاسیوں

لیکن لاہور کی عورتوں میں فلم دیکھنے کی دلچسپی بڑھ رہی تھی۔ لاہور کے سنیما گھروں میں ہر بُدھ وار کو عورتوں کے لئے میٹنی شو ہوتے تھے۔ ڈائریکٹر محبوب کی فلم ''نظماں'' کی ہیروئن وینا اندرونی شہر کے محلّہ بنگلہ ایوب شاہ میں رہتی تھی۔

اندرونی شہر لاہور کے اندرونی حصّے میں جو محلّے آباد تھے ان سب سے کئی موسیقی سے دلچسپی رکھنے والے گھرانے آباد تھے۔ اس زمانے کے مشہور موسیقار طفیل اور تنویر نقوی یہاں سے، بمبئی چلے گئے تھے۔ مشہور موسیقی نواز بھائی ولیا اور بھائی لال اسی علاقے میں پیدا ہوئے تھے۔ استاد جھنڈے خاں کا تعلق بھی اسی علاقے سے تھا۔ کیدار شرما کی فلم چتر لیکھا کی موسیقی استاد جھنڈے خاں نے دی تھی۔ وہی بمبئی سے لاہور استاد کو لینے آیا کرتے تھے۔

موچی دروازہ، بھاٹی دروازہ کے اندر تحصیل بازار اور نواں بازار میں بھی فنکاروں کے کئی گھرانے تھے۔ استاد بڑے غلام علی خاں کا یونٹ موچی دروازے میں رہتا تھا۔ تکیہ سادھواں اور چوک گنج شہیداں میں موسیقی کی سالانہ محفلیں لگتی تھیں جن میں دُور دُور سے نامور فنکار شرکت کرتے تھے۔ استاد عاشق علی خاں اور ملکہ موسیقی روشن آرا بیگم جیسے مشہور موسیقار اور نغمہ نگار بھی اس میں برابر حصّہ لیتے تھے۔ چوک شہیداں کے اِرد گرد کی گلیوں اور مسجد چینیاں والی تک موسیقی کے دیوانوں کے میلے لگے ہوتے تھے۔ شاہی قلعہ حضوری باغ کی طرف جانے والی دیوار کے سانچے میں ایک مشہور تکیہ تھا جہاں استاد قادر بخش محفل لگایا کرتے تھے۔

ان دنوں اندرونی شہر لاہور میں موتی شاہ کا بھی بہت چرچا تھا۔ وہ ریلوے میں ملازم تھے، فقیروں جیسا لباس پہنتے تھے اور جہاں کوئی انہیں روک لیتا وہ اپنی بُلند گونج دار آواز میں ہیر وارث شاہ کا کلام گانے لگتے۔ موتی شاہ اتنی اونچی آواز میں گاتے تھے کہ اگر چوک پانی والا تالاب میں گا رہے ہوتے تو ان کی آواز دور دور تک سنائی دیتی اور سُننے والے لوگ جمع ہو جاتے۔

موتی شاہ گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل ڈاکٹر نظیر احمد کے بھائی تھے ـــــ واہ، کیا زمانہ تھا اور کیسے عظیم فنکار لاہور کی کوکھ سے جنمے تھے۔

وارث کے طلبگار

باباوارث شاہ کے عاشق دونوں پنجابوں میں موجود ہیں۔اس صوفی درویش کے کلام کو محبت کرنے والوں کی ہزاروں کہانیاں پنجابیوں کی زبان پر رہتی ہیں۔ یہ کہانیاں کلچرل تاریخ کی نشاندہی بھی کرتی ہیں اور ادب کے اتہاس کی بھی——!

''ڈولی چڑھد یا ماریاں ہیر کُوکاں''—— قصّہ ہیر وارث شاہ کا سب سے مقبول، مشہور اور دل کی گہرائی میں اُتر جانیوالا وہ مصرع ہے جسے سُن کر ہر کوئی عش عش کر اُٹھتا ہے۔ اندرونی شہر لاہور میں ہیر ہمیشہ سے زندہ رہی ہے۔ شہر کے چوک، حماموں اور کاریگروں کی دوکانوں پر ہیر پڑھنے والوں کے گرد اُس وقت ہجوم جمع ہو جاتا تھا جب کسی ہیر پڑھنے والے کی پاٹ دار آواز آس پاس کی گلیوں میں لہرانے لگتی تھی۔ لاہور کی فصیلوں کے اندر پیدا ہونے والے ہر بچّے کو اذان کے بعد ہیر کے بول سنائی دیتے تھے اور ہیر رانجھے کے قصّے سے کوئی بھی ناواقف نہیں رہتا تھا۔ کئی گھروں اور کاریگروں کی دوکانوں میں اصلی اور بڑی ہیر کا نُسخہ (کاپی) ضرور ہوتا تھا۔ ہر گلی، محلّے یا کوچے میں بہت سے ایسے عاشق بھی ہوتے تھے جنہیں ہیر وارث شاہ زبانی یاد تھی۔ ان پڑھ سے ان پڑھ لاہوریئے کو ہیر کے اکثر قصّے یاد ہوتے تھے۔

شادی بیاہ اور خوشی کے موقع پر عوامی فنکار بغیر سٹیج کے جس خوبصورتی سے ہیر وارث شاہ کا کھیل پیش کرتے تھے کہ دیکھنے سُننے والے بھی شریک ہو جاتے تھے۔ کسی محلّے کے چوک، کسی گھر کی بڑی بیٹھک یا دالان میں لوگ دریوں پر بیٹھ جاتے تھے۔ ان فنکاروں کی پوشاک بھی اپنی نہیں ہوتی تھی۔ میزبانوں یا آس پاس کے گھروں سے انہیں رنگین زنانہ کپڑے اور ریشمی مردانہ

کُرتے، لاچے اور رنگین دھوتیاں بھی مل جاتی تھیں۔ سُرخی پاوڈر اور دوسرا سامان وہ اپنے ساتھ لے آتے تھے۔ انہیں کسی گھر کا کمرہ دے دیا جاتا تھا جہاں وہ میک اپ کرتے۔ جب تک وہ سٹیج پر نہ آتے، دیکھنے والوں کی بے قراری بڑھتی جاتی۔ اوپر کھڑکیوں، روشندانوں، منڈیروں اور دروازوں میں لڑکیاں، عورتیں اور بچّے کھیل شروع ہونے کا انتظار کر رہے ہوتے۔

ہیر وارث شاہ کا ناٹک اندرونی شہر لاہور میں ایک بھرپور اور ہر دلعزیز تفریح تھی۔ یہ فنکار سوہنی مہیوال، پورن بھگت اور مرزا صاحبان کے کھیل بھی پیش کرتے تھے۔ بطور خاص گوجروں کی محفل میں مرزا صاحباں بہت شوق سے سُنا جاتا تھا لیکن جو گہرائی اور سوز ہیر رانجھا میں تھا اُسے بہت زیادہ پسند اور محسوس کیا جاتا تھا۔

کچھ لوگ اپنا نام رانجھا بھی رکھتے تھے۔ گوجروں میں یہ نام بہت پسندیدہ تھا۔ وہ اپنے کانوں میں چھوٹی چھوٹی بالیاں بھی پہنتے تھے لیکن کسی نے اپنی بہن بیٹی کا نام ہیر نہیں رکھا تھا۔ وارث شاہ کا عرس پرانے وقتوں میں بھی منایا جاتا تھا۔ اس دن لاہور کے لوگ ٹولیوں کی مشکل میں جنڈیالہ شیر خاں جاتے تھے۔ لاہور سے شیخوپورہ تک سڑک تھی لیکن آگے جنڈیالہ شیر خاں تک سڑک کا نام ونشان تک نہ تھا۔ گاؤں میں وارث شاہ کا مزار ایک ڈھیری کی صورت میں تھا جس کے آس پاس اونچی نیچی زمین، ٹوبے، ٹبّے اور درختوں کے جھنڈ تھے۔ پینے کے پانی کا کوئی انتظام نہ تھا۔ میلے کی رونق جیسی کوئی دوکانیں نہیں ہوتی تھیں۔ ایسی تمام سہولیات نہیں ہونے کے باوجود مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے بہت بڑی تعداد میں لاہور کے لوگ وہاں پہنچتے اور ایک دن اور رات وہاں گذاتے۔ مقامی لوگ اس میں شامل نہیں ہوتے تھے لیکن یہ لاہور والوں کی وارث شاہ کے لئے عقیدت تھی کہ وہ ساون کے مہینے میں اتنی مشکلات برداشت کر کے وہاں پہنچتے تھے۔ یہ کہنا کہ وارث شاہ اور اس کی ہیر کو صرف لاہوریوں نے ہی زندہ رکھا ہے، پوری طرح سے صحیح نہ بھی ہو، کافی حد تک صحیح کہا جاسکتا ہے۔ ساتھ ہی یہ وارث شاہ کا ہی کمال تھا کہ اس کی تحریر ''ہیر رانجھا'' کی بدولت ہی اُس وقت کے لاہور کی پنجابی زبان کو سنبھال گیا اور کلام کی طاقت سے پنجابی زبان کو صوفیوں جیسا ہی درویشی رُتبہ حاصل ہوا۔ لاہوریوں کا پنجابی لہجہ بہت دلکش ہوتا تھا اور یہ وارث شاہ کی ہیر میں محسوس کیا جاسکتا ہے۔

پہلے اس جگہ پر تھا کنواں

لاہور کی گلیوں میں گھومتے ہیں تو کئی جگہوں پر پیاس زیادہ محسوس ہوتی ہے۔ کسی شاعر کا شعر یاد آتا ہے—— کچھ ایسی کیفیت کے ساتھ۔۔۔!

ساون کی رُت اور لاہور — دونوں سنگیت کے سُروں جیسے میٹھے لگتے ہیں۔ وارث شاہ کا عُرس ہمیشہ ساون رُت میں منایا جاتا ہے۔ جیٹھ ہاڑھ کے مہینے بھی سخت گرم ہوتے ہیں۔ اُن دنوں گھروں میں بجلی کے پنکھے نہیں ہوتے تھے۔ دوپہر اور جھلستی ہوئی راتیں اندرونی لاہور میں ازحد تکلیف دہ ہوتی تھیں۔ لوگ رات کو بہت دیر تک گلی محلّوں اور چوراہوں میں رہتے تھے اور ان کا وقت کسی نہ کسی ہیر پڑھنے والے کی موجودگی میں اچھی طرح سے گذر جاتا تھا۔ ساون کے انتظار کے حوالے سے انہیں وارث شاہ کے عُرس کی تاریخ بھی یاد رہتی تھی۔ جیٹھ ہاڑھ کی گرمی، تپش اور لُو سے جب گلیاں اور بازار تندور بن جاتے تھے، اس سب کے باوجود لاہوریئے اپنی زندہ دلی کا ثبوت دیئے بغیر نہیں رہتے تھے۔

جلتی ہوئی دوپہروں میں وہ آموں کے ٹوکرے لے کر باغوں، جہانگیر کے مقبرے اور دریا کے کنارے پہنچ جاتے تھے۔ یہ ان کی سیر ہوتی تھی لیکن وہ اکیلے ہی سیر نہیں کرتے تھے۔ وہ ٹولیوں میں، پوری تام جھام کے ساتھ، کھانے پینے کا سامان، دریاں، چمٹے، ڈھولک اور لنگوٹیوں کے ساتھ جاتے تھے۔ عورتیں اپنی الگ محفل جماتی تھیں۔ درختوں پر رسّوں کے جھولے ڈالتے جاتے تھے۔ اس زمانے میں راوی دریا میں ایک بڑا بیڑا چلا کرتا تھا۔ سبھی اسی بیڑے میں بیٹھ کر دریا آر پار کیا کرتے تھے۔ پانی میں میٹھی چوری ڈالتے تھے اور یہ کام کسی منّت کو پورا کرنے پر کیا جاتا تھا۔

جیٹھ ہاڑھ کے مہینوں میں انہی دنوں جہانگیر کے مقبرے پر ''پار کا میلہ'' لگتا تھا۔ اس میلے میں لاہوریئے پورا ایک دن اور ایک رات گذارتے تھے۔ لوگ وہاں اپنے الگ الگ ڈیرے لگاتے تھے۔ دیگیں پکتی تھیں۔ تاشیں کھیلی جاتی تھیں۔ میلے میں زبردست جُوا کھیلا جاتا تھا۔ شاہدرہ پولیس چھاپے مارتی تھی۔ ''پار کے میلے'' کا حقیقی مقصد جیٹھ ہاڑھ کی گرمی کا توڑ کرنا ہوتا تھا۔ لاہوریئے رات تک جہانگیر کے مقبرے میں کھلے آسمان کے نیچے گذارتے تھے۔ چاروں طرف گیسوں کی روشنی جگ مگ کررہی ہوتی تھی۔ ''ہیر وارث شاہ'' — ''سوہنی مہیوال'' — اور ''مرزا صاحباں'' گائی جاتی۔ صبح ہوتے ہی ناشتے کے لئے حلوہ پوری تیار کرنے کی بھٹیاں جلائی جاتیں۔ کچھ لوگ کوئیں پر چلے جاتے۔ اس میلے میں عورتیں شریک نہیں ہوتی تھیں۔ بھانگ تفریح کے لئے بطور شوق پی جاتی تھی۔ کئی منچلے شراب بھی پیتے تھے اور اکثر لڑائیاں بھی ہوتی تھیں جو محض عارضی ہوتی تھیں اور جلد ہی ختم بھی ہو جاتی تھیں۔

جیٹھ ہاڑھ کی اس گرمی میں سکھوں کا 'جوڑ میلہ' بھی پرانے شہر لاہور کی کلچرل سرگرمیوں کا اہم حِصّہ تھا۔ لاہوریوں کے ''پار کے میلے'' اور سکھوں کے ''جوڑ میلے'' سے پہلے اندرونی شہر میں ہندو لوگ دیوی ''بھدر کالی کا میلہ'' مناتے تھے۔ یہ تینوں میلے گرمیوں میں منائے جاتے تھے۔ درحقیقت یہ تمام میلے جیٹھ ہاڑھ کی شدید گرمی کا مقابلہ کرنے کی ایک ترکیب تھے اور لاہوریوں کا خوشی حاصل کرنے کا ایک طریقہ بھی تھا۔

گرمی کے موسم میں جب بھی کبھی سیلاب آتا تو لاہور کے لوگ راوی دریا کے پُل پر پہنچ جاتے تھے۔ وہ طوفانی پانی کا نظارہ دیکھتے اور کئی منچلے سیلاب میں بھی کشتیوں کی سیر کرتے تھے۔ اس زمانے میں لاہور میں برف کے ایک دو کارخانے ہی تھے۔ لوگ ٹھنڈے پانی کے لئے اپنے اپنے محلّے، گلی کے مندر شوالے اور مسجد کے کُنویں پر جاتے تھے۔ نل والے گھر بہت کم تھے لیکن کوئی گلی محلّہ ایسا نہیں تھا جہاں ایک سے زیادہ کُنویں نہ ہوں۔ کئی گھروں کے اپنے کُنویں بھی ہوتے تھے جہاں سے محلّے کی لڑکیاں اور عورتیں مٹکے اور گھڑے اٹھا کر پانی لے جاتی تھیں۔ لاہور میں کئی کُنویں اپنے ٹھنڈے پانی کے لئے بہت مشہور تھے۔ ان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے کنویں الگ الگ تھے۔ چھوٹے کنویں ''کھوئی'' اور بڑے کنویں ''کھوہ'' کہلاتے تھے۔ سعید مٹھاں بازار میں ''ماموں بھانجے کا کنواں''، موتی بازار کی طرف جانے والی حویلی قابلی مل کی گلی کا کنواں اور

بابو اسحاق کے گھر کا کنواں بہت ٹھنڈے اور میٹھے پانیوں کے لئے پورے لاہور میں مشہور تھے۔ اندرونی شہر میں پیدا ہونے والے بچّوں میں کم سے کم ایک بار ''کن پیڑے'' ضرور نکلتے تھے جن سے حلق پھول جاتا تھا اور درد ہوتا تھا۔ کہتے ہیں کہ ماموں بھانجے کے کنویں کی مٹّی کے لیپ سے یہ بیماری دور ہو جاتی تھی۔ ان کنوؤں کے میٹھے پانی سے ہی تب کے لاہور کی زندگی بہت میٹھی تھی۔
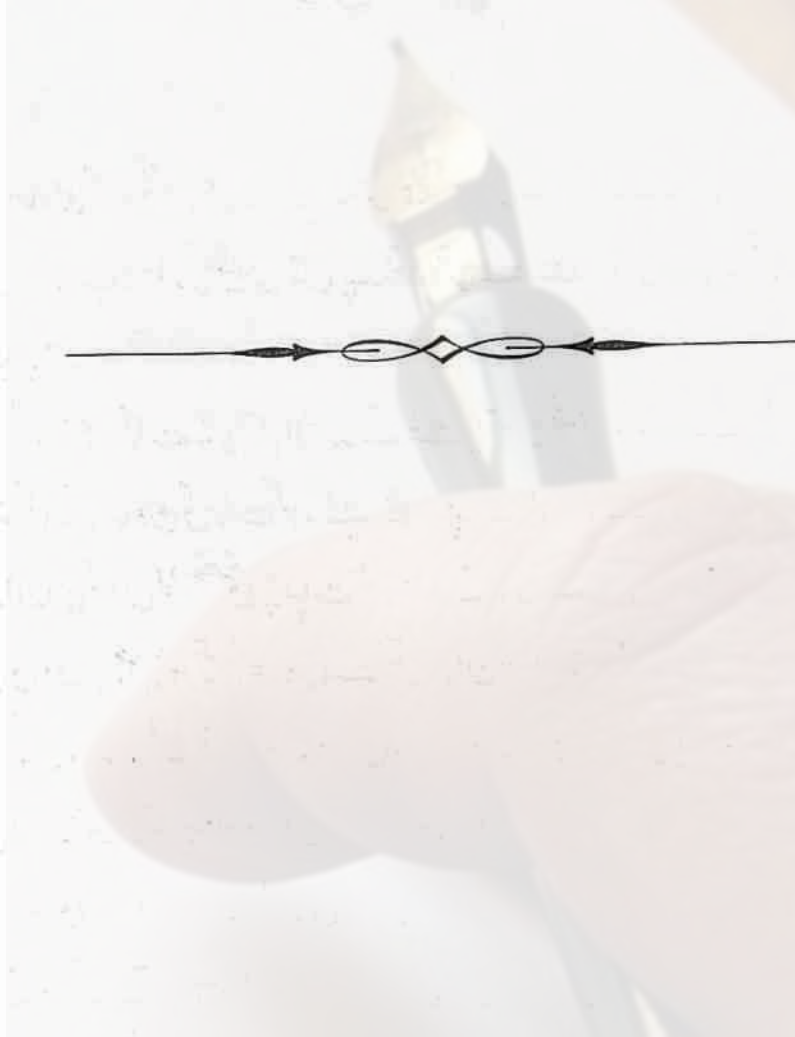
سُوکھی بھیگتی زندگی

ساون جھما جھم برس رہا ہے۔ اس کا برسنا دل میں پرانے دنوں کی یاد تازہ کر رہا ہے—
ان دنوں کی یاد جب لاہور کی گلیوں میں پہلے تو بارش کے لئے دعائیں کی جاتیں اور بعد میں بارش کا مزہ اٹھایا جاتا۔

گذشتہ صفحات میں ہم لاہور کے میٹھے پانیوں جیسی، گذرے وقت کے مُشترکہ میٹھے لاہور کی زندگی کے ساون کی بات کر رہے تھے۔ پرانے لاہور کے محلّوں میں کئی گلیاں چھتی ہوئی ہوتی تھیں اور ان گلیوں کو ''چھتّی چھپات'' کہتے تھے۔ چھت والی ہر گلی میں ایک چھوٹا کنواں ہوتا تھا اور گرمی کی دوپہر میں عورتیں گھروں سے نکل کر ان گلیوں میں آپس میں مل بیٹھتی تھیں۔ وہ گیت بھی گا لیتی تھیں، گپ شپ بھی ہو جاتی تھی، گھر باہر کے کئی مسائل پر آپس میں بات چیت بھی ہو جاتی تھی اور ساتھ ساتھ سینا پرونا بھی جاری رہتا تھا۔

موچی دروازے کے ''لال کنواں'' اور ''ٹھنڈا کنواں'' لاہور کے مشہور کرداروں کی طرح جانے جاتے تھے۔ جیٹھ اور ہاڑھ مہینے کی گرمی میں ان کنوؤں پر خوب گہما گہمی رہتی تھی۔ زیادہ تر گھروں میں بجلی اور پانی کے نل نہیں تھے اس لئے لوگ پانی کے لئے ان پر ہی منحصر تھے۔ لوگ چھتوں پر سوتے تھے۔ سونے سے پہلے چھتوں پر پانی کا چھڑکاؤ کیا جاتا تھا۔ کھجوری پنکھے اور اور پانی سے بھرے ہوئے مٹّی کے پُختہ گھڑے پاس رکھتے تھے۔ صبح ہوتی تھی اور سورج نکلنے کے ساتھ ہی سورج آگ برسانے لگتا تھا۔ شربت اور دودھ دہی کی دوکانوں پر رش بڑھ جاتا تھا۔ دوپہر سنسان ہوتی تھی۔ شام ہونے سے پہلے لوگ حضوری باغ، منٹو پارک، بادامی باغ، اقبال پارک اور شہر کی فصیل کے آس پاس پھیلے ہوئے بہت سے دوسرے باغوں میں پہنچ جاتے تھے۔

گرمی کے موسم میں ڈھاکے کی ململ اور وائل کے کُرتے، کالی کناری والی دھوتیاں اور کندھے پر رکھنے والے پرنے (انگوچھے) اس وقت لاہوریوں کا خاص لباس ہوتے تھے۔ گلی محلّوں میں لسّی کی دوکانیں عام تھیں۔ باداموں کی سردی بھی دونوں وقت پی جاتی تھی۔ جب آسمان پر دُور تک کوئی بادل دکھائی نہ دیتا اور لوگوں میں بارش کی اُمید بڑھ جاتی تو اندرونی شہر کی گلیوں میں روڑے کی آواز سنائی دینے لگتی——

''روڑے دا منہ کالا، روڑا مینہہ منگدا''

روڑا اس وقت گلیوں میں آتا جب گلیوں کے فرش تپ جاتے، مائیں بچوں کو گھروں سے باہر جانے سے روک دیتیں تو روڑا آجاتا۔ روڑا کوئی بھی لڑکا بن جاتا۔ اس کے چہرے پر سیاہی ملی ہوتی اور اس کے پیچھے دوسرے بچے دوڑتے ہوئے مل کر آواز لگانے لگتے—روڑے دا منہ کالا، روڑا مینہہ منگدا''—— گلیوں اور محلّوں کے تندوروں کی سیاہی میں ہاتھ بھر کر سارے کے سارے بچّے راستے میں ملنے والے بچّوں کے چہروں پر سیاہی مل دیتے اور روڑے کا شور مکانوں کے اندر داخل ہو جاتا۔ لڑکیاں اپنے مکان کی چھت پر گڈا گڈّی بنا کر جلاتیں۔ اس سے دُھواں اٹھتا تو لڑکیاں گاتیں——

ربا ربا مینہہ وسا، ساڈی کوٹھی دانے پا
اسیں گڈّی گڈا ساڑیا، دس ربا کالیا

اس کے ساتھ ہی بوڑھے مردوں و عورتوں پر پانی پھینکا جاتا ایسا مشہور تھا کہ جس پر پانی پھینکا جاتا ہے اور پانی میں بھیگنے سے جتنا کوئی بوڑھا گرم ہوتا ہے، اتنا ہی زور کا بادل آتا ہے اور خوب بارش ہوتی ہے۔ عورتیں عورتوں پر پانی گراتیں اور گلیوں بازاروں میں مرد اور بچّے راہ چلتے لوگوں پر پانی گراتے۔ تالیاں بجتیں، شور بلند ہوتا اور دور دور تک ہر گلی محلّے میں یہ سلسلہ پھیل جاتا۔ پھر اچانک بادل آجاتے۔ جیٹھ مہینے کے آخری پکھواڑے میں ساون کی جھڑی لگ جاتی اور ساون شروع ہو جاتا۔

اُس وقت کے لاہور کی زندگی کے ایسے کھیل تماشے ساون سے پہلے کی شدید گرمی کا مقابلہ کرنے یا اس طرف سے دھیان کم کرنے کے محض طریقے تھے لیکن کھیل تماشوں سے بھری لاہور کی زندگی کلچر کا حصّہ بن کر اسے نئے معنی اور نیا چہرہ دیتی تھی۔

ساون کے جُھولے

لاہور شہر کا ماضی ہندوستانی اور پاکستانی پنجاب کی مشترکہ وراثت کی نشانی ہے۔ساون کے مہینے میں یہاں زندگی کے رنگ ہی بدل جاتے۔ باغوں میں پینگیں چڑھائی جاتیں اور گلی گلی میں ساون کے گیت سُنائی دینے لگتے——!

مشترکہ پنجاب کے خوابوں کے شہر لاہور کا ماضی اپنی کہانی کہتے ساون رُت کی پھوہاروں میں گُم ہو جاتا ہے۔ساون رِم جھم ہو کر برسنے لگتا تو گھر کی عورتیں گُڑ کے گلگلے (میٹھے پکوڑے) اور پُوڑا پکاتیں۔سبزی یا سالن کے طور پر خشخاص پکتی اور لوگ گھروں سے باہر نکل آتے۔ساون کی رُت آتے ہی زندگی کا انداز بدل جاتا۔باغوں میں پینگیں (جھولے) چڑھائی جاتیں۔دریا،مقبرے اور باغوں کی طرف جانے والوں کی قطاریں لگ جاتیں۔قیمے کی روٹیاں، دودھ میں گندھے میٹھے آٹے کے پراٹھے،لذیذ پکوان اور آموں کے ٹوکرے لے کر لوگ ساون منانے گھروں سے باہر آجاتے۔

جیٹھ — ہاڑھ کی گرمی کا زور ٹوٹ جاتا اور ساون کے بادلوں کے گیت سنائی دینے لگتے بارش برستی تو بچے،عورتیں اور مرد بارش میں خوب نہاتے تھے۔ساون کی بارشوں سے پِت، پھوڑے پھنسی اور آنکھوں کی کئی بیماریاں دُور ہو جاتی تھیں۔استاد برکت علی خاں کا گایا ہوا ساون کا یہ گیت گلی گلی سُنائی دیتا—

ساون کے پڑے جھولے
تم ہمیں بھول گئے
ہم تم کو نہیں بھولے

جن گھروں میں کسی کے پاس ''ہِز ماسٹرز وائیس'' کا گراموفون ہوتا وہ کے ایل۔سہگل کا گایا ہوا یہ گانا۔۔۔ ''ساون آیا تم نہیں آئے''۔۔۔ ضرور سُنتا۔ساون کے مہینے میں لوگ میاں میر کی نہر پر بھی جاتے تھے۔ان دنوں یہ نہر بہت صاف سُتھری اور خوبصورت ہوتی تھی اور لاہوریوں کی ایک بڑی سیر گاہ بھی یہی تھی۔اس نہر کی ایک چھوٹی سی شاخ اندرونی شہر کے گرد فصیل کے باغوں کے درمیان سے گذرتی تھی۔چھوٹے بچّے جو میاں میر کی نہر یا دریا پر نہیں جا سکتے تھے، وہ اس چھوٹی نہر پر آ جاتے تھے۔اس کے اردگرد چنار، آم اور جامن کے درخت ہوتے تھے۔یہ نہر اکبری گیٹ کے باغ سے شروع ہوتی تھی اور موری، شاہ عالمی، لوہاری، بھاٹی اور ٹکسالی دروازے کے باغ کے اندر سے ہوتی ہوئی شاید بڈھے دریا میں جا گرتی تھی یا آس پاس کے کھیتوں میں سما جاتی تھی۔ساون میں کبھی کبھی اس کے پانی میں چھوٹی چھوٹی مچھلیاں بھی آ جاتی تھیں۔

ساون کبھی کبھی اتنا لگتا کہ لوگوں کا گھروں سے باہر نکلنا محال ہو جاتا۔گلیاں اور بازار پانی سے بھر جاتے۔آسمان پر ہر وقت کالی گھٹائیں چھائی رہتیں اور کچّے مکانوں کی چھتیں ٹپکنے لگتیں۔اندرونی شہر میں پکّے مکان بہت کم تھے۔کچّے مکان ایسے ساون میں گر بھی جاتے تھے۔ لوگ ساون کے خیر خیریت سے گذر جانے کے لئے دعائیں مانگتے۔

ساون تو ساون ہی تھا۔ساون کے دنوں کا مستی کا رنگ اپنا ہی تھا۔کھڑکی میں کھڑے ہو کر ساون کی رِم جھم کو دیکھنا، چھت پر کھڑے ہو کر ساون کی پھوار میں گُم ہو جانا، کوئیل کی کُو کُو کی گونج سننا، ساون کے گیتوں کے دُھنوں پر مدمست ہو جانا، آسمان پر ست رنگی دھنک کا پھیلنا سِکڑنا اور اس کے رنگوں کی پتنگ کے ساتھ ساتھ جذبات کا رنگین ہو جانا۔۔۔ یہ سب صرف جادو جگاتا ساون ہی تھا۔ساون آج بھی آتا ہے۔لاہور یئے لاہور میں آج بھی بستے ہیں لیکن اس ساون جیسی رنگینی اور دِلکشی آج کے ساون میں کہاں!

لاہور میں بھاگ بھری

ہیر رانجھا کے قصے نے لاہور کے جوان دلوں کو زبان دی تھی۔ اسی کے سہارے وہ اپنے دِل کی بات کر لیتے تھے۔ لڑکیاں ہیر کے دل میں دھڑکتی تھیں ——— !

''وارث شاہ نُوں مار نہ بھاگ بھریئے ——'' ان الفاظ کا خالق جنڈیالہ شیر خاں میں منوں مٹّی کے نیچے دفن ہے لیکن اس کی ہیر لاہور شہر کے باسیوں کے دلوں میں بستی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے ہیر رانجھے کا قِصّہ لاہور میں پیدا ہونے، پروان چڑھنے والے لوگوں کے اندر ان کی کھوئی ہوئی ذات سے ملا دیتا ہے۔ اندرونی شہر لاہور کے سماجی اور مالی حالات کچھ اس طرح کے تھے کہ ہر مرد، عورت، نوجوان، بوڑھا، لڑکا اور لڑکی اپنی ذات اور خارجی دُنیا کے درمیان ایک فرق کی سُولی پر لٹکا ہوا تھا۔ محرومیاں، شرم کے نام پر پابندیاں، صدیوں پرانی غلامی، سماجی اور مالی مجبوریاں، مذہبی یقین، وہم، انگریز کی نئی طرز کی حکومت، مشترکہ خاندان کے نظام کی توڑ پھوڑ، ذات پات، طبقہ برادری وغیرہ بے شمار ایسے مسائل تھے جن کی وجہ سے ہر بشر اپنے آپ سے جُدا ہو چکا تھا اور اُسے اپنی ہی پہچان کے لئے کوئی راہنمائی حاصل نہیں تھی۔ شاید اسی لئے لاہور میں ہیر رانجھا سب سے زیادہ مقبول کلچرل رسم بن گئی تھی۔ اس کے ذریعے لوگوں کا ''کتھارسس'' ہو جاتا تھا۔ کہیں کہیں کسی کے اندر سے کوئی باغی بھی باہر نکل آتا تھا۔ رانجھا اور ہیر ان کے محبوب تھے، قیدوں قاضی دشمن تھے، جو بندے اور بندے کے درمیان پیار کی جڑیں کاٹتے تھے۔ ہیر اور رانجھے کے دونوں کردار لوگوں کی ذات کی رہائی کی علامت تھے ——— دبی دبی خواہشات اور سپنوں کا اظہار تھے۔ پھر وارث شاہ کا دِل نشین، پُر اثر شاعرانہ اظہار اور تماشہ کرنے والے فنکاروں کا فنکارانہ اگاڈ لوگوں کے لئے بیداری کے لمحوں سے کم نہیں تھا۔

اُن دنوں جوان لڑکیاں لڑکے آپس میں کھلے عام نہیں مِل سکتے تھے۔لڑکیوں کو سات پردوں کے اندر رکھنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ چھت یا دروازے کھڑکیوں میں کھڑی ہونے والی لڑکیوں کو سزا بھگتنی پڑتی تھی اور خوش پوش نوجوانوں کو عام تانک جھانک کے لئے ڈانٹا ٹوکا جاتا تھا۔ان سماجی حالات اور انسان کی ذات پر جبر کے ماحول میں ہیر رانجھا سب کا محبوب قصّہ تھا۔ نوجوان لڑکیاں ہیر اور رانجھے کی بے بسی پر آنسو بہانے لگتی تھیں۔اندرونی شہر میں ہر بُرے آدمی کا نام قیدو تھا۔محبت کرنا ایک خطرناک جُرم سمجھا جاتا تھا اور اس جُرم کی وجہ ہیر رانجھے کے قصّے کو قرار دیا جاتا تھا۔عورتیں اور لڑکیاں ہیر رانجھے کا تماشہ بہت شوق سے دیکھتی تھیں۔کسی خاص سین کا اثر اور ردِ عمل ان کے چہروں کو شرمانے کی وجہ بنتے تھے اور نتیجے کے طور پر کنوؤں اور نل سے پانی بھرتے ہوئے لڑکیوں کے ایک ساتھ نہانے کے وقت اُن کی آپس میں چھیڑ چھاڑ میں ایک عجیب سی شوخی نظر آتی تھی۔وہ بیباک ایک دوسرے سے لپٹ جاتی تھیں،ایک دوسرے کا منہ چوم لیتی تھیں اور سہیلیاں آپس میں عاشق معشوق بن جاتی تھیں۔یوں مکانوں کے بڑے آنگن میں ہیر رانجھے کا تماشہ دیکھنے کے دوران یہ لڑکیاں خود ہی ہیر رانجھا بن جاتی تھیں۔

لوگ محبت تب بھی کرتے تھے اور یہ دیوانے مقبروں جہانگیروں کو ''لو سپاٹ'' (Love Spot) بناتے تھے۔ چھُپ چھُپ کر پیار کرنے والے رات کو گلی کے اندھیروں میں ملتے تھے اور پتہ چلنے پر اس کا سارا الزام ہیر رانجھے کے تماشے پر لگایا جاتا تھا۔مخالفت اور پابندیوں کے باوجود لاہور میں یہ سب سے زیادہ مقبول کلچرل شو ہوتا تھا۔خاندانی اکائیوں کی لڑکیوں کو جنسی جبر سہنا پڑتا تھا۔اکیلی رہنے والی ادھیڑ عمر کی عورتوں کے ذریعے جوان ہو رہے لڑکوں کو اپنے کمروں میں بند کر لینے کے واقعات بھی ہوتے تھے۔اور یہ سب تب کے لاہور کی زندگی کی مکمّل تباہی کا نقشہ بن جاتے تھے۔ایسے میں ہیر وارث شاہ ایک ایسی کلچرل وراثت تھی جو پرانے لاہور کی تباہ حال سماجی زندگی کے اندھیروں میں روشن چراغ کا کام دے رہی تھی۔ حقیقت ہے کہ ہیر وارث شاہ، ہیر رانجھے کے تماشے اور ہیر گانے والوں کے حوالے سے انسان کے اندر ایک خوبصورت احساس پیدا ہوتا تھا اور زندگی کی تلخیوں میں اندرونی راحت کا احساس میسّر ہوتا تھا۔

آ اب لوٹ چلیں

لاہور قدیم عالیشان عمارتوں کے ساتھ ساتھ احساسات کا خزانہ لئے بیٹھے بزرگوں سے بھرا پڑا ہے۔ بہت لوگوں کے پاس کلچرل اتہاس کا ماضی ہے۔ بہت سارے وہ بھی ہیں جو ماضی کا درد اپنے سینوں میں چھپائے بیٹھے ہیں——!

پُرانے وقتوں کا شاہی محلّہ اور بعد کے وقت کی ہیرا منڈی کی کہانی لاہور کی تاریخ کا ایک اہم ترین حصّہ ہے۔ اسے لاہور کا "بازارِ حُسن" بھی کہتے ہیں۔ یہ بادشاہی مسجد کے بائیں اور اسکے آسمان کو چھوتے میناروں کے سائے تلے صدیوں سے آباد ہے۔ لاہور شہر کے دل میں قائم شاہی محلّہ کب آباد ہوا' کس نے آباد کیا' اس بارے وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن حُسن کے اس بازار نے لامثال حُسن دیکھا ہے اور اس حُسن کے لاتعداد پرستار دیکھے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اس بازار کا وجود مُغل عہد میں ہوا اور یہ آج تک قائم ہے۔

کہتے ہیں کہ پُرانے وقتوں میں اس بازار میں ایک سُرنگ تھی جو شاہی محلّے سے شاہی قلعے تک جاتی تھی۔ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس سُرنگ کے راستے سے ہو کر کتنی جوانیاں شاہی مردانگی کی بانہوں میں مچلی ہوں گی۔

لاہور ہمیشہ سے فوجی گذرگاہ رہا ہے۔ جب غیر مُلکی حملہ آور ہندوستان میں داخل ہوتے تو ان کا پہلا پڑاؤ لاہور ہوتا تھا۔ قول ہے کہ جب کوئی شہر فوج کی زد میں ہو تو اس شہر کی دولت ہی نہیں عصمت بھی لُٹتی ہے۔ لاہور بھی حملہ آور فوجیوں کی ہوس کے نرغے میں آتا رہا اور ہیرا منڈی پھلتی پھُولتی رہی۔

اقوامِ متحدہ کی ایک کلچرل کمیٹی کی رپورٹ کے مطابق لاہور کا شاہی محلّہ یعنی ہیرا منڈی

بھارت پاک برّصغیر (Sub-Continent) میں سب سے زیادہ مشہور و مقبول ہے۔ شاہی محلے کے مرکزی دروازے کو ٹکسالی دروازے کے نام سے پُکارا جاتا ہے۔ اس دروازے میں داخل ہوتے ہی کچھ ہی قدموں پر مُغلیہ دور میں بنی ایک مسجد ہے۔ اس مسجد کی تعمیر کے بارے میں بھی کئی کہانیاں ہیں اور ان میں سے ایک کا تعلق کسی طوائف سے کہا جاتا ہے۔ اس مسجد سے چند ہی قدم آگے طوائفوں کے کوٹھے شروع ہو جاتے ہیں۔ دائیں ہاتھ کی طرف ایک تنگ گلی ہے جو بل کھاتی ہوئی ایک اور مسجد تک جاتی ہے۔ یہ مسجد طوائفوں کے کوٹھوں کے درمیان گھری ہوئی ہے۔ اس مسجد کے ساتھ حضرت قاسم شاہ کا مزار ہے۔ اس بازار کے ایک حصّے کو ''ٹبّی'' کہا جاتا ہے۔

قدیم زمانے میں لاہور شہر تین ٹیلوں پر قائم تھا جس میں سے ایک ٹیلہ اسی جگہ ہوتا تھا۔ اونچائی میں کچھ کم والی جگہ کو ''ٹبّی'' کہتے ہیں۔ اسی نسبت سے اس جگہ کا نام ''ٹِبّا'' مشہور ہوا۔ شورش کاشمیری نے اس بازار میں سعید اولاد شاہ (حضرت قاسم شاہ کی پوتی کے بیٹے) کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ اس ٹیلے کو حضرت قاسم نے عبادت کے لئے منتخب کیا تھا لیکن بعد میں یہاں خانہ بدوش آ کر آباد ہو گئے جن کی عورتوں نے دھندہ شروع کیا اور آہستہ آہستہ یہ جسم فروشی کا اڈہ بن گیا۔ حضرت قاسم شاہ کے مزار پر ہر سال عُرس کے موقع پر پشتینی طوائفیں حاضری بھرتی ہیں اور مُجرا کرتی ہیں۔ حضرت قاسم شاہ کے خاندان سے حضرت علاّمہ میر حسن سیالکوٹی تھے اور وہ علاّمہ اقبال کے استاد تھے۔ علامہ میر حسن کے دو بیٹے تکی شاہ اور نکی شاہ تھے۔ نکی شاہ علامہ اقبال کے گہرے دوستوں میں تھے۔ نکی شاہ کے نام اپنے ایک خط میں علاّمہ اقبال نے امیر نام کی ایک عورت کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ امیر نام کی یہ عورت اس وقت کی ایک نامور طوائف تھی۔

ٹبّی سے باہر بازار شیخو پوریاں ہے اور ٹبّی سے ہیرا منڈی کے چوک پر طوائفوں کے مکان اور دوکانیں ہیں جن کی تعداد اڑھائی سو کے قریب ہے اور پانچ سو کے قریب عورتیں اپنا کاروبار کرتی ہیں۔ ہیرا منڈی کے ان کوٹھوں میں آج شاید ہی کوئی خاندانی طوائف موجود ہو۔ کئی مرکھپ گئیں اور کئی کی اولاد اس بازار سے اٹھ کر پورے لاہور میں پھیل گئی ہے۔

حاصل نہ ہو سکے گا سکون اس جہان میں
اچھا ہے اپنے گھر کی طرف لوٹ آیئے

لاہور میں سردی کی دستک

سردی کے موسم کی دستک کے ساتھ ہی لاہور والے بھی آہستہ آہستہ ٹھٹھرنے شروع ہوجائیں گے — لیکن پہلے کیسے اُترتی تھی سردی کی شام — آیئے دیکھیں اور محسوس کریں — !

ساون بھادوں میں جب بھی بارش ہو کر ختم ہوتی تھی تو لاہوریئے اپنے مکانوں کی گیلی چھتوں اور منڈیروں پر آجاتے تھے اور آسمان پر دھنک کی رنگین پینگ کے نظارے کیا کرتے تھے۔ ڈبّے ڈبیوں کی طرز پر بنے ہوئے اندرونی شہر لاہور کے بند مکانوں میں رہنے کے باوجود موسموں سے اُن کی یاری بڑی فنکارانہ تھی۔ لاہور شہر میں منائے جانے والے میلوں، سماجی اور مذہبی تیوہاروں کا تعلق آسمان، گرمی، سردی، ساون، بھادوں، پت جھڑ اور بہار سے بہت گہرا تھا۔

موسم بدلتے ہی لاہور شہر کی گلیوں کے منظر بدل جاتے تھے۔ ہولی کے تیوہار کے بعد جب مہینہ بھادوں بھی گذر جاتا اور آنے والے مہینوں اُسوّ و کارتک کی ہوائیں چلنے لگتیں تو لاہور کی گلیوں میں دسہرے کے تیوہار کی تیاریاں شروع ہوجاتیں۔ دسہرے کا تیوہار لاہور میں ہندو آبادی کا بہت اہم اور بڑا تیوہار تھا۔ یہ سردیوں کی آمد کا تیوہار تھا۔ ہندو لوگ سردی کی پیدائش کی رسم ادا کرتے تھے۔ وہ اپنی پگڑی یا ٹوپی میں برف کا ٹکڑا اور کوئی سبزی ایک دو دِن تک رکھتے تھے جس کا مطلب تھا کہ سردی کی پیدائش ہوگئی ہے۔

دسہرے سے قبل ہندو لوگ اپنے اپنے علاقوں کو خوب سجاتے تھے۔ تمام ہندو تنظیمیں اس موقع پر جلوس نکالتی تھیں — بالکل اسی طرح جیسے جشنِ عید منایا جاتا تھا۔ بیل گاڑیوں، چمکدار تانگوں اور بگھیوں میں پنڈت، مہنت، باعزّت اہم لوگ اور بھجن گانے والی ٹولیاں ہوتی تھیں۔

ہندو اسکولوں کے طالب علم بینڈ باجے کے ساتھ جلوس میں شریک ہوتے، جو شیتلا مندر سے شروع ہوتا تھا اور شاہ عالمی میں داخل ہوتا تھا۔ ان میں شری رام، سیتا اور لکشمن کے لباس اور گیٹ اپ میں ہندو نوجوان لڑکے شریک ہوتے تھے۔ وہ بگھیوں پر سوار ہوتے تھے، تیر کمان ان کے ہاتھوں میں ہوتے تھے اور جہاں جہاں سے وہ گذرتے تھے ان پر پیسوں، بتاشوں اور پھولوں کی بارش کی جاتی تھی۔ انہیں جھانکیاں کہتے تھے اور انہیں دیکھنے کے لئے بازار، کھڑکیاں، دروازے، چھت اور مکان ہندو عورتوں اور بچّوں سے بھرے ہوتے تھے۔ یہ جلوس صبح نو بجے کے قریب شروع ہوتا تھا، رینگ رینگ کر آگے بڑھتا تھا اور اس کا آخری پڑاؤ منٹو پارک ہوتا تھا جہاں شام کے وقت دسہرہ منایا جاتا تھا۔

دسہرہ منانے کے لئے جہاں دس پندرہ دن پہلے منٹو پارک (اب اقبال پارک) میں سج دھج شروع ہو جاتی تھی، وہاں رامائن کی کہانی پر اندرونی شہر کے کئی حِصّوں میں ناٹک کھیلے جاتے تھے اور انہیں رام لیلا کہا جاتا تھا۔ منٹو پارک میں دوکانیں لگنی شروع ہو جاتی تھیں۔ دور دور سے سادھو اور جوگی آنے لگتے تھے۔ بنارس، متھرا، ہردوار اور دیگر مقدّس مقاموں سے کئی گرُو اور معزز لوگ بھی آتے تھے۔ ان کے نیاز حاصل کرنے کے لئے لاہور کی ہندو آبادی منٹو پارک کی طرف اُمڈ پڑتی تھی۔ کئی مسلمان کیمیا گر اور فقیری جوگ میں دلچسپی رکھنے والے بھی پیچھے نہیں رہتے تھے۔

بُڈھے دریا سے لے کر بادامی باغ تک منٹو پارک کے علاقے میں دسہرہ پھیل جاتا تھا۔ جگہ جگہ سادھوؤں اور جوگیوں کے ڈیرے لگ جاتے تھے۔ اُن کے آگے لکڑی کی بڑی بڑی شاخیں جلائی جاتی تھیں جن کی راکھ جٹا دھاری جوگی اور سادھو اپنے جسم پر ملتے تھے۔ عقیدت سے لوگ ان کے پاؤں چھوتے اور آشیر واد حاصل کرتے۔ منٹو پارک (جہاں آج کل مینارِ پاکستان ہے) پہلے بھی بہت وسیع اور سرسبز میدان تھا اور دسہرہ سے دو تین دن قبل عام طور پر پورے پنجاب سے ہندو اور سِکھ صارفین دسہرہ دیکھنے آتے تھے۔ جگہ جگہ ڈیرے لگ جاتے تھے۔ بھگتوں، سادھوؤں اور جوگیوں کی منڈلیاں دور دور تک پھیل جاتی تھیں اور ان کے آس پاس صارفین کا تانتا بندھا رہتا تھا۔

دیوالی سے پہلے

ان دنوں میں لاہور میں سردی کی آمد اور دیوالی کے تیوہار کی خوب تیاریاں چل رہی ہوتی تھیں دسہرہ منا چکے لوگ ان دنوں خوب پُر جوش نظر آتے تھے۔

لاہور کے منٹو پارک میں دسہرے سے پہلے کے مناظر دیکھنے لائق ہوتے تھے۔ لوگ بھجن گانے والی ٹولیوں میں بیٹھ جاتے۔ ہری اوم، جے شِو شنکر اور ہر ہر مہا دیو کے نعروں میں گُم ہو کر ڈھولک، پیتل و کانسے کی تشتریوں اور بانسری کی تانوں پر گائے جانے والے بھجن سُنتے۔ کہیں رامائن پڑھی جا رہی ہوتی اور کہیں گیتا کے شلوک۔ کوئی وِدوان ملی جُلی ہندی، سنسکرت اور اُردو میں سُنا رہا ہوتا۔ دسہرے کے تیوہار سے پہلے ہی دُور دُور سے بہت سے سادھو اور جوگی لاہور آ جاتے تھے۔ کوئی اپنے لمبے بالوں کو کسی درخت سے باندھ کر خود کو لٹکا لیتا تو کوئی لمبے لمبے کانٹوں پر لیٹا ہوتا۔ کئی جوگیوں کے ڈیروں پر لاہور کے اکثر کیمیا گر، حکیم اور وَید بھی دیکھے جاتے تھے۔ ان جوگیوں کے بارے میں مشہور تھا کہ انہیں سونا بنانے کا نُسخہ آتا ہے۔ یہ سادھو اور جوگی کئی طرح کے ہوتے تھے اور ان میں خواتین جوگنیں بھی ہوتی تھیں۔

منٹو پارک میں اس وقت زیادہ رش بڑھ جاتا جب راون اور اس کے راکشسوں کے پُتلے مکمل ہونے کے قریب ہوتے تھے۔ ماہر کاریگر کئی کئی دنوں اور ہفتوں سے اس کام میں لگے ہوتے تھے۔ یہ بُت کاغذ کے بنائے جاتے تھے اور بد شکل و ڈراونے ہوتے تھے۔ پہلے بڑے بڑے بانسوں کو زمین میں گاڑ دیا جاتا تھا اور پھر کئی آدمی دن رات انہیں بنانے میں مصروف رہتے تھے۔ یہ اتنے بڑے اور لمبے ہوتے تھے کہ انہیں سر کو پوری طرح سے اوپر اٹھا کر دیکھنا پڑتا تھا۔ راون کا بُت دس سروں والا ہوتا تھا۔ کُنبھ کرن اور میگھ ناتھ کے بُت ذرا چھوٹے ہوتے تھے

اورکل ملا کر بنائے جانے والے بتوں کی تعداد نو ہوتی تھی۔ یہ لنکا پر رامچندر کی فتح حاصل کرنے کی رسم کا حصّہ تھا۔ جب پُورے نو کے نو گرانڈیل اور بدشکل بُت بن کر تیار ہو جاتے تو انہیں دیکھنے کے لئے جیسے خلقت اُمڈ پڑتی تھی۔

ان میں راون کا پُتلا دس سروں والا اور سب سے بڑا ہوتا تھا۔ دسہرے کی صبح ہونے سے پہلے منٹو پارک میں بیداری کی رات ہوتی تھی اور سورج طلوع ہوتے ہی چاروں طرف سے سادھوسنتوں اور جوگیوں کے سنکھ گونجنے لگتے تھے اور ڈیروں پر سے گھنٹیوں کی آوازیں آنے لگتی تھیں۔ ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی اور بالمیک سبھی اس موقع پر وہاں جمع ہو جاتے تھے۔ رنگین پوشاکیں پہنے عورتیں اور بچّے میلے کے رنگ میں رنگے نظر آتے تھے۔ ان میں چور، جیب کترے، اُٹھائی گیرا اور نظر باز بھی ہوتے تھے۔ اتنی بھیڑ کے باوجود پولیس کہیں نظر نہیں آتی تھی۔ سارا اور ہر طرح کا انتظام ہندو تنظیموں کی طرف سے کیا جاتا تھا۔

ہندو لڑکیاں اور عورتیں بن سنور کر دسہرے کے میلے میں آتی تھیں۔ وہ اُس دن نہ صرف خود نیا پارک اور حضوری باغ آ جاتی تھیں۔ شام سے پہلے جھانکیوں کا جلوس شاہ عالمی، رنگ محل، چوک سر جن سنگھ، پانی والا تالاب، چوک نوگزا پیر وغیرہ سے گذر کر حضوری باغ پہنچ جاتا تھا۔ جلوس میں رام، سیتا اور لکشمن کی جھانکیوں والے رتھ بہت احترام کے ساتھ منٹو پارک میں لائے جاتے تھے اور ہر ہر مہا دیو کے نعروں سے ماحول گونج اٹھتا تھا۔ پُجاری شنکھ بجاتے ہوئے اطلاع دیتے اور رام لکشمن تیر چلا کر تمام پتلوں کو آگ کے حوالے کر دیتے اور ساتھ ہی ان میں سے رنگ برنگی آتش بازی پھوٹ پڑتی۔ آسمان پر چکا چوندھ ہو جاتی دسہرے کے موقع پر لاہور کی آتش بازی دیکھنے لائق ہوتی تھی۔ دسہرہ ختم ہو جاتا اور لاہور میں سردیوں کی آمد ہو جاتی اور ساتھ ہی دیوالی اور اس کے بعد بسنت کے بڑے تیوہاروں کا انتظار شروع ہو جاتا۔

ماضی کی روشنی

لاہور میں دیوالی کا تیوہار تب بہت بڑے پیمانے پر منایا جاتا تھا۔ بٹوارے کے بعد لاہور سے اِدھر آئے لوگوں کے دِل میں وہاں جل رہے دیئے شائد آج بھی اپنی مدھم روشنی بکھیر جاتے ہیں—!

لاہور کے بدلتے موسموں کا رنگ لاہوریئے اپنے چھتوں پر دیکھتے تھے۔ مسلمان عید، بکر عید اور دیگر مذہبی تیوہاروں کو یقینی بنانے کے لئے ہر ماہ چاند دیکھتے تھے۔ وہ کافی دیر تک مکانوں کی اُونچی چھتوں پر کھڑے ہوکر مغرب کے دھندلکوں میں چاند تلاش کرتے تھے اور کئی ایک ستاروں سے اُن کی اچھی بھلی پہچان ہو جاتی تھی۔ اس کے علاوہ وہ گرمی کے موسم میں چھتوں پر سوتے تھے اور سوتے جاگتے ہوئے اس طرح اُن کا رشتہ آسمان سے جُڑا رہتا تھا۔ سردیوں میں عورتیں، بچے اور لڑکیاں چھتوں پر دھوپ سینکتے ہوئے نظر آتے تھے اور اس طرح لاہور کے لوگ موسموں کے ساتھ وابستہ تھے۔ دیوالی، دسہرہ، بسنت، ہولی وغیرہ تیوہار اگرچہ ہندو سِکھ ہی مناتے تھے لیکن ان کا تعلّق بھی موسموں سے تھا۔ اس لئے عام طور پر لاہور کے رہنے والے تمام مذاہب کے لوگ ان تیوہاروں کی موسمی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیتے تھے۔

دیوالی کے تیوہار کے موقع پر لاہور جگمگا اٹھتا تھا۔ ہر طرح کی چیزوں کی دوکانیں ساری ساری رات کھلی رہتی تھیں۔ دیوالی کا تیوہار پُورا ہفتہ جاری رہتا تھا۔ مٹھائیوں اور کِھلونوں کی دُوکانوں پر زیادہ رش ہوتا تھا۔ ہندو، سکھ اور مُسلمان درزی اور نئے جوتے بنانے والے موچی دیوالی سے مہینہ بھر پہلے سے ہی بہت زیادہ مصروف ہو جاتے تھے۔ دیوالی کی رونق ہندوؤں کے ساتھ ساتھ مسلمان محلّوں میں بھی آجاتی تھی۔ ہندو اور سِکھ اپنے مسلمان پڑوسیوں اور دوستوں کو مٹھائی بھیجتے تھے۔ جس

طرح عید کے موقع پر سیویّاں ایک خاص پکوان کے طور پر بنتی تھیں اسی طرح ہندو سکھ گھروں میں جلیبی، موٹی بوندی کے لڈو، بیسن کی مٹھائی، بالوشاہی وغیرہ اکثر لوگ اپنے گھروں میں بناتے تھے۔ بچّوں کو تحفے میں کھلونے ملتے تھے۔ ڈبی بازار، گمٹی بازار، چوک سرَ جن سنگھ، وچھو والی، شاہ عالمی اور لوہاری کے علاوہ انارکلی بازاروں میں بہت زیادہ رش ہوتا تھا۔ دیوالی منانے کے لئے کوئی خاص جگہ یقینی نہیں تھی۔ ہر گلی محلّے اور بازار میں مندر تھے۔ لوگ دیوالی کی صبح کو ان مندروں میں خاص پاٹھ پوجا کرنے جاتے تھے۔ سب سے زیادہ بھیڑ شاہ عالمی اور لوہاری دروازے کے درمیان نیا بازار کے سامنے والے شیتلا مندر میں ہوتی تھی۔ سنگ مرمر سے بنے شیتلا مندر کی طرف آنے والے راستوں پر ہندو عورتوں، لڑکیوں، بچّوں اور بڑی بڑی لمبی قطاروں کا منظر ہوتا تھا۔

مسلمان پھُلیرے (پھول بیچنے والے) جو لوہاری اور بازار ستھاں میں رہتے تھے، پھول اور ہار لئے کھڑے ہوتے تھے۔ یہیں پر مُسلمان کو چوانوں کی آوازیں برابر سنائی دیتی تھیں۔ شیتلا مندر میں آنے والے ننگے پاؤں آتے تھے۔ مندر کی جیوتی بہت بڑی تھی۔ اندرونی تالاب کے اردگرد سنگ مرمر کا راستہ بنا ہوا تھا۔ لوگ پاؤں دھو کر اس راستے سے اندر جاتے، بھجن گیت گاتے ہوئے ماتا کی مورتی پر پھول چڑھاتے گھنٹوں لمبی لمبی قطاریں لگی رہتیں۔ ماتا دُرگا کی یہ مورتی بھی سنگ مرمر کی بنی ہوئی تھی جو بے حد خوبصورت تھی۔ اس بڑے مندر میں دن بھر آنے والوں کی بھیڑ لگی رہتی تھی۔ چوک سُر جن سنگھ میں کالی ماتا کا مندر تھا جو بہت پُرانا تھا۔ یہ مندر پانی والا تالاب سے پہلے تھا جہاں اب اس جگہ چوڑیوں کی مارکیٹ بن چکی ہے۔ کالے اور مٹیالے رنگ کے پتھروں کا بنا یہ مندر بھی لاہور کا دوسرا بڑا اور اہم مندر تھا۔ یہ کافی اونچے چبوترے پر بنا ہوا تھا اور سیڑھیاں چڑھ کر ایک ڈیوڑھی آتی تھی جس کے سامنے ایک بڑے گنبد میں ماتا کالی کی ایک بڑی مورتی تھی۔

لاہور میں دیوالی کے تیوہار پر بچّے مٹھائی کی شکل میں ''کھانڈ کے کھلونے'' حاصل کرتے۔ بڑے بچّے پھلجھڑیاں اور پٹاخے چلاتے اور بڑے جُوا کھیلتے تھے۔ اس دن ہر گھر اور ہر بیٹھک میں ہزاروں کا جُوا ہوتا تھا۔ گلیوں اور بازاروں میں بھی جُواریوں کی ٹولیاں دکھائی دیتی تھیں۔ لاہور کی ہر نرالی ادا کی طرح دیوالی کی ادا بھی نرالی تھی۔

سات دن — آٹھ میلے

کوئی بیشک چوری چوری دیکھے یا سیدھا میلے میں کود جائے، لاہور کا کوئی بھی باشندہ اس سے دور نہیں رہتا تھا۔ اتنے میلے اور تیوہار ہوتے تھے کہ لوگوں میں آج تک ان پر بنے محاورے مشہور ہیں۔ کہا جاتا تھا — ''ست دن اٹھ میلے، کم کریئے کیہڑے ویلے'' — !

لاہور کی گلیوں میں تب بجلی نہیں آئی تھی اور اُس وقت کی کارپوریشن نے گلیوں میں بڑی بڑی لالٹین لگائی ہوئی تھیں۔ شام ہوتے ہی لالٹینیں جلانے کے لئے کارپوریشن کا ملازم سیڑھی لے کر آجاتا تھا۔ پہلے ان میں مٹّی کا تیل ڈالتا، جلا کر سیڑھی اٹھاتا اور اگلی لالٹین جلانے کے لئے آگے بڑھ جاتا۔ شہر لاہور کے اندر اُس دور میں لالٹینوں والی بہت سی گلیاں تھیں۔ ان گلیوں میں روشن لالٹینوں کا نظارہ بہت افسانوی ہوتا تھا۔ خاموش اور دھندلی دھندلی روشنی والی ان گلیوں کے لوگ یکساں تھے۔ ان کی خوشیاں اور غم بالکل ایک جیسے تھے اور یوں لگتے تھے جیسے یہ صدیوں تک اس طرح ہی ان گلیوں کی لالٹینوں کی روشنیوں میں چلتے پھرتے رہیں گے اور یہ منظر کبھی بدلے گا نہیں لیکن موسم بدلتے ہی لاہور شہر کی گلیوں کے منظر بدل جاتے تھے اور لاہوریئے میلوں کی مستی میں کھو جاتے تھے۔ ان کے بارے میں کسی نے سچ ہی کہا ہے —

ست دِن اٹھ میلے
کم کراں میں کیہڑے ویلے
(یعنی سات دن آٹھ میلے — میں کام کس وقت کروں)

لاہور میں سچ مچ کوئی ہفتہ ایسا نہیں گذرتا تھا جس میں کوئی تیوہار یا میلہ نہ منایا جاتا ہو۔

اگر کوئی بڑا تیوہار یا میلہ بھی ہوتو گلی محلّوں میں کوئی نہ کوئی مقامی میلہ ضرور منعقد ہوتا تھا۔ ہر محلّے میں کوئی نہ کوئی مقدس سمادھی، تھڑی یا مزار ہوتا تھا۔ اگر لاہوری دروازے میں ہستو تیلی کا عرس منایا جاتا تو دوسرے دن وچھو والی میں ہر کی پوڑیوں کا میلہ شروع ہو جاتا یعنی لاہور اگر میلوں کے شہر کے نام سے بھی پہچانا جاتا ہے تو غلط نہیں ہے۔ لاہور میں میلوں کی روایت تو صدیوں پُرانی ہے لیکن وقت کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ میلوں کے نام اور شکل وصورت بھی بدلتی رہی ہے۔ کئی میلے تو بالکل ختم ہی ہو گئے اور کچھ بطور یادگار آج بھی کہیں کہیں منائے جاتے ہیں۔

لاہور کی کلچرل زندگی میں میلوں کی روایت بہت اہم رہی ہے اور سالوں قبل لاہوریئے میلوں ٹھیلوں کے لئے اپنا کام کاج ہی ٹھپ کر دیتے تھے۔ اگر کوئی میلہ نہ بھی ہوتا تو لاہوریئے ہر تقریب کو میلے میں بدل دیتے تھے۔ اس دور میں تو ہر صبح لاہور میں ایک نئے میلے کے ساتھ بیدار ہوتی تھی۔ میلوں کی ثقافتی حیثیت کی پہچان میں بھی لاہور بہت سرگرم تھا اور اندرونی شہر کے لوگوں کی زندگی میلوں ہی کی وجہ سے رنگین نظر آتی تھی جو آپسی میل جول، سنگت اور پیار محبت سے بجی ہوئی تھی لیکن اس کا مالی پہلو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا اور ——

"پلّے نہیں دھیلا تے
کردی اے میلہ میلہ"

یہ اس زمانے کی بات ہے جب مالی لین دین میں دھیلہ (سِکّہ) بھی شمار ہوتا تھا اور دھیلہ ایک ٹھوس حقیقت تھی۔ لاہور میں لگنے والے میلوں میں پیسوں اور آنوں کی طرح دھیلہ بھی چلتا تھا۔ ایک دھیلے میں پیڑھی والے جھولے کے پندرہ چکّر ہوتے تھے۔ دھیلے کی بڑی سی ایک پُوڑی ملتی تھی اور ساتھ میں حلوہ مفت ملتا تھا۔ دھیلے میں بچوں کے کھانے کی ڈھیر ساری چیزیں آجاتی تھیں۔ اس لئے لاہوریوں کو میلے میں جانے کے لئے دو تین روپۓ ہی درکار ہوتے تھے۔ اگر بروقت اتنے روپۓ بھی نہ ہوں تو لاہوریئے اُدھار دے کر بھی میلوں کا خیر مقدم کرنے میں پیچھے نہیں رہتے تھے اور میلے کو خالی جانے نہیں دیتے تھے۔

پُرانے لاہور شہر کے وہ میلے، جو اب اتہاس کے میلے میں دب گئے ہیں، ان کی جھلکیاں بہت ہی خوبصورت اور من موہک ہیں۔ ان سے لوگوں کے اس وقت کے رہن سہن اور رسم ورواج کا گہرا تعلق ہے اور ان پر مقامی بیوپار و کاروبار کا بھی سایہ ہے۔

چھڑیوں اور قدموں کا میلہ

لاہور کے میلے کلچرل ماحول کو تازہ کرنے کے ساتھ ساتھ گہرائی میں کہیں روحانیت سے بھی جُڑے ہوتے تھے۔ان میلوں کی لاہور کی زندگی میں بہت اہمیت تھی——!

لاہور میں دو بڑے میلے ''چھڑیوں کا میلہ'' اور ''قدموں کا میلہ'' بہت مشہور تھے۔ یہ دونوں میلے لاہور کے بارہ دروازوں میں چلے جاتے تھے۔''قدموں کا میلہ'' کھانے پینے اور عام استعمال کی چیزوں کا میلہ ہوتا تھا لیکن ''چھڑیوں کے میلے'' کے پیچھے ایسی قدیم روایات تھیں کہ اس کا رنگ ڈھنگ، انداز اور طریقہ بہت مختلف تھا۔تب کے شہر لاہور میں اس میلے کا بہت بیتابی سے انتظار کیا جاتا تھا۔موسم بدلتے ہی اس میلے کی شروعات دیہاتی ڈھولیوں کی آمد کے ساتھ ہوتی تھی۔شہر کی گلیوں، کوچوں اور محلّوں میں دو دو—— تین تین کی ٹولیوں میں یہ لوگ آ کر شہر بھر میں پھیل جاتے تھے اور سارنگی پر لوک گیت سُنا کر بچوں کو لوریاں دیتے تھے۔ مائیں پیسے، گڑ، چاول اور آٹے کی صورت میں تحفہ دے کر بچّوں کو لوریاں دلواتی تھیں۔یہ دیہاتی فنکار ڈھولک اور سارنگی پر لوک لوریاں گاتے تھے۔ مائیں، بہنیں، پھوپھیاں، تائیاں اور مامیاں ہی بچّوں کو لوریاں دلواتی تھیں اور لوریاں دینے والا ساتھ ساتھ ناچتا بھی تھا۔

دیہاتی انداز کے سادھو سنت، پیر فقیر، عورتوں مردوں، بچّوں بوڑھوں اور جوانوں سمیت اس میلے کے دوران کے باہر ڈیرے لگا دیتے تھے۔مردوں کے سِروں پر چھوٹی چھوٹی پگڑیاں ہوتی تھیں اور عورتیں رنگین دوپٹے اور گھاگرے پہنتی تھیں۔دوپٹوں کو چُنریاں کہا جاتا تھا۔ان کے بدن پر چاندی کے موٹے موٹے زیور ہوتے تھے اور وہ لمبا گھونگھٹ نکالتی تھیں۔وہ

لوگ بھی میلے کا ضروری حصّہ ہوتے تھے۔ دیہاتی فنکاروں کی ٹولیاں ساتھ مل کر کرتب دکھاتے تھے اور گلی محلّوں میں گھومتے تھے۔ اکثر بچوں کی مائیں ان فنکاروں کو کپڑے بھی دیتی تھیں۔ ان کی ڈھولکیں بہت خوبصورت ہوتی تھیں۔ ان پر رنگین دھاگوں کی گچھیاں اور چھوٹے چھوٹے رنگین تکیئے بندھے ہوتے تھے ''چھڑیوں کا میلہ'' مستی دروازے سے شروع ہوتا تھا۔ لاہور کی مسلمان عورتوں کا عقیدہ رہا تھا کہ چھڑیوں کے میلے میں چراغ جلانے سے سہاگ سلامت رہتا ہے اور جو غیر شادی شدہ چراغ جلاتی ہیں انہیں سُہاگ ملتا ہے اور ان کے بچے سلامت اور صحت مند رہتے ہیں۔

مستی دروازے کے باہر کی طرف مٹّی کے لیپ سے بنی ہوئی تھڑیوں پر بسنتی پگڑیوں والے چھڑیئے بیٹھ جاتے تھے۔ تھڑی کے تین طرف لمبے لمبے بانس گاڑ کر رنگین دوپٹے لٹکائے جاتے تھے۔ ان کے نیچے بانس کی چھڑیاں گاڑ کر ان پر چھوٹے چھوٹے تکیئے، رنگین پراندے اور موتیوں والی لڑیاں جھولتی تھیں۔ تھڑیوں پر نئے چراغ روشن ہو جاتے۔ عورتیں اور جوان لڑکیاں سرسوں کا تیل چڑھاتیں اور بانسوں و چھڑیوں پر رنگین دوپٹے، رنگین ڈوریوں کے گچھے اور موتیوں والی جھالریں لٹکاتیں۔ تانبے کے سِکّے تیل کے لوٹوں میں ڈالتیں اور پھر بچّوں کو لوریاں دلوائی جاتیں۔ یوں عورتوں اور لڑکیوں کی مُرادوں اور منّتوں سے سجا ہوا ''چھڑیوں کا میلہ'' ایک کے بعد دوسرے دروازے سے ہوتا ہوا شہر لاہور کے بارہ دروازوں کا چکر لگا کر ختم ہو جاتا۔

چھڑیوں کے میلے کے دوران اندرونی شہر کے ہر بڑے محلّے میں کسی نہ کسی بزرگ کا میلہ بھی منایا جاتا تھا۔ ان میں ایک گُگا پیر کا میلہ بھی تھا اور اس کا تعلق چھڑیوں کے میلے سے بھی تھا۔ گُگا پیر کے بارے میں مشہور تھا کہ جب چھڑیوں کے میلے پر کسی سانپ نے سو سال بعد اپنی جُون بدل لی تو گُگا پیر نے چھڑیوں کے میلے میں آ کر جون بدلنے والے سانپ کو پہچان لیا اور اُسے دوبارہ سانپ بنا کر بوتل میں بند کر کے راوی دریا میں پھینک آیا تھا۔ اندرونی شہر لاہور کے پُرانے مکانوں میں سے اکثر سانپ نکلتے رہتے تھے اور جس گھر سے سانپ نکلتا تھا وہ گُگا پیر کا دِیا جلانا ضروری ہو جاتا تھا۔ اس روایت کی پیروی میں چھڑیوں کے میلے میں گُگا پیر کا چراغ جلانا بھی ایک اہم رسم ہوتی تھی۔

چار چراغ تیرے بلن ہمیشہ

شاہ حسین پنجابی صوفی روایت میں ایسے درویش شاعر ہوئے ہیں جنہوں نے جدائی کے الفاظ کو عبادت کا درجہ دے دیا۔ وہ روم روم میں اپنے رب کو محسوس کرتے ہیں۔ ان کی شاعری اپنے پیر کی درگاہ پر چراغ جلانے کی طرح ہے——!

لاہور کے میلوں میں میلہ چراغاں کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ یہ میلہ پنجاب کے صوفی شاعر شاہ حسین کی یاد میں ہر سال ماہ مارچ کے آخری جمعہ (شکروار) کے دن منایا جاتا ہے۔ لاہور کے لوگ شاہ حسین کو مادھو لال حسین کے نام سے بھی پکارتے ہیں۔ یہ میلہ کبھی پنجاب کے کلچر کا ایک پُر جوش اظہار تھا اور تقسیم سے پہلے بھرپور طور پر منایا جاتا تھا۔ اس میں لاہور سے لے کر امرتسر تک کے لوگ شریک ہوتے تھے۔

حضرت شاہ حسین لاہوری مغل بادشاہ اکبر کے دور میں ہوئے تھے اور ان کی پیدائش بھی لاہور ہی میں ہوئی تھی۔ ان کا پیدائشی نام عثمان تھا۔ ذات سے راجپوت اور پیشے سے جولاہے تھے۔ ابتدائی تعلیم ٹکسالی دروازے کی ایک مسجد میں حاصل کی تھی۔ رات بھر راوی دریا میں کھڑے ہو کر قرآن کی تلاوت کرتے تھے۔ اچانک اُن کی ملاقات صوفی رُشد شیخ بہلول سے ہوئی اور سب کچھ چھوڑ کر مستی کے غلبے میں آگئے۔ سر منڈوا دیا لال کپڑے پہنے اور پاؤں میں گھنگرو ڈال دیئے۔ انہوں نے اپنے علم اور روحانی طاقت سے جو کچھ حاصل کیا اُس کے اظہار کے لئے شاعری کا سہارا لیا۔ جو فلسفہ انہوں نے پیش کیا وہ حاکموں اور خود پرست عالموں کو قبول نہیں تھا۔ کمزور طبقوں اور کم تر ہنر مندوں سے ان کی سنگت کو بغاوت کا نام دیا گیا۔ مستی کے عالم میں

اُن کے ناچنے گانے کو اسلامی اصولوں کے خلاف قرار دے کر بادشاہ اکبر کے نامزد عالمِ انصاف عبدالنبی نے انہیں کافر کہنا شروع کر دیا اور سرکاری لوگوں پر شاہ حسین سے ملنے جُلنے پر پابندی عائد کر دی لیکن شاہ حسین نے جس طرح کا اندرونی احساس حاصل کر لیا تھا وہ بندے اور ربّ کے درمیان عشق کے رشتے کی پہچان تھی۔ سرکاری مولوی اور خطیب شاہ حسین کے خلاف مسجدوں میں تقریریں کرتے اور زوردار طریقے سے اس کی مخالفت کرتے تھے۔ شاہ حسین کافیاں لکھتے تھے اور اپنی شاعری کے ذریعہ عام لوگوں سے رشتہ جوڑتے تھے۔ ان کے راگی مُریدان کی کافیاں گا کر پنجاب کے کونے کونے میں پہنچا رہے تھے۔ منصف اعلیٰ عبدالنبی اور سرکاری خطیبوں نے بادشاہ اکبر کے پاس شاہ حسین کے خلاف بہت سی شکایتیں بھیجیں لیکن بادشاہ نے کوئی توجّہ نہیں دی۔ ایک دن اکبر لاہور کے شاہی قلعے کے شمالی بُرج میں بیٹھا دریا کی لہروں سے لُطف اندوز ہو رہا تھا کہ شاہ حسین دھمال ڈالے ہوئے اپنے مریدوں کے ساتھ وہاں سے گذرے۔ ان کے ہاتھ میں ایک بوتل اور پیالہ تھا۔ بادشاہ کے پاس کھڑے مُنصف اعلیٰ نے کہا کہ دیکھئے حضور — یہ کافر سرِ بازار شراب پی کر ناچ گا رہا ہے۔ اکبر نے شاہ حسین کو اوپر بلایا اور پوچھا— ''آپ کہتے ہیں کہ آپ خدا تک پہنچے ہوئے ہیں — لیکن خدا تک پہنچے کیسے؟'' شاہ حسین نے جواب دیا— ''اُسی طرح جیسے میں آپ تک پہنچا۔'' اکبر نے پوچھا کہ تمہارے ہاتھ میں پکڑی بوتل میں کیا ہے تو شاہ حسین نے جواب دیا کہ اس میں شربت ہے۔ اکبر نے کہا کہ مجھے بھی پلاؤ تو شاہ حسین نے پیالہ بھر کر اکبر کی جانب بڑھا دیا۔ بادشاہ نے اس کا ایک گھونٹ بھرا— یہ سچ مچ شربت تھا۔ بادشاہ اکبر نے مسکرا کر اپنے منصف اعلیٰ کی طرف دیکھا اور بہت عزّت کے ساتھ شاہ حسین کو وداع کر دیا۔

میلہ چراغاں صوفی شاعر شاہ حسین کی یاد میں ان کے مزار پر لاہور کے شالیمار باغ میں لگتا ہے۔ یہ میلہ ہر سال مارچ مہینے میں آخری ہفتے کے پہلے اتوار کو لگتا ہے۔ ہفتے کی شام سے قبل ہی لاہوریوں کی ٹولیاں دریاں اور دُوسرا سامان لے کر شالیمار باغ میں پہنچ جاتی تھیں۔ دھمال لگتے، محفلیں سجتیں، شاہ حسین کی کافیاں گائی جاتیں اور ہر طرف رونق ہی رونق ہوتی۔

گلابی موسم میں چراغاں

مُغلیہ دور کے وقت میں شاہ حسین کی سرکاری طور پر بہت مخالفت ہوئی اور وہ مُغل شاہی کے دشمن اور چھوٹے طبقوں کے دوست ہونے کے باعث اپنے زمانے کے صوبائی نظام کے ہاتھوں بہت پریشان کیئے گئے۔ انہیں کافر تک قرار دیا گیا تھا۔ اس لئے مُغلیہ دور کے آخر تک شاہ حسین کا عُرس منانے پر پابندیاں لگی رہیں۔ جیسے ہی مُغل شاہی کمزور ہوئی تو عام لوگوں نے اپنے راہبر کا عُرس منانا شروع کر دیا اور آہستہ آہستہ یہ عُرس پنجاب کے لوگوں کا میلہ بن گیا۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ نے پنجاب کی حکومت سنبھالی تو وہ اپنے سرداروں، امیروں اور وزیروں کے ساتھ بسنتی کپڑے پہن کر شاہ حسین کے میلہ چراغاں میں شریک ہوتے تھے۔ وہ مزار پر اشرفیاں نذر کرتے اور ملنگوں، درویشوں اور فقیروں کے لئے لنگر لگواتے تھے۔ محمد دین فوق اور مولوی نور احمد چشتی نے شاہ حسین کے عُرس پر پنجاب بھر کے لوگوں کی بھرپور شرکت کی تصدیق کرتے ہوئے لکھا ہے کہ شاہ حسین کے نام سے میلہ چراغاں بہت دھوم دھام سے منایا جاتا تھا اور آج بھی دور دور سے ناچتے، گاتے اور دھمالیں ڈالتے لوگ یہاں آتے ہیں اور چراغوں کی رات ہزاروں چراغوں کی لَو آسمان کی طرف اٹھتی ہے اور یوں لگتا ہے جیسے روحانی بیداری کی منزلوں کی طرف اس دھرتی کے لوگوں کا سفر جاری ہے۔ شاہ حسین کا کلام سارے برصغیر میں علم و عرفان کا وسیلہ سمجھا جاتا ہے اور گلوکاران کے کلام کو پوری مہارت اور لگن سے گاتے ہیں۔

شاہ حسین نے اپنے کلام کی تخلیق اس دور میں کی جب ٹی۔ وی، ریڈیو — یہاں تک کہ اخبار بھی نہیں ہوتے تھے۔ نہ ہی اس وقت کوئی چھاپہ خانہ تھا کہ ان کا کلام چھپ کر لوگوں تک پہنچتا لیکن چار سو سالوں سے ان کی کافیاں زندہ سچائیوں کی طرح نسل در نسل سفر کر رہی ہیں۔ یہی

سفر عوام کے میل جول، پیار اور فلسفے کی زمین ہے۔

شاہ حسین کے میلہ چراغاں کی خوشبوئیں اور روائتیں موسمی بھی تھیں اور روحانی بیداری کا ذریعہ بھی۔ اس وقت پنجاب میں بہار کا موسم ہوتا ہے اور فصلیں پک کر تیار ہو چکی ہوتی ہیں۔ اسے لاہور میں گلابی موسم کہا جاتا ہے۔ پرانے وقت میں لاہور میں قدم قدم پر مٹھائیوں کی دوکانیں ہوتی تھیں۔ کاریگر دن رات مٹھائیوں کی تیاری میں لگے رہتے تھے۔ عید اور دیوالی کے تیوہار کی طرح چراغوں کے میلے پر بھی نئے کپڑے اور جُوتے خریدے جاتے تھے اور لاہوریے اپنے خاص پہناوے کا بھی مظاہرہ کرتے تھے۔ رنگین پھولوں والی دھوتیاں، راچے، چکن اور بوسکی کے کُرتے اور تِلّے کی کڑھائی والے جوتے بہت شوق سے پہنتے تھے۔

ہفتے کی شام تک دہلی دروازے سے شالیمار باغ تک میلے کا ایک طرح سے جلوس پھیلا ہوتا تھا۔ تانگوں اور بیل گاڑیوں پر باغبان پورہ تک جانا پڑتا تھا اور کچھ زندہ دل پیدل ہی گھوڑے شاہ کے راستے بھوگے وال سے ہوتے ہوئے باغبان پورہ پہنچ جاتے تھے جہاں شاہ حسین کے مزار کے کشادہ میدان میں ملنگوں، درویشوں اور فنکاروں کے کیمپ لگے ہوتے تھے۔ اس وقت بھی مزار پر چڑھانے کے لئے چادروں کے جلوس وہاں آتے تھے اور چراغاں شروع ہو جاتا تھا۔ ڈھول کی تھاپ پر دھمالیں ڈالی جاتی تھیں اور مزار پر چراغ روشن ہونے لگتے تھے۔ یہ چراغ آہستہ آہستہ ایک بہت بڑے سیلاب میں بدل جاتے تھے اور جیسے جیسے سیلاب بڑھتا جاتا، میلے کا سماں رنگین اور پُر جوش ہوتا جاتا۔ عورتیں، بچّے اور مرد مزار پر پھولوں کا نذرانہ پیش کرتے۔ اُدھر گُمنام راگی روایتی سازوں پر شاہ حسین کا کلام گا رہے ہوتے اور اس طرح رات بھر رت جگا جاری رہتا۔ چاروں طرف چراغ روشن ہوتے، گیت سنگیت ہوتا، دھمالیں ہوتیں، چائے کے دور چلتے، لنگر بانٹے جاتے اور چراغاں جاری رہتا۔

اکّھاں وِچ ملنگ نچدا

''ملنگ نچانا'' دونوں پنجابیوں کی مشترکہ وراثت ہے۔ مشرقی پنجاب کے بہت سے گاؤں میں آج بھی ملنگ نچائے جاتے ہیں۔۔۔ مگر لاہور کا کچھ اپنا ہی انداز تھا۔۔۔۔۔!

جب رات بھیگ جاتی، میلہ چراغاں بھرپور اونچائی پر ہوتا۔ رات کے آخری پہر کے گذرنے میں کچھ دیر باقی ہوتی تو آخری دھمال کی تیاریاں شروع ہو جاتیں۔ سُرخ کپڑوں والے ملنگ پاؤں میں گھنگھروں باندھنے لگتے اور ماہر ڈھولئے ڈھول لے کر میدان میں آجاتے۔ ڈھول کی پہلی آواز کے ساتھ ہی دھمال شروع ہوجاتی اور اس وقت رات کا پُورا ماحول موسیقی خیز ہوجاتا اور ہر طرف مستی کی لہریں پھیل جاتیں۔ کہتے ہیں کہ اس دھمال میں شاہ حسین بھی روحانی طور پر شریک ہوتے تھے۔ اُس وقت دھمال کا یہ منظر اتنا طاقتور ہوتا، جب ملنگ ہونٹوں میں شنکھ لگا کر اپنے دم کا مظاہرہ کرتے اور شنکھوں کی آوازوں میں دھمال کے دائرے اور زیادہ تیز ہوجاتے۔ اسی دوران اچانک سُرخ جوڑے والے ملنگوں کا ٹولا سامنے آجاتا۔ وہ ایک ساتھ پانچ چھ شنکھ بجاتے اور ان کی آوازوں کی اونچائی کے بعد جب شنکھ دھیمے ہو جاتے تو دھمال آہستہ آہستہ مدھم ہونے لگتی اور پھر صُبح کی اذان سے صرف چند ہی لمحے قبل دھمال ختم ہوجاتی۔ اذان کے بعد پھر ایسی خاموشی چھا جاتی جیسے چاروں طرف ہر چیز پر سناٹہ چھا گیا ہو۔

لاہور کے آس پاس کے دیہاتوں سے میلہ دیکھنے کی ٹولیاں ایک روز قبل ہی لاہور پہنچنا شروع ہو جاتی تھیں۔ لاہور کے بازاروں میں بولیاں سُنانے والے دیہاتیوں کی ٹولیاں بکھر جاتیں۔ انہوں نے لکڑی کے گالڑ اٹھائے ہوتے جن سے بندھی ہوئی ڈوریاں ان کے ہاتھوں

میں ہوتیں اور وہ لکڑی کے پول پر گالڑ نچاتے۔ بولیاں گاتے اور شور مچاتے ہوئے گذرتے تو پورا لاہور انہیں دیکھنے اور بولیاں سننے کے لئے گھروں سے باہر آجاتا۔ اکثر دوٹولیوں کا آمنا سامنا ہوتے ہی بولیوں کا مقابلہ شروع ہوجاتا اور موقع پر بنائی گئی بولی بولنے والوں کی ٹولی جیت جاتی یہ بولیاں پنجابی رہن سہن کا بیباک اور ٹھیٹھ اظہار ہوتی تھی اور کئی بولیوں میں جنسی اشاروں کو بہت کھلے ڈھنگ سے استعمال کیا جاتا تھا۔ ان بولیوں میں لاہور کے باشندوں کو بھی مذاق کا نشانہ بنایا جاتا تھا اور لاہوریئے اپنے بارے میں بولیاں سُن کر ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہوجاتے تھے۔ پھر یہ ٹولیاں پیدل ہی شالیمار باغ کی طرف چل پڑتیں۔ اس وقت شالیمار باغ کے ساتوں تختے لوگوں سے بھرے ہوتے اور وہاں قدم رکھنے کی جگہ باقی نہ رہتی۔ دیہاتی لوگ میلے سے واپسی پر دوکانوں سے بیلوں کے گلے میں باندھنے کے لئے گھنٹیاں، گھُنگروں اور دوسرا سجاوٹ کا سامان خریدتے۔ وہ مٹّی کے برتن، لکڑی کے کھیتی باڑی کے اوزار اور دوسرا سامان خرید کر بھی اپنے ساتھ لے جاتے اور لاہوریئے چراغوں کے میلے کی آخری شام وہاں گذار کہ اپنے گھروں کو لوٹنے لگتے۔

دوسرے روز چراغوں کا میلہ صرف عورتوں کے لئے کھُلا ہوتا تھا۔ دیہاتی اور شہری عورتوں کا ایک ہجوم وہاں جمع ہو جاتا۔ کھانے پینے کی چیزیں خوب فروخت ہوتیں۔ لڑکیاں اور عورتیں لکڑی کے پنگھوڑوں میں بیٹھ کر انہیں جھولنے کا پورا لطف حاصل کرتیں۔ وہ شاہ حسین کے مزار پر منّتوں کے چڑھاوے چڑھاتیں اور مزار پر دیئے جلاتیں۔ لاہور میں چراغوں کا میلہ اکیلا ایسا میلہ تھا جس میں ایک دن صرف عورتیں ہی شریک ہوسکتی تھیں اور اس دن مردوں کا میلے میں جانا ممنوع ہوتا تھا۔ اسی زمانے میں عورتوں کے لئے مخصوص دن میلے میں پولیس وغیرہ کا کوئی خاص انتظام نہیں ہوتا تھا اور مرد خود بخود ہی اس طرف جانے میں شرم محسوس کرتے تھے۔

آج میلہ چراغاں کا رنگ روپ بدل چکا ہے۔ پہلے جیسی رونقیں اور رسم و رواج نہیں رہے۔ مزار کے آس پاس اب قبریں ہی قبریں ہیں لیکن اس سب کے باوجود فقیروں اور ملنگوں کی ٹولیاں وہاں جشن مناتی ہیں اور لالوں کے لالی شاہ حسین کے نام کی مالا جپتی ہیں۔

سانجھ (اِشتراک) کی کہانی

لاہور جہاں اپنی میٹھی زبان، اعلیٰ وخوبصورت لوگوں اور کلچر کے بہت سے رنگوں کے طور پر جانا پہچانا جاتا ہے وہیں اس سب کے پیچھے ایک لمبا اتہاس بھی لاہور نے سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔اسی اتہاس میں بہت سارے ایسے عُرس ہیں جو سانجھ (اشتراک) کی کہانی کہتے ہیں۔

لاہور شہر کے ہر محلے اور گلی کوچے میں مسلمان بزرگوں، صوفیوں اور درویشوں کے بہت سے مزار تھے اور یہاں کسی نہ کسی کا عُرس ہر ہفتے یا مہینے میں منایا ہی جاتا تھا لیکن ان میں سے دو عُرس میلے کی صورت میں بہت ہی دھوم دھام سے منائے جاتے تھے۔ایک عُرس حضرت میاں میر کا منایا جاتا تھا اور دوسرا سب سے بڑا عُرس داتا صاحب کا منایا جاتا تھا۔

حضرت میاں میر وہ عظیم صوفی تھے جنہوں نے امرتسر میں شری دربار صاحب کا سنگِ بنیاد رکھا تھا۔اُن کے عرس کا آغاز مُغل بادشاہ شاہجہان کے بیٹے اوران کے جانشین داراشکوہ نے کیا تھا اوران کا شاندار مزار بھی بنوایا تھا۔لاہور چھاؤنی میں دھرم پورہ کے نزدیک قائم مزار پر یہ عُرس دودن منایا جاتا تھا۔مزار کے مشرقی اطراف میں مُغلئی طرز کا ایک نہایت خوبصورت باغ تھا جسے داراشکوہ نے ہی بنوایا تھا۔عُرس کے موقع پر مسافر اس باغ میں آرام کرتے تھے۔یہاں کھلونوں، مٹھائیوں اور عام استعمال کی چیزوں کی دوکانیں لگتی تھیں۔اس میلے میں صوفیوں، ملنگوں اور درویشوں کے علاوہ شہری اور دیہاتی لوگوں کی بھیڑ ہوتی تھی۔

لاہور میں سب سے بڑا عُرس داتا صاحب کا منایا جاتا تھا۔داتا صاحب کے عُرس کی تاریخیں بھی کچھ سالوں کے بعد موسم کا نیا چولا پہن لیتی تھیں اور لاہور میں آٹھ دن پہلے داتا کا

میلہ لگنا شروع ہو جاتا تھا۔ٹکسالی دروازے سے بھاٹی اور وہاں سے لوہاری تک دوکانیں لگ جاتی تھیں اور بھاٹی چوک کے تمام باغوں میں تھیٹر، ورائیٹی شو، تیسرے درجے کی سرکس، جس میں ایک بوڑھا اور بیمار شیر بھی ہوتا تھا، موت کا کنواں اور کھیل تماشوں کے کیمپ لگ جاتے تھے اور عُرس کے قبل ہی لاہور کے لوگ عُرس منانا شروع کر دیتے تھے۔عُرس سے ایک دن پہلے چراغ ہوتے تھے اور لاہوریئے، جن میں ہندو اور سِکھ بھی ہوتے تھے، چراغ کی رسم میں شریک ہوتے تھے اور چاروں طرف ڈھولوں کی آواز گونجتی تھی۔ پورے پنجاب سے لوگ اس عُرس میں بہت عقیدت سے شریک ہوتے تھے۔

لاہور میں داتا صاحب لگ بھگ ایک ہزار سال قبل تشریف لائے تھے اور اُس وقت ہندوستان پر محمود غزنوی کی حکومت تھی۔ داتا صاحب غزنوی کے مخالف تھے اس لئے اس زمانے میں انہیں شاہی دربار میں کوئی عزّت و احترام حاصل نہیں تھا لیکن عوام میں انہیں بہت عزّت و عقیدت حاصل تھی۔ اکبر کے زمانے میں داتا صاحب کا مزار بنا اور وہاں بڑے پیمانے پر عُرس بھی منایا جانے لگا۔تب سے یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زمانے میں سِکھ مہاراجے اور رانیاں تک داتا صاحب سے عقیدت کے رشتوں میں بندھے ہوئے تھے اور سارے مُلک سے درویش، صوفی اور قلندر شرکت کرنے لاہور آتے تھے۔

عرس کے دنوں میں دربار کے آس پاس ایک قدم چلنا مُشکل ہوتا تھا اور چاروں طرف سے یاتریوں کے ہجوم دکھائی دیتے تھے۔ ہاروں، چھوہاروں، میٹھے چنوں، بتاشوں، چوڑیوں، مالاؤں، موتیوں، برتنوں وغیرہ کی دوکانوں کا بھی کوئی حساب نہیں تھا۔لوگ وہاں خود آکر دیگیں پکاتے تھے اور لنگر بانٹتے تھے اس سب کے علاوہ صوفیانہ ادارے پنجاب بھر سے مریدوں کے ساتھ شامل ہوتے تھے۔ان کے ڈیروں میں لوگوں کا ہجوم رہتا تھا۔دربار کے پیچھے ملامتی فقیر اپنے ڈیرے لگاتے تھے اور آگ کا الاؤ روشن کرتے تھے۔ان فقیروں کی مرکزی جگہ داتا صاحب کے مزار کے پیچھے کھڑ کھڑی پیر کا آستانہ تھا جو ہر طرف سے درختوں سے گھرا ہوتا تھا۔کھڑ کھڑی پیر میں ہر جمعرات کے دن لاہور بھر کے موسیقار اور گلوکار آتے تھے۔عُرس کے دنوں میں یہاں موسیقی کے مقابلے ہوتے تھے اور ان مقابلوں میں نہ صرف پنجاب بلکہ ہندوستان کے مختلف حصّوں سے موسیقار حصّہ لیتے تھے۔ان دنوں لاہور کا سارا ماحول موسیقی آمیز ہو جاتا تھا۔تیسرے

دن عُرس ختم ہو جاتا تھا لیکن عُرس کے ہفتے میں آنے والی پہلی جمعرات کو عورتیں سلام کرنے آتی تھیں۔ عُرس کی آخری رات کو بے پناہ بھیڑ ہوتی تھی۔ داتا صاحب کا عُرس آج بھی بہت شان کے ساتھ لاہور میں لگتا ہے لیکن آج پہلے جیسی رونق کہاں؟

لکشمی چوک کے آس پاس

لاہور میں لکشمی چوک کے اردگرد کا علاقہ ان مالدار ہندوؤں کا تھا جن پر لکشمی جی کی پوری مہربانی تھی۔ یہ علاقہ سینما سے جُڑے لوگوں کی وجہ سے بھی مشہور تھا۔ یہاں کی سرگرمیاں اور کھیل تماشے لوگوں کو اپنی طرف متوجّہ کرتے تھے۔

آیئے—لاہور کے لکشمی چوک کی باتیں کریں۔

کہتے ہیں کہ لاہور میں جتنے بھی چوک ہیں، لکشمی چوک ان سب کا دِل ہے۔ اسے وہاں کی فلمی دُنیا کا ایمپلائیمنٹ ایکسچنج بھی کہتے ہیں۔ اس کے پچھلی طرف رائل پارک کی مشہور آبادی ہے اور باقی تینوں طرف بہت سے سنیما گھر، ریستورانت ہوٹل وغیرہ ہیں۔ یہ علاقہ ایماندار اور فراڈ دونوں طرح کے فلمی لوگوں سے گھرا ہوا ہے۔ لاہور کا یہ صرف ایک مرکز ہے جہاں نئی اور پرانی دونوں نسلوں کے لوگ مل جائیں گے۔ نئے پُرانے لاہور میں یہ علاقہ فلمی دُنیا کے روپ میں جانا پہچانا جاتا ہے۔ دنیا کی ہر دوسری فلم نگری کی طرح یہاں بھی نوجوان لڑکے لڑکیاں فلمی اداکار بننے کی حسرت لے کر آتے ہیں اور وقت کے سمندر میں غوطے لگاتے رہتے ہیں۔

لکشمی چوک اس گول چکّر کا نام ہے جہاں سے ایک سڑک ایبٹ روڈ، دوسری نسبت روڈ اور تیسری سڑک ریلوے اسٹیشن اور چوتھی میکلوڈ روڈ سے ہوتی ہوئی مال روڈ کی طرف مُڑ جاتی ہے۔ اس طرح نئے اور پرانے لاہور کے تمام اہم راستے اسی چوک پر آکر ملتے ہیں۔ لکشمی چوک بہت پرانا چوک ہے۔ کسی زمانے میں یہاں ہندوؤں کی قدیم عمارتیں تھیں اور یہاں ایک ایسی عمارت موجود ہے جسے لکشمی بلڈنگ کہتے ہیں۔ یہ لکشمی انشورینس کمپنی کی ملکیت کا حصّہ ہے جسے کبھی لالہ لاجپت رائے نے تعمیر کرایا تھا۔ اس علاقے میں کئی بینک تھے جو ہندوؤں کے تھے۔ کئی مالدار ہندوؤں میں ایک ڈاکٹر لال چند تھے جن کی شاندار عمارت رنجیت بلڈنگ آج بھی یہاں

موجود ہے۔ جس جگہ پر آج رائل پارک بستی بن چکی ہے وہاں پرانے وقتوں میں، 1924ء کے آس پاس، مشہور تاجر گوگل چند کی صرف ایک ہی عظیم الشان کوٹھی ہوا کرتی تھی جس کے اردگرد بہت بڑا میدان تھا جہاں سرکس اور تھیٹر لگا کرتے تھے۔

ملک کی تقسیم سے پہلے بھی یہ چوک فلمی کلاکاروں کا اہم مرکز ہوا کرتا تھا۔ دلیپ کمار، محمد رفیع اور شنکر جے کشن جیسے لوگوں نے یہیں اپنا نام اور پہچان پیدا کی تھی ملک کی تقسیم سے قبل لاہور ہی ہندوستانی فلم انڈسٹری کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ بمبئی اور کلکتہ کا نمبر بعد میں آتا تھا۔ اس دور کے زیادہ تر فلمی اداکار، ڈائریکٹر، گلوکار اور موسیقار اسی لکشمی چوک سے ہو کر شہرت کی بلندیوں پر پہنچے تھے۔ ملکی تقسیم کے بعد بھی اس کی فلمی شہرت ماند نہیں پڑی تھی اور اب بھی اس کی چکا چوند ایسی ہے کہ لوگوں کی کشش کا باعث ہے۔

لکشمی چوک کے ساتھ ہی رائل پارک کی بستی ہے۔ فلمی دُنیا سے تعلق رکھنے والے ہر طرح کے زیادہ تر دفتر یہاں موجود ہیں۔ یہاں نوجوان لڑکے لڑکیوں کو گمراہ کرنے والے وہ لوگ بھی ہیں جو فلمی کیریئر کے خواب دکھا کر جوان لڑکیوں کو اپنی اور لوگوں کی ہوس کا شکار بناتے ہیں۔ قریب ہی تھانہ قلع گجر سنگھ میں درج ہونے والی بے شمار ایف۔ آئی۔ آر۔ اس بات کی گواہ ہیں کہ کئی نام نہاد فلمی کمپنیوں نے بہت سی شریف گھروں کی لڑکیوں کو خط لکھ کر بلایا اور کسی فلم میں کام دینے کی بجائے ہوس کا نشانہ بنایا۔ وہ گھروں سے بھاگ کر یہاں تو آ گئیں لیکن کبھی واپس نہ جا سکیں۔

سورج غروب ہوتے ہی لکشمی چوک کی رونق شروع ہو جاتی ہے اور رات تک یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ لاہور کے زیادہ تر سنیما گھر آج بھی اسی چوک میں موجود ہیں۔ دیر رات میں اس علاقے میں اکثر ایسے لوگ زیادہ نظر آتے ہیں جنہوں نے گھٹیا شراب پی رکھی ہوتی ہے اور پاکستان میں شراب بندی کا مذاق اڑاتے دکھائی دیتے ہیں۔ انہیں لوگوں میں کئی مُرغے لڑانے کے شوقین ہوتے تھے جن کے کھیل کو درجنوں لوگ اکٹھے ہو کر دیکھتے تھے۔ لکشمی چوک کا علاقہ لگ بھگ ایک مربع میل میں پھیلا ہوا ہے جہاں ہر طرح کے اور ہر طبقے کے لوگ رہتے ہیں۔ لیکن لکشمی چوک اور اس علاقے کی جو رونق، اہمیت اور احترام ملک کی تقسیم سے پہلے تھا وہ اب کہاں؟ اب تو یہ صرف نام کا لکشمی چوک ہے۔

لاہور میں ''اِندر کی سبھا''

لاہور کسی وقت فلم اور ڈرامے کی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ آہستہ آہستہ وہ فنکار بمبئی کی طرف سرکتے گئے یا کچھ ایک لاہور کی زمین میں ہی دفن ہو گئے۔ ان لوگوں کو آج بھی ان کی عظمتوں کے لئے بہت محبت اور احترام سے یاد کیا جاتا ہے ——!

پُرانے وقتوں میں فلم نگری اور آج کل لاہور کی فلمی نگری کو لالی وڈ کے نام سے جانا جاتا ہے۔

فلم نگری لاہور اپنے دامن میں حسین ستاروں کی کہکشاں لئے ہوئے ہی نہیں بلکہ اس کے آنچل میں ڈراموں کی دُنیا اور تھیٹر کا ایک وسیع جہان بھی آباد تھا۔ اس نے نہ جانے کتنے اداکار اور فنکار پیدا کئے جنہوں نے یہاں جنم لیا اور کوئی کلکتہ —— بمبئی کی طرف نکل گیا اور کوئی اسی شہر کی آغوش میں دفن ہو گیا۔ دہلی کی طرح لاہور کی کلچرل زندگی کئی بار اُجڑی اور بسی اور یہاں کے پنچھی بمبئی اور کلکتہ جیسے فن کدوں کے گلشنوں کی طرف اڑان بھر گئے۔ کئی دانا چگ کر پھر اسی شہر میں لوٹ آئے اور کئی وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ کئی ایسے ہیرو اور ہیروئینیں ہیں جن کے جنازے اٹھتے دیکھے گئے۔ ان کا کہیں مزار تو نہیں بنا لیکن ایسے ہی لوگوں کی وجہ سے فلم نگری ہمیشہ آباد رہی اور لاہور میں ڈرامے کی دُنیا ہمیشہ زندہ رہی۔

لاہور میں ڈرامے اور تھیٹر کا اتہاس شاید سو سال سے زیادہ پرانا نہیں ہے۔ ابھی بھی کچھ وہ لوگ زندہ ہیں جنہوں نے ڈرامے، تھیٹر اور فلموں کی یاترا اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے۔ برصغیر میں اس کا آغاز سن ستاون کی آزادی کی لڑائی سے پہلے ہو چکا تھا۔ والی اودھ واجد علی شاہ کے زمانے میں قیصر باغ میں سجنے والی ناچ گانے کی محفلوں کا سماج پر بُرا اثر پڑ رہا تھا۔ مشرق اور مغرب کا ٹکراؤ بھی تھا۔ شاعری ہر مرض کی دوا سمجھی جانے لگی تھی۔ سماجی اور مالی نظریئے کی گراوٹ

کلچر کو چوٹ پہنچا رہی تھی۔ تب اُس دور میں امانت لکھنوی کی ''اندر کی سبھا'' نے جنم لیا اور یہ اردو کی پہلی تمثیل قرار پائی۔

تھیٹر کا آغاز لاہور سے قبل لکھنؤ اور ڈھاکہ سے ایک ساتھ ہوا۔ پھر پارسی لوگ، جو فن کے قدر دان اور اہلِ دِل بھی تھے، بمبئ میں سٹیج کی دُنیا سجانے لگے۔ اسی دوران پارسی لوگوں کی کئی چھوٹی بڑی کمپنیاں اسٹیج سجانے کے لئے لاہور آئیں اور اس شہر کے زندہ دل لوگوں سے خوب داد حاصل کرنے لگیں اور لاہور بیسویں صدی کے شروع میں تھیٹر کا ایک اہم مرکز بن گیا۔ ان دنوں بھاٹی دروازہ، میکلوڈ روڈ کے کئی سینما گھر اور بریڈلے ہال میں ڈرامے سٹیج ہونے لگے تھے۔ کبھی کبھی تھیٹر کمپنیاں لاہور کے باہری علاقوں کے کھُلے میدانوں میں بھی خیمے لگا کر سٹیج سجا لیتی تھیں۔ یہ کمپنیاں وقتاً فوقتاً کچھ دنوں کے لئے لاہور آتیں اور پھر لکھنؤ، بمبئ روڈ اور ڈھاکہ لوٹ جاتیں۔ ان کی بدولت ہی لاہور کے لوگوں میں جہاں تھیٹر دیکھنے کا شوق بڑھا وہاں اداکاری میں دلچسپی لینے والے فنکار بھی اُبھر کر سامنے آنے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لاہور میں بھی آہستہ آہستہ کئی تھیٹر کمپنیاں قائم ہونے لگیں۔

لاہور کی پرانی اور مشہور کئی تھیٹر کمپنیوں میں البرٹ تھیٹر کمپنی، گلوب تھیٹر، پریم پجاری ناٹک منڈلی، جمع دار تھیٹر وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ اسی دور میں ماسٹر رحمت علی رحمت نے اسٹیج اداکاری اور گلوکاری میں کافی مشہوری حاصل کی۔ وہ بانکے، سجیلے، محنتی اور اپنی لگن کے پکّے فنکار ہی نہیں، پی۔ آ۔ ٹی کمپنی کے مالک بھی تھے۔ ان کے علاوہ نانک چند اور اطہر علی جیسے اسٹیج ڈائریکٹروں اور فنکاروں نے تھیٹر کی دُنیا میں اپنا سکّہ جمایا۔ ڈرامہ نگاری میں بخشی رام لال، ماسٹر رحمت، میر غلام عبّاس، ماسٹر قمر، مُنشی عبّاس علی، سعید دلاور شاہ وغیرہ نے نام پیدا کیا۔ حکیم احمد شجاع تھیٹر کی دنیا میں بہت نامور آدمی تھے اور آغا حشر کے خاص شاگردوں میں سے تھے۔ آغا حشر ڈرامے اور تھیٹر کی دُنیا کا جانا پہچانا اور بڑا نام ہے۔ انہوں نے انڈین شیکسپیئر تھیٹریکل کمپنی کے نام سے کمپنی بنائی اور اسے لے کر کئی بار لاہور آئے۔ لاہور انہیں اتنا محبوب تھا کہ اپنی بیوی کے ساتھ مہینوں یہاں رہتے اور آخر کار وہ یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ وہ دونوں فوت بھی یہیں ہوئے۔ لاہور کے قدیم قبرستان سیانی صاحب میں انہیں دفن کیا گیا۔

پنجاب کی مایا نگری

بمبئی سے پہلے لاہور فلموں کا مرکز ہوتا تھا۔ اُس زمانے میں فلم انڈسٹری کو جو لاہور نے دیا، اتہاس میں سنہری الفاظ میں لکھا گیا ہے——!

لاہور میں تھیٹر کی آمد اور مقبولیت کے سلسلے میں آغا حشر کی تھیٹریکل کمپنی اور کئی دوسری کمپنیوں کے ڈراموں نے اس شہر کے ماحول میں انقلاب پیدا کر دیا تھا۔ اس ماحول نے جہاں بہت سے نئے فنکاروں کو مواقع فراہم کیے وہاں ڈرامہ نگاروں کی قطار میں کئی بڑے قلم کار پیدا کئے۔ ان میں امتیاز علی تاج، مُنشی دوار کا پرشاد اُفق، امراؤ علی، لالہ کنور سین، مُنشی عباس علی اور پنڈت سدرشن کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ ان لوگوں کے لکھے ڈرامے ''بازارِ حُسن''—''انار کلی''—''جہانگیر''—''عورت کی محبت''—بے حد مقبول تھے۔ اس دور میں میر غلام عباس نے پچاس کے قریب ڈرامے لکھے۔ اسی طرح ماسٹر قمر کے ڈرامے ''شیریں فرہاد''—مُنشی غلام علی کے ''جامِ جم''—اور ماسٹر رحمت کے ''باوفا قاتل'' نے بہت دھوم مچائی تھی۔

جہاں آرا کجّن کا نام لاہور کے تھیٹر کے اتہاس میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ کلکتہ کی اسٹیج اور فلم کی اداکارہ تھی۔ وہ اپنی جہاں آرا تھیٹریکل کمپنی لے کر لاہور آئی۔ اس کمپنی میں کئی حسین، بانکے اور سجیلے فنکار تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب بھاٹی دروازے کے باہر کئی کمپنیاں ڈیرے جما چکی تھیں اور ڈرامے کو کافی مقبولیت حاصل ہوئی تھی لیکن 1932 کے لگ بھگ لاہور اسٹیج سے فلم نگری کی طرف بڑھنے لگا۔ فلم بنانے کا کام لاہور میں 1924 میں ہی شروع ہو گیا تھا اور اس کے بانی اے۔ آر۔ کاردار اور ایم۔ اسماعیل تھے۔ اے۔ آر۔ کاردار وہ پہلے انسان تھے

جنہوں نے لاہور میں فلم کمپنی کی بُنیاد رکھی ۔ اُن دنوں خاموش فلمیں بنتی تھیں اور ان کی شوٹنگ آؤٹ ڈور ہی ہوتی تھی۔ فلم بنانے کے لئے محض ایک کیمرے اور کچھ ریفیلکٹروں سے کام چلا لیا جاتا تھا۔ 1925 کے شروع میں لاہور کا سب سے پہلا اوپن سٹوڈیو بریڈلاہال کے سامنے قائم ہوا تھا جہاں پریم فلم کمپنی کی طرف سے پنجاب کی پہلی فلم ''ڈاٹرز آف ٹوڈے'' (آج کی بیٹیاں) بنائی گئی تھی۔ وجے کمار اور اسمٰعیل اس فلم کے دو اہم فنکار تھے۔ 1931 کے آس پاس لاہور کی فلم نگری نے کافی نام کمایا جب بریڈلاہال کے سامنے کے اوپن سٹوڈیو میں یونائیٹڈ پلیئر (United Player) نامی کمپنی نے ایک کے بعد ایک ساتھ آٹھ فلمیں بنائیں۔ انہیں دنوں ہندوستان کی سب سے پہلی بولنے والی فلم ''عالم آرا'' بنی جس نے فلمی دنیا میں انقلاب پیدا کر دیا۔ 1939 میں لاہور میں ''پنجاب فلم کمپنی'' کے نام سے ایک نیا اسٹوڈیو بنا جہاں سب سے پہلے ''خیبر'' اور ''نئی روشنی'' نام سے بولنے والی دو فلمیں بنیں۔ اسی سال اے۔ آر۔ کاردار اور حکیم پرشاد نے مل کر ''پلیر فوٹو ٹون'' نام سے ایک فلم کمپنی بنائی اور ریجنٹ کے پیچھے اپنا سٹوڈیو بنایا اور یہیں ''ہیر رانجھا'' اور ''گوپی چند'' نام سے دو فلمیں بنائیں۔ ''لورز آف مُغل پرنس'' نام سے فلم بھی یہیں بنی جس میں امتیاز علی تاج، رفیع پیرزادہ اور دیوان شرر نے کام کیا اور اسے بمبئی ٹاکیز کے بانی ہمانشو رائے نے بنایا۔

لاہور کی فلم نگری میں رہتے ہوئے کاردار نے فلمی دُنیا کے لئے ایک مسیحا کا رول ادا کیا۔ وہ دن رات فلمیں بنانے کے کام میں مصروف رہتے۔ اُن کی شہرت آہستہ آہستہ بمبئی اور کلکتہ تک پہنچ گئی۔ ایس انڈیا کمپنی کے بینر کے نیچے کلکتہ آ کر انہوں نے ''باغی سپاہی'' — ''زرینہ'' — ''چندر گپت'' — ''ملاپ'' — ''عورت کا پیار'' — وغیرہ کئی مشہور فلمیں بنائیں۔ کلکتہ کے بعد وہ بمبئی چلے گئے اور وہاں انہوں نے اپنا کاردار اسٹوڈیو قائم کیا۔

کون رنگ کی مایا

مایا نگری کے رنگوں کو ہم جس طرح آج دیکھ یا سمجھ سکتے ہیں، پُرانے دِنوں میں یہ رنگ کچھ الگ ہوتے تھے۔۔۔دِلکش بھی اور انوکھے بھی۔۔۔!

لاہور کی فلم نگری پر کلکتہ اور بمبئی کی فلمی دنیا کا اثر تیزی سے ہو رہا تھا۔ ان دنوں پرتھوی راج، جگدیش سیٹھی اور غلام محمد جیسے فنکار لاہور میں جدوجہد کر رہے تھے لیکن بعدازاں بمبئی اور کلکتہ جانے کے بعد اُن کا شمار اُس دور کے نہایت کامیاب اداکاروں میں ہوا۔ اسی طرح موسیقی کے شعبے میں لاہور کے ماسٹر جھنڈے خاں نے کلکتہ میں خوب نام کمایا اور فلم چترلیکھا میں میوزک دے کر اپنے فن کا لوہا منوایا۔

1931 میں پنجاب فلم کمپنی کے نام سے لاہور میں ایک اور فلم اسٹوڈیو قائم ہوا جسے ڈاکٹر رام نے گاف روڈ کی ایک کوٹھی میں بنایا تھا۔ اس کے لئے تکنیکی ساز و سامان جرمنی اور امریکہ سے منگوایا گیا تھا۔ بمبئی اور کلکتہ میں قائم لگ بھگ تمام اسٹوڈیوز سے یہ زیادہ جدید تھا۔ ڈائریکٹر امتیاز علی تاج اور جے۔ کے۔ نندہ کے ذریعہ بنائی گئی ''سہاگ کا دان'' اور ''سورگ کی سیڑھی'' کے علاوہ کئی فلمیں اس اسٹوڈیو میں بنیں لیکن لاہور میں اے۔ آر۔ کاردار کی کمی پوری نہیں ہوسکی اور اکثر فلمیں فلاپ ہونے لگیں۔ نتیجے کے طور پر یہاں سے فنکار کلکتہ جانے لگے۔ وہ اسٹیج کا مرکز بن چکا تھا لیکن بولنے والی فلموں نے تھیٹر کی مقبولیت کم کردی اور فلمی فنکاروں کو مواقع حاصل ہونے لگے۔ کے۔ ایل۔ سہگل، پرتھوی راج کپور، کاردار، کیدار ناتھ، ماسٹر جھنڈے خاں وغیرہ فلمی دنیا سے وابستہ بہت سے لوگ لاہور چھوڑ کر کلکتہ اور آخر بمبئی پہنچ گئے تھے۔ جن لوگوں

نے کلکتہ میں رہ کر نام کمایا ان میں روپ ۔ کے ۔ شوری، روپ ۔ ایل ۔ شوری، میوزک ڈائریکٹر چشتی، لطیف، داؤد چند اور کیمرہ مین جی سنگھ قابلِ ذکر ہیں۔

فلم نگری لاہور نے کئی اتار چڑھاؤ دیکھے۔ اس دوران لاہور میں زیادہ تر فلمیں کلکتہ اور بمبئی سے بن کر آنے لگیں۔ 1934 میں نیو انڈیا فلمز کے نام سے ایک نئی کمپنی بنی۔ یہ نشاط سنیما کے مالک قاضی خورشید حسن نے نیو تھیٹر کلکتہ کے ساتھ مل کر بنائی تھی۔ اس کے ذریعہ بنائی گئی فلمیں جب ناکام ہوگئیں تو اسے روپ شوری نے خرید لیا۔ اسی سال دیوان سرداری لال نے اپر مال روڈ پر لاہور میں سُپر ساؤنڈ سٹوڈیو قائم کیا اور بعد میں یہی پنچولی سٹوڈیو کا سنگِ بنیاد بنا جسے ایم۔ پنچولی نے بنایا تھا۔ پنچولی آرٹ پکچرز کے بینر تلے انہوں نے پنجابی فلم ''گل بکاولی'' بنائی۔ اس فلم میں بے بی نُور جہاں کی آواز نے سنگیت کے ایسے تار چھیڑے کہ بمبئی اور کلکتہ کی فلمی دُنیا چونک گئی اور لاہور کا کھویا فلمی وقار پھر سے قائم ہونے لگا۔ یہی ننھی آواز آگے چل کر ملکہ ترنم نُور جہاں بنی۔ نُور جہاں کلکتہ سے لاہور لوٹی تھی اور اپنے ساتھ شوکت حسین رضوی کو لے کر آئی تھی۔ بعد میں دونوں نے شادی کر لی۔ لاہور کا شاہ نور سٹوڈیو اُسی عہدِ وفا کی یاد دلاتا ہے۔ انہیں دنوں موسیقار ماسٹر غلام حیدر کلکتہ چھوڑ کر لاہور واپس آگئے اور انہوں نے فلمی سنگیت پر گہری چھاپ چھوڑی لتا منگیشکر یہیں کی کھوج تھی۔

پنچولی آرٹ پکچرز اپنے وقت کی بہترین ٹیم تھی۔ ان کے ذریعے جن لوگوں نے خوب نام پایا اُن میں نُور جہاں، پران، ایم۔ اسماعیل، ماسٹر غلام حیدر کے علاوہ کیمرہ مین بدری پرشاد، ڈائریکٹر برکت مہرہ، ہیروئن رمولا وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ اسی وقت لاہور میں نیو انڈیا سٹوڈیو بھی کام کر رہا تھا اور اس کے نزدیک ہی ناردرن انڈیا سٹوڈیو تھا جس نے اداکارہ راگنی کو شہرت عطا کی تھی۔

لگی ہے چُپ مجھے

لگی ہے چپ تجھے لیکن زبانِ حال گویا ہے۔ تیری خاموشی مرقد میں بھی اک بات پیدا ہے، تو زیرِ خاک ہے پھر بھی زیارت گاہ دنیا ہے۔ شکستہ قبر تیری کعبہ چشمِ تماشہ ہے ——!

لاہور محبت کا شہر ہے۔ لاہور حُسن و عشق کی نگری بھی ہے۔ انہیں خصوصیات نے لاہور کے کلچر کو اپنے رنگوں سے سجایا سنوارا ہے۔

''یہ کبوتر کیسے اُڑا؟'' شہزادے نے پوچھا۔ وہ حُسن پری لجائی، شرمائی، سر جھکائے مسکرائی۔ پیشانی پر سُرخی، گالوں پر لالی، آنکھوں میں کاجل، جسم دودھ سے نہایا ہوا اور انگ انگ سنگِ مرمر سا تراشہ ہوا — اس نے بڑی معصومیت سے دھیمی، میٹھی آواز میں کہا — ''حضور! اُڑ گیا۔'' شہزادہ سلیم نے پھر پوچھا — ''لیکن کبوتر اُڑا کیسے؟'' اُس دوشیزہ نے اپنے ہاتھوں میں پکڑے دوسرے کبوتر کو بھی چھوڑتے ہوئے کہا — ''یوں!'' شہزادہ سلیم جہانگیر اس کی اس ادا پر لڑکھڑا گیا اور وہ ہمیشہ کے لئے اس کی پُر خمار نظروں کا شکار ہو گیا۔ وہ حُسن کی دیوی نُور جہاں تھی جو بعد میں شہنشاہ جہانگیر کی ملکہ بنی۔

لاہور کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس کی مٹّی میں عشق کی کئی عظیم کہانیاں دفن ہیں۔ دریا راوی کے پانی کی لہروں کو چھوتا ہوا مقبرہ جہانگیر اور اس سے کچھ فاصلے پر نور جہاں کی آرام گاہ لاہور کا تاریخی ورثہ ہے۔ جہانگیر اور نور جہاں کی محبت کی داستان کے چرچے عام رہے ہیں۔ اُس دور میں جدائی کی سنگین دیواریں اور آہنی زنجیریں بھی محبت کے ان پروانوں کو جُدا نہیں کر سکیں لیکن موت کے بعد کچھ حالات ایسے ہوئے کہ جہانگیر اور نور جہاں کو ایک ہی جگہ دفن نہیں کیا جا سکا۔

آج ریلوے کی لائن ان دونوں کے مقبرے کے درمیان میں سے گذرتی ہے۔اہلِ نظر جہانگیر کے مقبرے پر جب کبھی آتے ہیں تو نور جہاں کے مقبرے پر بھی حاضری بھرتے ہیں۔

شہنشاہ جہانگیر بادشاہ اکبر کی اولاد تھے اور جنم کے وقت ان کا نام سلیم رکھا گیا۔اکبر کی وفات کے بعد 1605 میں 38 سال کی عمر میں بادشاہت سنبھالتے وقت ان کا نام جہانگیر رکھا گیا۔انہوں نے 21 سال آٹھ ماہ اور تیرہ دن حکومت کی۔وہ شاید سب سے زیادہ انصاف پسند بادشاہ ہوئے ہیں۔مشہور ہے کہ آگرہ کے قلعے میں چار من وزنی سونے کی زنجیر لگی ہوئی تھی جسے کھینچ کر کسی بھی وقت بادشاہ کو طلب کیا جا سکتا تھا۔

بادشاہ نور جہاں سے بے پناہ محبت کرتا تھا لیکن ان کا عشق پروان نہیں چڑھا۔جہانگیر کی شادی حکومت سنبھالنے کے تیسرے سال میں صالح بانو سے ہوگئی اور نور جہاں شیر افغان نامی ایک انسان سے بیاہی گئی۔کچھ عرصہ بعد جب شیر افغان کی موت ہوگئی تو بادشاہ جہانگیر نے نور جہاں کو اپنی ملکہ بنالیا۔ایک عام خاندان میں مرزا غیاث بیگ کے گھر پیدا ہوئی وہ مہر النساء تھی جو نور جہاں بنی اور پھر بادشاہ نے اُسے نور محل اور بادشاہ بیگم کے خطاب سے نوازا۔وہ اپنے دور کی بہترین شاعرہ بھی تھی اور ان کی شخصیت میں بے پناہ کشش تھی۔

جہانگیر کی خواہش تھی کہ جب اُس کی موت ہو تو اُسے نور جہاں کے ذاتی باغ لاہور کے گلشنِ دلکشا میں دفن کیا جائے۔کشمیر سے واپسی پر جہانگیر کی جب آٹھ نومبر 1627 کو موت ہوگئی تو انہیں نور جہاں نے اپنے باغ میں ہی شاہدرہ میں دفنایا۔کچھ عرصہ بعد نور جہاں کی بھی موت ہوگئی تو اسے مقبرہ جہانگیر کے مغرب میں ریلوے لائن کے اُس پار دفنایا گیا۔جہانگیر کا مقبرہ مغل روایت اور سنگِ تراشی کا بہترین نمونہ ہے۔اسے دس سالوں کی مدّت میں اُس زمانے کے دس لاکھ روپئے خرچ کر کے بادشاہ شاہجہان نے تعمیر کرایا تھا۔ان پر بہت سے شاعروں نے کمال کے کلام کہے ہیں۔

نِشاں کیسے کیسے

جہاں کبھی محبت کے نشان ہوا کرتے تھے وہاں اب وقت کی دھول نظر آنے لگی ہے۔
لاہور کی تاریخ میں اسے دردناک پہلو ہی کہنا چاہئے کہ ہم اسے پہچانتے نہیں—!

انارکلی کا نام ذہن میں آتے ہی آنکھوں میں جھانکنے لگتی ہے ایک حسین دوشیزہ — محبت کی ملکہ انارکلی کو اس دُنیا سے کوچ کئے سینکڑوں سال گذر گئے۔ وقت کا دھارا یوں ہی بہتے بہتے صدیوں کے روپ میں ڈھل جائے گا لیکن انارکلی کے حُسن و عشق کی داستاں ہمیشہ زندہ رہے گی۔

کہتے ہیں کہ انارکلی مُغل شہنشاہ اکبر کے حرم کی سب سے خوبصورت کنیز تھی جس کا اصلی نام نادرہ بیگم تھا۔ اُس کے بے پناہ حُسن سے متاثر ہوکر خود بادشاہ اکبر نے اُسے انارکلی کا خطاب عطا کیا تھا۔ ایک روایت کے مطابق وہ ایران کے ایک تجارتی قافلے کے ساتھ برصغیر ہند آرہی تھی کہ راستے میں لٹیروں نے اس قافلے کو لوٹ لیا۔ مالِ غنیمت کی طرح انارکلی بھی ان کے ہاتھ لگی۔ لٹیروں کے سردار نے اُسے کابل کے گورنر کے حضور میں بطورتحفہ پیش کیا جس نے اُس کی بے پناہ خوبصورتی کے باعث اسے بادشاہ اکبر کی خدمت میں پیش کردیا اور اس طرح وہ شاہی حرم میں داخل ہوگئی۔

یہ واقعہ 1599 کا ہے جب انارکلی دُلہن جیسی سج دھج کر ناچ کے لئے پیش ہوئی۔ چاروں طرف قندیلیں روشن تھیں۔ لوبان سُلگ رہا تھا۔ شوخ وسنگ کنیزیں ناچ میں مصروف تھیں اور ان کے درمیان انارکلی ناچ رہی تھی۔ اسی دوران انارکلی اور شہزدہ سلیم کی نظریں ملیں تو دونوں ایک دوسرے میں کھو گئے۔ بادشاہ اکبر نے جب یہ منظر دیکھا تو وہ غصّے میں پاگل

ہو گئے ۔ انارکلی اور سلیم ایک دوسرے سے والہانہ محبت کرنے لگے اور عشق کا انجام یہ ہوا کہ انارکلی کو زندہ دیوار میں چُنوا دیا گیا۔ جس جگہ اُسے دیوار میں چُنوایا گیا وہی اب لاہور شہر کی انارکلی ہے۔ شہزادہ سلیم کو انارکلی کی موت کا بے حد صدمہ ہوا اور جیسے ہی وہ شہنشاہ جہانگیر بن کر گدّی پر بیٹھا، اس نے انارکلی کی یاد میں ایک شاندار مقبرہ بنوایا۔ بہت عرصہ یہ مغل بادشاہوں کی شان وشوکت کا امین رہا لیکن مغل دور کے خاتمے کے ساتھ ہی جہاں لاہور کی دوسری تاریخی عمارتیں محفوظ نہیں رہیں وہیں یہ مقبرہ بھی محفوظ نہیں رہا۔ مقبرے کے اردگرد کئی ایکڑ میں پھیلا ہوا باغ تھا جو اب ویران ہو گیا۔ سِکھ عہد میں پہلے مہاراجہ رنجیت سنگھ کے بیٹے سردار کھڑک سنگھ کی رہائش تھی۔ بعد میں تخت نشینی کے وقت یہ مقبرہ اطالوی ملازم قسطُورا کے حوالے کر دیا گیا جس نے اسے اپنی رہائش گاہ بنائے رکھا۔ برٹش حکومت میں جب لارڈ گوف کو لاہور کا فوجی گورنر بنایا گیا تو انگریزوں نے انارکلی کے مقبرے پر قبضہ کر لیا اور جون 1857 میں اس کے اِردگرد کانٹے دار تار لگوا دیئے۔ ماہ اکتوبر 1857 میں لاہور میں یہ خبر پھیلی کہ انگریز انارکلی کے مقبرے کی جگہ پر گرجا گھر بنا رہا ہے۔ نواں کوٹ، بھاٹی دروازہ، شاہ عالم، لوہاری دروازہ، مزنگ وغیرہ کے سینکڑوں مسلمانوں نے اس فیصلے کی مخالفت میں انگریزوں کے خلاف جب زوردار مظاہرہ کیا تو مظاہرین پر گولی چلا دی گئی۔ کئی لوگ مارے گئے ۔ آخر کار مقبرے کو گرجا گھر میں بدل دیا گیا۔ 1940 کی کھُدائی میں معلوم ہوا کہ قبر وہیں موجود ہے جو مقبرے کے فرش سے نو فٹ نیچے ہے۔ قبر کا تعویذ ایک کونے میں لگا ہے جس پر انارکلی کی موت 1588 لکھی ہے۔ دوسرے کونے میں اس کی تعمیر 1615 لکھا ہے۔ اس کی بناوٹ گولائی میں ہے اور اس کا گنبد کافی اونچا ہے۔ حقائق سے پتہ چلتا ہے کہ انارکلی کے مقبرے کے اردگرد ایک بہت بڑا باغ تھا جو دریا راوی کے قدیم کنارے سے لے کر فصیل شہر کے باہر تک پھیلا ہوا تھا۔ انگریزوں کے دور میں یہ علاقہ فوج کی چھاؤنی بنا۔ جب فوج کو شہر سے دُور حضرت میاں میر کے مزار کے پاس بھیج دیا گیا تو یہاں سِول لائن وجود میں آئی۔

لاہور کی ہولی

ہولی کا ذکر لاہور کے حوالے سے ہو یا برج کے حوالے سے، اس کے ساتھ کئی کہانیاں جُڑی ہوئی ہیں۔ لاہور میں ہولی محض ایک دن کا تیوہار نہیں تھا بلکہ اس کی تیاریاں ایک ہفتہ پہلے شروع ہوجاتی تھیں ——!

ہولی مستی اور امنگ کا تیوہار ہے۔ لاہور صرف ایک شہر ہی نہیں، جینے کے ایک الگ انداز کا نام ہے اور جینے کے اس انداز میں بے پناہ مستی اور پُر زور اُمنگ ہے۔ جب بات ہولی کی ہو تو مستی اور امنگ کی رنگینیاں ایک ولولہ بن جاتی ہیں۔

ہولی کا ذکر لاہور کے حوالے سے ہو یا برج کے حوالے سے، ناچ گانے کی ہماری کلچرل روایتوں کے ذریعے خوشی کا اظہار کرنے اور رنگوں کا سہارا لے کر ہولی کے ناچتے گاتے اس رنگین تیوہار کی بہت سی کہانیاں ہیں۔ ایک کہانی پرہلاد سے جُڑی ہے۔ ہولی کا جلانا اسی رواج کا حِصّہ ہے۔ جب ہولی کے گیت گائے جاتے ہیں تو ان گیتوں میں رادھا کرشن کی پریم کہانی کا ذکر خاص طور سے ہوتا ہے۔ امیر خسرو نے تیرہویں صدی میں ہولی پر شعری تخلیق کی تھی۔ آج کے حوالے میں اسے یکجہتی کی صدا کہا جاتا ہے۔ نتیجہ یہی کہ ہولی رنگ اور رنگینیوں کا تیوہار ہے اور پُرانے وقتوں میں لاہور کی کلچرل زندگی کا ایک اہم حِصّہ رہا ہے۔

لاہور کے تیوہاروں میں عید، بکرعید، شب بارات اور محرّم مسلمانوں کے اہم تیوہار تھے جو بدلتے موسموں کے ساتھ آتے تھے لیکن ہندو کلچر کے سارے تیوہاروں کا تعلق موسموں سے تھا۔ ہولی سے پہلے بسنت، موسم بدلنے پر ہولی گرمی کی آمد کا تیوہار ہوتا تھا۔ یہ ہنسی، مذاق، تفریح اور خوشی کے طور پر منایا جاتا تھا۔ اپنوں اور بیگانوں کے ساتھ شرارت کرنے کی آزادی تھی۔ یہ محض

ایک دن کا تیوہار نہیں تھا بلکہ ہفتہ بھر پہلے شروع ہو جاتا تھا اور ہولی کے دن رنگوں کی برسات ہوتی تھی۔ الگ الگ رنگوں سے بھری بالٹیاں، گھڑے اور پچکاریاں باہر نکل آتی تھیں۔ لاہور کی گلیوں، سڑکوں اور بازاروں سے ہولی کھیلنے والوں کی پیدل ٹولیاں نکلتیں اور ایک دوسرے پر رنگ پھینکتیں۔ ٹولیاں رنگ سے بھری ہوئی پچکاریاں کھڑکیوں اور دروازوں پر خالی کر دیتیں۔ مسکراہٹوں، قہقہوں اور شرارتوں کا یہ تیوہار بڑا رنگین تھا۔ ہولی کے دن لاہور کی پوری زندگی تازہ دم ہو جاتی تھیں۔ عورتیں الگ سے گھروں میں ہولی مناتی تھیں اور اپنے گلی محلوں میں رنگین بھیگی ہوئی ساڑیاں، کرتیوں اور دھوتیوں میں لپٹی ہنستی کھیلتی اور گیت گاتی تھیں۔ ہولی کھیلنے والوں کے بڑے بڑے جلوس نکلتے تھے اور لاہور کے گلیوں بازاروں کے فرش رنگین ہو جاتے تھے۔

بازاروں میں بھنگ کے پکوڑے اور برفی بنتی تھی۔ دریا راوی کے کنارے ملنگوں اور پہلوانوں کے اڈوں پر بھنگ پی جاتی تھی۔ سماج کے ذرا اونچے طبقے میں ہولی خوشبودار گلال سے کھیلی جاتی تھی اور خشک میوے پیش کئے جاتے تھے۔ لاہور کے قدیم کرشنا مندر اور شو مندروں میں گیت سنگیت اور بھجنوں کے پروگرام ہوتے تھے۔ اس طرح اس وقت کا لاہور ہولی کے دن مکمل طور پر رنگین ہو جاتا تھا ـــــــ لیکن آج کے لاہور میں نہ ہولی کے رنگ ہیں اور نہ رنگینی۔

لاہور کے ماتھے کا جُھومر

یہ پنجابی کہاوت بہت مشہور ہے کہ —— ''جس نے لاہور نہیں دیکھا، وہ پیدا ہی نہیں ہوا'' —— اسی کہاوت کی روشنی میں اگر کسی دیہاتی سے پوچھا جائے کہ لاہور میں کیا دیکھا تو وہ سب سے پہلے کہتا ہے ''باشا مسیت (بادشاہی مسجد)، لاہور کا شاہی قلعہ اور ٹھنڈی سڑک'' !

ٹھنڈی سڑک لاہور کی مال روڈ کا پنجابی یا دیسی نام یعنی مال روڈ کئی لحاظ سے لاہور کی پہچان ہے۔ ٹھنڈی سڑک یعنی مال روڈ کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ انگریزوں کی آمد سے قبل لاہور شہر اپنے بارہ دروازوں کی چار دیواری تک محدود تھا اور بیرونی علاقہ ایک دم ویران پڑا تھا۔ وہاں اِکّا دُکّا باغ تھے یا تاریخی یادگاریں تھیں۔ اکبری اور موچی دروازوں کے باہر جنگل تھا۔ مغربی علاقے میں جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں لیکن اس ویرانے میں چھوٹی چھوٹی پگڈنڈیاں ضرور تھیں جو شہر کے آس پاس کی بستیوں مزنگ، سانده اور باغبان پورہ کی طرف جاتی تھیں۔ ہندوستان میں انگریز جہاں بھی آیا اُس شہر کے باہر انہوں نے چھاؤنی بنائی۔ لاہور کے باہر بھی ایک چھاؤنی بنائی گئی تھی اور اسے سڑک کے ذریعے دوسرے شہروں سے ملا دیا گیا تھا۔ سول لائن بستی بھی بسائی گئی تھی جو مغربی انداز کی تھی اور اس کے لئے ایک پختہ سڑک بھی بنائی گئی تھی جو چھاؤنی سے ملتان روڈ تک جاتی تھی۔ اس سڑک کی تعمیر 1890 میں ہوئی تھی اور بعد میں اسی سڑک کا نام مال روڈ پڑا۔

مال روڈ سادہ دِل پنجابیوں کے لئے شروع سے ہی محبوب رہی ہے۔ اسے ٹھنڈی سڑک شاید اس لئے کہا جاتا ہے کہ شروع میں جب یہ سڑک بنی تو اس کے ارد گرد کوئی درخت تک نہیں تھا۔ بعد ازاں گرمی کے موسم میں اس سڑک کے دونوں طرف سایہ دار درخت لگ گئے اور

خوبصورت رنگ دار پھولوں کی کیاریاں بن گئیں اور اس طرح یہ ٹھنڈی سڑک بن گئی۔ کہتے ہیں کہ انارکلی اگر لاہور کا دِل ہے تو مال روڈ اس کے ماتھے کے جھومر سے کم نہیں۔ اسے صرف ایک سڑک کہنا زیادتی ہے۔ درحقیقت یہ ایک پورا رستا بستا شہر ہے ــــ ایک تہذیب ہے اور قدرتی مناظر کی جلوہ گاہ ہے۔ یہ سڑک ہے، بازار بھی اور تہذیب و کلچر کی خوبصورت نشانی بھی۔ شروع سے ہی اس سڑک پر تانگہ چلانے پر پابندی تھی۔ اس سواری کے علاوہ عشق کی منزل تک کا سفر اس سڑک پر طے کیا جا سکتا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق یہاں سے ایک منٹ میں سو کاریں گذرتی ہیں۔ اس سڑک کا آغاز گول باغ سے ہوتا ہے۔ گول باغ کسی زمانے میں سیاستدانوں کے لئے اسٹیج کا کام دیتا تھا۔ اس سڑک کے شروع میں ہی متحدہ ہندوستان کی قدیم پنجاب یونیورسٹی ہے۔ یونیورسٹی کے دُوسرے صدر دروازے پر زمزمہ توپ سے تھوڑی دوری پر برگد کا ایک بوڑھا گھنا درخت تھا جسے اب کاٹ دیا گیا ہے۔ کسی زمانے میں اس درخت کے نیچے فلسفی، سائنسداں، شاعر اور مورّخ آپسی بات چیت اور تکرار میں مصروف دکھائی دیتے تھے۔ کسی کا انتظار کرنے والے لوگوں کی بے چینیوں کا گواہ بھی یہ درخت تھا۔ یونیورسٹی کے سامنے عجائب گھر ہے اور اس کے بغل میں نیشنل کالج آف آرٹس ہے۔ عجائب گھر کے پیچھے پنجاب پبلک لائبریری ہے۔ تھوڑا اور آگے ٹولنٹن مارکیٹ ہے۔ اس سے کچھ دور دوسرے چوک میں پاک ٹی ہاؤس ہے جسے ادیبوں اور فنکاروں کا مکّہ کہا جاتا ہے۔

پاک ٹی ہاؤس کے آگے بینک اسکوائیر کا علاقہ ہے۔ تکونی سڑک پر وائی۔ ایم۔ سی۔ اے حال ہے۔ سامنے کی طرف جی۔ پی۔ او ہے اور نزدیک ہی امریکی دفتر و لائبریری ہے۔ بڑے ڈاک خانے کے چوک سے مال روڈ اپنی پوری جولانی میں آجاتے ہیں۔ یہاں پر ایک طرف ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ ہے اور آگے ریگل چوک تک بڑا بازار ہے۔ ریگل کے آگے اس سڑک پر کئی بڑے ہوٹل، فری میسن ہال، چڑیا گھر، اسمبلی ہال، گورنر ہاؤس اور پاکستان آرٹس کونسل قائم ہیں۔ گول باغ سے شروع ہوکر چھاؤنی تک جانے والی ٹھنڈی سڑک لاہور کی سیاسی، مالی، سماجی اور ثقافتی زندگی میں گذرے وقت سے آج تک خاص اہمیت رکھتی ہے۔

مال روڈ سے پہلے......؟

پتھر سے بنی شاہراہیں بہ ظاہر ساکت اور بے جان ہوتی ہیں، مگر کچھ شاہراہیں ایسی ہوتی ہیں جو ایک زمانے کو دوسرے زمانے سے ملاتی ہیں، ایک تہذیب کو دوسری تہذیب میں داخل کرتی ہیں، قدیم کا جدید کے ساتھ رشتہ جوڑتی ہیں۔ فصیل کے اندر گھرے قدیم لاہور کے پہلو میں ڈیڑھ صدی قبل وجود میں آنے والی ایک عظیم شاہراہ بھی ان میں سے ایک ہے۔ یہ مال روڈ کے نام سے مشہور ہوئی، عوام نے اسے ٹھنڈی سڑک بھی پکارا اور سرکار نے اسے شاہراہ قائداعظم کا نام دیا۔ مال روڈ ایک شاہراہ کا ہی نام نہیں بلکہ ایک نئی ثقافت، نئے اداروں اور نئی طرز دینے کا نام بھی ہے۔ اِس شاہراہ کا جنم کیسے ہوا؟ اور جس علاقے میں یہ بڑے سکون سے لیٹی پڑی ہے، اس کے جنم لینے سے پہلے وہاں کیا تھا؟ یہ وہ سوال تھا جن کے جوابات کی مجھے تلاش تھی۔ موجود سے پہلے کے وجود کا سوال ہمیشہ سے انسان کے ذہنوں میں گردش کرتا چلا آیا ہے۔ میں بھی مال روڈ سے پہلے کے وجود کی تلاش میں نکلا اور لاہور کی تاریخ پر لکھی قدیم کتابوں کا سہارا لیا تو جوں جوں ان کی ورق گردانی کرتا چلا گیا تُوں تُوں موجود سے پہلے کے وجود کا پتہ بھی چلتا گیا۔

1849 میں لاہور سکھ حکومت سے نکل کر انگریزی اقتدار میں داخل ہوا تو تیرہ دروازوں میں فصیل کے اندر گِھرے پُرانے شہر کے باہر بھی کئی محلے آباد تھے۔ اندرون شہر کے محلوں میں کوچہ لوہاراں، کوچہ گیرگراں، کوچہ کمان گراں، کوچہ قاضی خانہ، گجر گلی، کوچہ نقاشاں، کوچہ نقارچیاں، کوچہ درزیاں، کوچہ دھوبیاں، کوچہ ماشکیاں، کوچہ چابک سواراں، کوچہ تیزابیاں، کوچہ کوٹھی داراں، کوچہ کندی گراں، کوچہ دریائی بافاں، کوچہ مُنج کٹاں، کوچہ وان وٹاں، کوچہ سرکی بنداں، کوچہ چڑی ماراں، کوچہ نیاریاں، کوچہ خراسیاں، کوچہ گھونگرو سازاں، کوچہ کمہاراں،

کوچہ سراجاں، کوچہ مفتیاں، تکیہ سادھواں، کناری بازار اور بازار شیشہ موتی وغیرہ مشہور تھے۔ فصیل سے باہر مُغل عہد میں جو بستیاں آباد ہوئیں ان میں حاجی سوائے، محلا طلا بخاری، محلا مزنگ، محلا ابو اسحاق، کوٹ کروڑی، محلا قطب غوری، لکھی محلا، بیگم پورہ، مغل پورہ، اچھرہ، میاں میر، باغ نخلی، محلا شیخ اشرف اور میانی وغیرہ کے نام نمایاں ہیں۔اس زمانے میں مزنگ اور اچھرہ الگ موضع ہوتے تھے۔جس مقام پر مال روڈ وُجود میں آئی، یہاں اور اس کے ارد گرد اِکا دُکا بستیاں، کچھ باغات، کچھ فصلیں، کچے مزارات اور باقی خالی میدان ہوا کرتے تھے۔ بھاٹی دروازہ سے موجودہ سول سیکرٹریٹ تک جو اَب لوئر مال کہلاتا ہے شروع سے لاہور کو ملتان سے ملانے والا راستہ تھا۔ جہاں اب ضلع کچہری ہے وہاں عالم گیر عہد میں محلا شیخ اشرف آباد ہوا جسے رنجیت سنگھ دور میں برباد کیا گیا اور شیخ اشرف کی بنائی ہوئی مسجد اور اس کے مقبرے کو بارود سے اُڑا دیا گیا اور اس کی نعش نکال کر میانی میں دفنا دی گئی۔یہیں کچھ فوجی نوعیت کی بارکیں تھیں جنہیں 1845ء میں تعمیر کیا گیا تھا۔جس جگہ اب گورنمنٹ کالج لاہور ہے وہاں راجہ رنجیت سنگھ کے دور میں ایک ٹیلہ ہوا کرتا تھا جہاں فوجیوں کو ٹریننگ دی جاتی تھی۔ اسی ٹیلے سے کچھ آگے خاص فوجیوں کے لئے اسٹیج ہوتا تھا۔ ٹیلے پر ایک بنگلا تعمیر کیا گیا۔اسی بنگلا میں انگریز دور میں 1860 میں کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کی ابتدائی کلاسیں شروع کی گئیں۔موجودہ ریٹی گن روڈ کا علاقہ برف میدان کہلاتا تھا جہاں مغلوں اور سکھوں کے دور میں قدرتی طریقے سے برف جمع کی جاتی تھی اور گرمیوں میں کام آتی تھی۔اس سے تھوڑا آگے انار کلی باغ تھا جو مقبرہ انار کلی تک پھیلا ہوا تھا۔اسی مقبرے میں رنجیت سنگھ کے دور میں جنرل لارڈ اور جنرل ونطورا کی رہائشیں قائم ہوئیں۔ یہیں انار کلی کے علاقے میں چوبرجی اور مزنگ تک سکھوں کی چھاونیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ان ہی علاقوں میں محلا مزنگ، محلا ابو اسحاق اور خوجوں کا محلا ہوا کرتا تھا۔

مقبرہ انار کلی کے قریب موجودہ مال روڈ کے پہلو میں بارہ دری نواب وزیر خاں تھی جو ایک باغ کے اندر گھری ہوئی تھی۔اسے بادشاہ شاہ جہاں کے ایک امیر اور لاہور کے صوبے دار نواب وزیر خاں نے تعمیر کروایا تھا۔ مال روڈ کی تعمیر سے پہلے یہاں بھی سکھ فوجی قابض تھے اور بارہ دری چھاؤنی کا حصّہ بنی رہی۔1849 میں انگریز سرکار کا عمل دخل ہوا تو انہوں نے بھی سکھوں کی تقلید میں یہاں چھاؤنی بنائی۔اب اس بارہ دری میں 1864 سے پنجاب پبلک لائبریری قائم

ہے۔ بارہ دری نواب وزیر خاں کے متصل شیخ عبدالرحمٰن درویش کی قبر تھی۔ یہ قبر ایک بلند چبوترہ پر اب بھی یہاں موجود ہے۔ سکھوں کے زمانہ سے بیشتر ہر سال میلہ سنگ کے موقع پر بارہ دری نواب وزیر خاں میں بہت رونق لگتی تھی، پھر سکھوں کے عہد میں میلہ اس سے ذرا ہٹ کر لگنے لگا۔ پرانی انارکلی کے علاقے میں سکھ دور کے فرانسیسی جرنیل ونتورا کا قائم کردہ باغ ہوا کرتا تھا جو گُڑی باغ کے نام سے بھی مشہور تھا یہاں ونتورا اور اس کی بیٹی میری شارلوٹ کی قبریں بھی تھیں۔ یہیں قریب موج دریا کا مزار بھی تھا۔ مال روڈ سے انارکلی کے علاقے کی طرف جائیں تو لوہاری دروازہ کے باہر قطب الدین ایبک کا مزار بھی تھا، کسی زمانے میں اس کے اردگرد آبادی قطب الدین غوری کے نام سے آباد تھی، انگریزی عمل داری کے وقت یہ سارا علاقہ اُجاڑ اور چٹیل میدان ہوا کرتا تھا، یا کچھ جگہوں پر فصلیں اُگی ہوتی تھیں۔ البتہ موجودہ نیلا گنبد کے علاقے میں سیّد عبدالرزاق مکی کا مقبرہ اور مسجد ہوا کرتی تھی۔ یہ مقبرہ اور اس کے اوپر نیلا گنبد عہد عالم گیر میں سیّد عبدالرزّاق مکی کے ارادت مندوں نے تعمیر کرائے تھے۔ یہاں باغ بھی تھا جسے سکھوں کے عہد میں تباہ کر دیا گیا اور مسجد اور مقبرے کو بارود خانہ میں تبدیل کر دیا گیا۔ مسجد کے ساتھ ہی لوہاروں کے لیے چند مکان بنا دیے گئے جن میں وہ بندوقیں بنایا کرتے تھے۔ انگریز آئے تو انہوں نے یہاں سے بارود خانہ ختم کر دیا اور اسے فوجی میس بنا دیا۔ اسی علاقے میں جہاں اب میو ہسپتال اور کنگ ایڈورڈ میڈیکل یونیورسٹی قائم ہیں ہری سنگھ نلوہ کا باغ تھا۔ اس عالی شان باغ میں پھل دار درخت ہوا کرتے تھے۔ باغ رتن چند بھی اسی احاطے میں تھا۔

مال روڈ پر جہاں جی پی او اور ہائی کورٹ کی عمارات ہیں، اس علاقے میں رسول پورہ کی بستی مُغل بادشاہ ہمایوں کے عہد میں وجود میں آئی۔ اس زمانے میں ایک بزرگ سیّد عبدالرزاق المعروف حضرت شاہ چراغ نے یہاں ڈیرہ ڈالا اور علاقے کا نام رسول پورہ رکھا، لیکن جب ہمایوں نے لنگر خان بلوچ کو لاہور میں جاگیر دی تو اس نے یہاں اپنے عالی شان مکانات تعمیر کرائے اور رفتہ رفتہ یہاں ایک محلا آباد ہو گیا تو رسول پورہ کی جگہ گذر لنگر خان کے نام نے لے لی۔ اب نہ رسول پورہ رہا، نہ محلا لنگر خان نہ عالی شان مکانات کے کوئی آثار۔ مال روڈ کی تعمیر کے وقت صرف شاہ چراغ کا مزار اور مسجد رہ گئے تھے۔ اس سے کچھ آگے شمال مشرق کی جانب جہاں اب مال روڈ ہے، باغ ہمت کہار ہوا کرتا تھا۔ یہاں مغلوں کے زمانے میں باغ و

مقبرہ حضرت شاہ اسماعیل کی چار دیواری تھی۔ پھر یہیں بڑے بڑے ساہوکاروں، تاجروں اور متموّل لوگوں کے عالی شان مکانات تعمیر ہو گئے اور ان دولت مندوں اور لاکھ پتیوں کی وجہ سے اس علاقے کا نام لکھی محلا مشہور ہو گیا۔ مغلیہ سلطنت کے زوال کے وقت جب لوٹ مار ہونے لگی تو کچھ لوگ فصیل شہر کے اندر چلے آئے، کچھ جموں کی طرف چلے گئے اور جو کہیں نہ جا سکے، وہ مال و اسباب سمیت غارت گروں کی نذر ہو گئے اور رفتہ رفتہ عالی شان مکان کھنڈروں میں تبدیل ہوتے گئے۔ پھر رنجیت سنگھ کے زمانے میں جمع دار خوشحال سنگھ کے ایک اہل کار ہمت قوم کہار نے بہت سا حصہ ہموار کرایا اور یہاں ایک دلکش باغ اور اس کے ساتھ کئی پختہ مکانات تعمیر کرائے۔ انگریزی عملداری کے وقت ہمت کے پوتے حاکم نے وہ باغ میاں محمد سلطان ٹھیکے دار کے پاس فروخت کر دیا، جس نے وہاں ایک کوٹھی تعمیر کرائی جہاں اس زمانہ کے ڈپٹی کمشنر مسٹر ہال نے رہائش اختیار کی، اسی وجہ سے بعد ازاں اس سڑک کا نام ہال روڈ مشہور ہوا۔

کچھ فرلانگ مشرق کی جانب جہاں اب گورنر ہاؤس ہے مغل عہد میں محلا سادات آباد تھا۔ سیّد بدرالدین گیلانی ایک بزرگ شاہ جہاں کے زمانہ میں اس مقام پر رہتے تھے۔ اسی جگہ ان کی عالی شان مسجد بھی تھی۔ طوائف الملوکی کے زمانے میں سکھوں نے اس محلے کو کئی مرتبہ لُوٹا، مگر سادات ڈٹ کر مقابلہ کرتے رہے بالآخر سکھوں نے ایک بڑے جتھے کے ساتھ حملہ کیا اور فتح پا کر خوب لوٹ مار کی، بہت سے سادات قتل ہوئے، مکانات کو آگ لگا دی گئی بہت سی سیدانیاں خودکشی کر کے مر گئیں اور باقی جو سادات بچ گئے وہ بھاگ گئے۔ محلے کی عمارات میں صرف مسجد اور کچھ حجرے بچ رہے۔ جسے رنجیت سنگھ کے دور میں جمع دار خوش حال سنگھ کے قبضے میں دے دیا گیا۔ اس نے اپنی ماتحت فوج کی چھاؤنی قائم کر لی اور اسے بارود خانے میں تبدیل کر دیا۔ مقبرے کے متصل کُشتیوں کا اکھاڑا بن گیا اور یہ گُنبد کُشتی والا گنبد کے نام سے مشہور ہو گیا۔ جمع دار نے گنبد گرا کر ہشت پہلو کوٹھی بنوا لی اور اس کے ساتھ ایک نہایت دیدہ زیب چھوٹا سا باغ تعمیر کرایا۔ مال روڈ کی تعمیر کے وقت یہ باغ اور کوٹھی دونوں موجود تھے۔ اسی علاقے میں تھوڑا مشرق کی جانب بڑھ کر ایک کھلی جگہ بزرگ کی قبر تھی جو بعد ازاں مال روڈ کی تعمیر کے دوران اس کے نیچے دب گئی۔ آگے نہر تھی اور پھر میاں میر کا علاقہ آ جاتا۔ اردگرد کہیں کہیں فصلیں تھیں اور باقی مٹی کے کھلے میدان، جہاں جگہ جگہ خودرو جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔ یہ تھا وہ منظر نامہ جو 1851 میں

مال روڈ کی تعمیر سے پہلے اس علاقہ میں ہر آنے جانے والے کو نظر آتا تھا۔ مال روڈ کی تعمیر کے ساتھ ہی یہ منظر نامہ تیزی سے تبدیل ہونا شروع ہوگیا۔

بہ شکریہ—جناب اسد سلیم شیخ
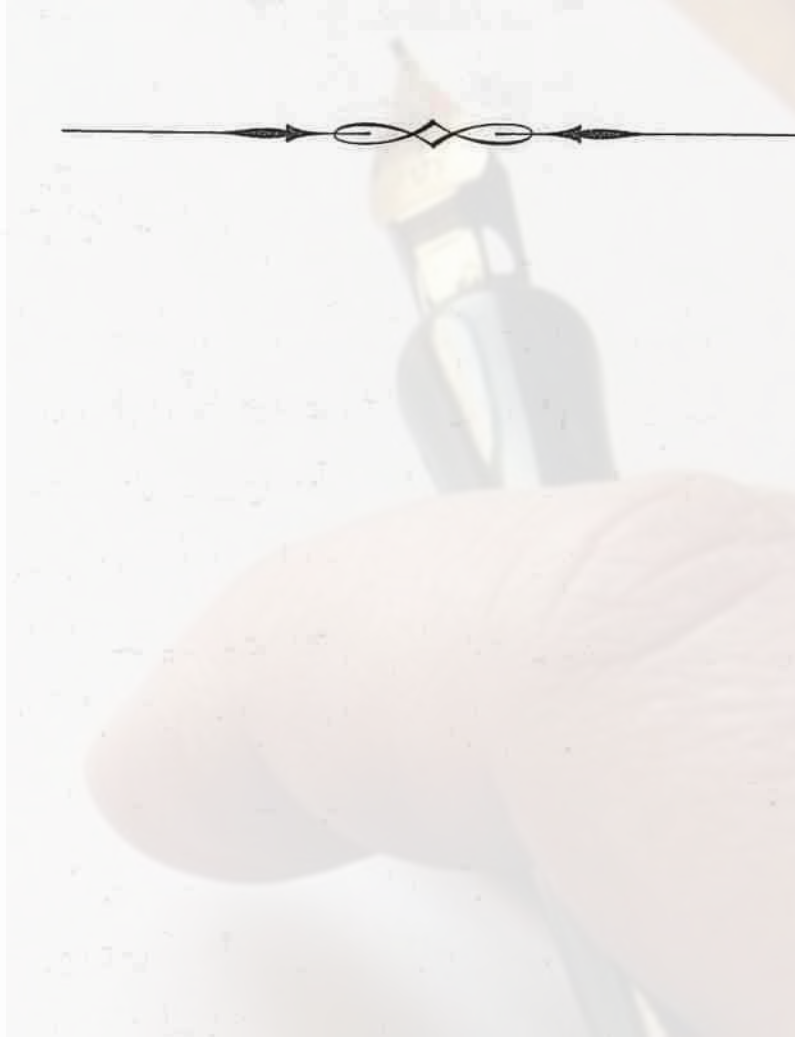
مال روڈ کا ارتقائی سفر

مال روڈ کی تعمیر ۱۸۵۱ء

اکتوبر کے آخری دنوں کا خوشگوار موسم کہ جب ہوائیں سردی کے آنے کی نوید لے کر آتی ہیں۔ میں گاڑی کی پچھلی نشست پر بیٹھا ہوں۔ گاڑی لوئر مال سے ایک موڑ مُڑ کر رومانوی شاہراہ مال روڈ پر رواں دواں تھی۔ دونوں جانب اس کے پہلو میں عظیم اور قدیم عمارات گذرتی جا رہی تھیں۔ ان ہی سُرخ و سفید عمارات کو مال روڈ نے اپنے دامن میں پھیلا کر ایک نئے لاہور کو جنم دیا تھا۔ مگر اس سے پہلے اسے خود کو بھی جنم لینا پڑا۔ جس کے گواہ اس کی دھرتی میں گہری جڑوں سے پیوستہ وہ قدیم درخت بھی ہیں۔ جو اس کے سینے پر سایہ دار کھڑے ہیں اور آج جھوم جھوم کر اُن کی تاریخ بنانے کے لیے بے تاب دکھائی دے رہے تھے۔ ان ہی درختوں سے سورج کی کرنیں نکل کر جب ہمارے چہرے پر پڑتیں تو خنکی سی محسوس ہونے لگتی تھی۔ باغ جناح جو کبھی لارنس گارڈن کہلاتا تھا، تک پہنچتے پہنچتے سوچنے لگا کہ اس شاہراہ کی تاریخ اور شان و شوکت ہمیں کون سنائے گا۔ یہ تو معلوم تھا کہ اب ہمیں کوئی ڈیڑھ پونے دوصدی پُرانہ لاہور یا تو نہیں ملے گا جو اس نئی ثقافت کو جنم دینے والی مال روڈ کی داستان سناتا اور یہ بھی پتا تھا کہ جب کوئی داستان سنانے والا کوئی بھی باقی نہ بچا ہو تو پھر کتابیں بولتی ہیں۔

میرے ہاتھ میں کرنل ایچ۔ آر۔ گولڈنگ (H.R. Goulding) کی کتاب قدیم لاہور (Old Lahore) ہے۔ یہ کتاب 1922 سے 1923 تک سول اینڈ ملٹری گزٹ میں مسلسل شائع ہوتے رہے تھے۔ کرنل گوڈ نگ کا تعلق لاہور کے ساتھ تقریباً نصف صدی تک رہا۔

اُنہیں لاہور اور اس کی عمارتوں سے جو محبت تھی۔ یہ کتاب اس کا ایک ذریعۂ اظہار ہے۔ جیسے جیسے میں اس کتاب کی ورق گردانی کرتا چلا گیا، لاہور کی عمارات اور شاہراہوں کے ابتدائی اور تاریخی حالات سے آگاہی ہوتی گئی۔ مال روڈ کی ابتدا کیسے ہوئی کرنل گولڈنگ کی زبانی سُنیے!

''خوب صورت مال روڈ کی یادوں کو تازہ کرنا کتنا دلچسپ لگتا ہے کہ یہ سڑک جو برصغیر پاک و ہند کی بہترین سڑکوں میں شمار ہوتی ہے، اس کی تعمیر کا منصوبہ لیفٹیننٹ کرنل نیپیئر (Napier) نے جو ان دنوں سول انجینئر تھے 1851 میں تیار کیا تھا۔ انہوں نے اسے ''انارکلی سے میاں میر تک براہ راست سڑک'' کا نام دیا۔ اس سڑک کی تعمیر کی ضرورت اس لیے محسوس ہوئی کہ 1849 میں انگریزوں کے پنجاب پر قبضے کے بعد انارکلی میں جو فوجی چھاؤنی قائم کی گئی تھی وہ صحت بخش ماحول کے لیے ناکافی تھی پھر بہت سارے فوجی ابھی تک شالا مار باغ اور میاں میر کے علاقے میں کیمپ لگائے بیٹھے تھے۔ چنانچہ 1850 میں میاں میر چھاؤنی کی تعمیر کا فیصلہ کیا گیا۔ اب میاں میر کو انارکلی تک ملانا ضروری تھا۔ کرنل نیپیئر نے سڑک کی تعمیر کے لیے دو متبادل تخمینہ جات پیش کیے۔ ایک تخمینہ دس ہزار چار سو اٹھائیس (10,428) روپے کا تھا اور اس کی نچلی سطح پختہ اینٹوں اور اُوپر کی سطح کنکر کی ہونا تھی۔ دوسرا تخمینہ بارہ ہزار پانچ سو چوالیس (12, 544) روپے کا تھا اور اس میں اینٹوں کی بجائے اُوپر اور نیچے کی سطحیں کنکر کی رکھی گئی تھیں۔ نیپیئر نے دونوں تخمینہ جات کے ساتھ اس رائے کا بھی اظہار کیا تھا کہ کم لاگت والا ڈیزائن مناسب حد تک پائیدار رہے گا، لیکن بورڈ آف ایڈمنسٹریشن نے جب یہ منصوبہ منظوری کے لیے حکومت ہند کو ارسال کیا تو یہ رائے دی کہ عظیم شاہراہ صرف انارکلی کو ہی نہیں پورے شہر کو ملائے گی اور شاہراہ عام ہوگی اس لیے اس کو مضبوط بنانا فضول خرچی نہیں بلکہ کفایت شعاری ہوگی۔

حکومتِ ہند نے کرنل نیپیئر کی رائے کو قبول کرتے ہوئے اپریل 1851 میں اس منصوبے کی منظوری دے دی۔ جس تیزی کے ساتھ حکومت ہند نے اس منصوبے کو منظور کیا تھا اس سے اس شاہراہ کی ضرورت و اہمیت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ نیپیئر نے سڑک کا منصوبہ 3 مارچ 1851 کو پیش کیا تھا اور ایک ماہ کے اندر اندر حکومت ہند نے اس کی منظوری دے دی تھی جب کہ اُس زمانے میں ابھی تک ریل، تار، ڈاک اور ٹیلی فون جیسے جدید ذرائع مواصلات بھی موجود نہ تھے۔ ایک سال کے اندر اندر یہ سڑک تعمیر کے مرحلے مکمل کر کے اپنے دامن پر نیا لاہور

بسانے کے لیے تیار ہوگئی تھی۔ ابتدا میں یہ کم چوڑائی والی سڑک تھی اور جب تک سر گنگا رام لاہور پر اونشل ڈویژن کے ایگزیکٹیو انجینئر رہے اس وقت تک اس کی چوڑائی اور لمبائی میں کوئی قابل ذکر تبدیلی نہ لائی گئی۔ سوائے اس کے کہ جنرل پوسٹ آفس کراسنگ کے مشرقی حصّے کو بہتر بنایا گیا۔ بعدازاں جب ماہر تعمیرات مسٹر ڈوکیونے سمتھ (Ducune Smyth) چیف انجینئر کے عہدے پر فائز ہوئے تو ان کی زیرنگرانی پوری مال روڈ کی تعمیر نو کی گئی۔ اس کام کی نگرانی ذاتی طور پر اس وقت کے لیفٹیننٹ گورنر سر چارلس ریواز نے کی۔ سر ریواز پنجاب کے لیفٹیننٹ گورنر رہے تھے۔ اُنہیں اس شاہراہ سے بہت پیار تھا۔ ایک طرف چیف انجینئر ایک ہاتھ میں فیتہ پکڑے، دوسرے ہاتھ کے ناخنوں سے سڑک کو کھروچ رہا ہوتا تو دوسری طرف خود لیفٹیننٹ گورنر چارلس ریواز سڑک کے کنارے لگے درختوں کو بچانے کی ہر ممکن کوشش میں ہوتے۔ میو سکول آف آرٹس (موجودہ نیشنل کالج آف آرٹس) کے مقام پر مال روڈ کی تعمیر نو کے وقت بہت سارے درخت اس کی زد میں آ رہے تھے جنہیں گورنر نے ممکن طور پر بچانے کے لیے کام کی خود نگرانی کی۔ اس تاریخی شاہراہ کو مال روڈ کا نام کب دیا گیا، سرکاری دستاویزات بتاتی ہیں کہ انارکلی سے میاں میر تک براہ راست سڑک (Direct road from Anarkali to Mian Mir) کے ابتدائی نام سے تعمیر ہونے والی سڑک کو 1876 تک لارنس روڈ کہا جاتا رہا اور سرکاری نقشوں میں بھی اسی نام سے ظاہر کیا جاتا رہا۔ اور اس وقت تک موجودہ لوئر مال روڈ کو ہی مال روڈ کہا جاتا تھا جو ڈپٹی کمشنر کی عدالت سے لے کر ملتان روڈ کے مقام اتصال تک تھی۔ جب کہ گورنمنٹ ہاؤس (گورنر ہاؤس) سے انارکلی تک کا علاقہ سول اسٹیشن تھا اور اسے سر ڈونلڈ میکلوڈ لیفٹیننٹ گورنر پنجاب کے نام سے موسوم کر کے ڈونلڈ ٹاؤن قرار دیا گیا تھا۔ 1876 کے بعد موجودہ مال روڈ کو اپر مال اور پرانی مال روڈ پکارا جانے لگا۔

مال روڈ 1857 میں:

اگلی ربع صدی کے دوران انگریزوں نے پنجاب پر اپنے اقتدار کو مستحکم اور مضبوط کر لیا تھا اور بہت سے شعبوں میں اصلاحات شروع کر دی تھیں، ریلوے، ڈاک تار اور سڑکوں کے جدید ذرائع مواصلات متعارف ہوئے، نئے نئے محکمے بننا شروع ہوئے، سیاسی اور معاشی

ڈھانچے میں تبدیلی کے اثرات سماج پر بھی پڑنا شروع ہو گئے۔ اس لیے لاہور میں مسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں کے ساتھ ساتھ گورے رنگ کے انگریز بھی نظر آنے لگے، ان کی عبادت گاہیں گرجا گھر جگہ جگہ وجود میں آنے لگے اور ان کا زیادہ تر مرکز مال روڈ اور اس کے مضافات کا علاقہ ہی تھا۔ مال روڈ کی تعمیر کے بعد پچیس برسوں کے دوران لارنس ہال، نولٹن مارکیٹ، ضلع کچہری، چرچ، گورنمنٹ ہاؤس، سول سیکرٹریٹ اور چیف کورٹ اور میو سکول آف آرٹس کی عمارات تعمیر ہو چکی تھیں۔ موجودہ گورنر ہاؤس کی جگہ سیّد بدرالدین کا مقبرہ اور خوش حال سنگھ کی کوٹھی تھی جو اس کی وفات کے بعد اس کے بھائی سردار تیجا سنگھ کی ملکیت میں آ چکی تھی۔ 51-1850 کے دوران یہ کوٹھی انگریزوں نے حاصل کی اور اسے ابتدا میں ڈپٹی کمشنر اور کمشنر کی رہائش گاہ کے طور پر استعمال کیا، پھر گورنمنٹ ہاؤس میں تبدیل کر کے اسے گورنر کی رہائش گاہ میں تبدیل کر دیا گیا۔ اس دوران انجینئر کنہیا لال کی زیر نگرانی ایک عالی شان کوٹھی انگریزی طرز کی وجود میں آ گئی جس کے اطراف خوب صورت باغیچے بنائے گئے اور جمعدار خوش حال سنگھ کی قدیم کوٹھی کا نام و نشان بھی نہ رہا۔ اس کے بعد مال روڈ پر جو دوسری انگریزی عمارت وجود میں آئی وہ چرچ کی تھی۔ یہ چرچ 1857 میں موجودہ گورنمنٹ کالج کی حدود میں قائم کیا گیا۔ یہ قدیم عمارت بعد میں گورنمنٹ کالج کے جیمنیزیم کے طور پر کام آتی رہی اور آج بھی اس کی حدود کے اندر واقع ہے۔ مال روڈ کی تیسری اہم عمارت لارنس ہال کی صورت میں اس کے پہلو میں سجی۔ اسے پنجاب کے پہلے لیفٹیننٹ گورنر جان لارنس سے موسوم کیا گیا۔ یہ ہال اس زمانے میں چونتیس ہزار روپے لاگت سے یورپی باشندوں اور افسران کے چندے سے تعمیر ہوا۔ دو سال بعد یعنی 1866 میں اس کے ساتھ ہی پنجاب کے دوسرے گورنر سر رابرٹ مونٹ گمری کی یاد میں مونٹ گمری ہال تعمیر ہوا۔ اس ہال کا نقشہ مسٹر گرڈن سول انجینئر نے تیار کیا تھا۔ روسائے پنجاب نے اس ہال کی تعمیر کے لیے دل کھول کر چندہ دیا اور اس پر ایک لاکھ آٹھ ہزار روپے لاگت آئی۔ ہال کی چھت جو میلا رام کی ٹھیکے داری میں تعمیر ہوئی تھی بڑی ناقص ثابت ہوئی چنانچہ 1857 میں ایگزیکٹو انجینئر کنہیا لال کی زیر نگرانی اس کی بڑے پیمانے پر مرمت کرانی پڑی اور اس پر 66 ہزار روپے کی کثیر لاگت آئی۔ یہ دونوں ہال قیام پاکستان تک انگریز افسران اور اشرافیہ کی سماجی سرگرمیوں کا مرکز رہے۔ اب یہاں قائد اعظم لائبریری قائم ہے۔ ان دونوں عظیم الشان عمارات کی تعمیر سے پہلے کنگ ایڈورڈ میڈیکل

کالج کے ڈاکٹر ای براؤن جو ایگری ہارٹی کلچرل سوسائٹی کے سیکرٹری بنے تو انہوں نے 1862 میں ایک چھوٹا سا باغ لگا کر اس کا نام ایگری ہارٹی کلچرل گارڈن رکھا۔ 1868 تک اس کو وسیع اور عالی شان باغ میں تبدیل کر دیا گیا اور اس میں مختلف ممالک سے 80 ہزار پودے لگا کر عالی شان بنا دیا گیا۔ یہ باغ لارنس گارڈن کے نام سے مشہور ہوا۔

اسی عرصے کے دوران 1864 میں مال روڈ پر انارکلی کے سامنے ایک بڑی صنعتی نمائش کا اہتمام کیا گیا۔ یہ نمائش جنوری سے اپریل 1864 تک رہی اور اس میں قدیم ہندو اور مسلم زمانوں کے عجائبات منظر عام پر لائے گئے۔ پنجاب بھر سے اکٹھے کیے گئے نوادرات، روایتی لباس، زیورات، خطاطی کے نمونے، فرنیچر اور دست کاریوں کی نمائش کی گئی۔ اس عظیم نمائش کے لیے منفرد انگریزی طرز تعمیر کی ٹولنٹن مارکیٹ تعمیر کی گئی۔ اس نمائش کی وجہ سے ٹولنٹن مارکیٹ سے گول باغ تک کا علاقہ نمائش روڈ (Exhibition Road) کہلانے لگا۔ نمائش کے اختتام پر زرعی اور صنعتی اشیا کو الگ کر دیا گیا اور نوادرات کا حصّہ الگ کر کے اسی عمارت میں رکھ کر اسے ابتدائی طور پر عجائب گھر کا درجہ دے دیا گیا۔ جب کہ دست کاریوں کو الگ کر کے وہاں لاہور اسکول آف آرٹس کی بنیاد رکھ دی گئی۔ اس عظیم نمائش کے دو سال بعد 1866 میں پنجاب میں چیف کورٹ عمل میں آئی تو اس کا دفتر مال روڈ پر مقبرہ شاہ چراغ کے ساتھ قائم ہوا۔ اسی پر بعد ازاں ہائی کورٹ کی عالی شان عمارت سجائی گئی۔ مال روڈ کے اس ارتقائی سفر میں چار سال بعد لوئر مال پر ضلع کچہری کی سُرخ اینٹوں والی خوب صورت عمارت وجود میں آئی۔ یہاں پہلے پرانی بیرکیں ہوتی تھیں۔ اسی برس یعنی فروری 1870 میں برطانوی شہزادہ ڈیوک آف ایڈنبرگ لاہور تشریف لائے تو اس موقع پر زم زمہ توپ کو دہلی دروازے کے باہر سے اُٹھا کر ٹولنٹن مارکیٹ کے سامنے مال روڈ پر لا کر سجا دیا گیا۔ اس طرح مال روڈ کے حُسن میں اور اضافہ ہو گیا۔ اگلے برس 1871 میں مقبرہ انارکلی سے ملحقہ تاریخی عمارت کو سول سیکرٹریٹ کی شکل دے دی گئی۔ 1872 میں لارنس گارڈن سے مُلحق جگہ پر چڑیا گھر بھی ابتدائی شکل میں وجود میں آ گیا۔ اس کے بالمقابل رائے میلا رام کی عمارت ہوتی تھی اور انہیں پرندے پالنے کا بہت شوق تھا۔ رائے میلا رام نے تمام پرندے عطیہ دے دیے۔ اس طرح کے دیے ہوئے عطیے سے چڑیا گھر کی بنیاد رکھ دی گئی۔ یوں مال روڈ پر عوام الناس کے لیے تفریح کے مواقع بھی میسر آنا شروع ہو گئے۔ نہر کے

پار 1874 میں اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس کی خوب صورت عمارت بھی وجود میں آ گئی۔ یہ عمارت دراصل وائسرائے کے دورہ لاہور کے دوران ان کے شایان شان رہائش کے لیے تعمیر ہوئی۔ ان عمارات کے وجود میں آنے کے بعد مال روڈ پچیس برسوں میں ایک نئے لاہور کی شکل میں سامنے آنا شروع ہو گئی تھی۔ چند تجارتی دکانیں اور انگریز افسران کے رہائشی بنگلے بھی نظر آنے لگے تھے۔
1857 کے آخر تک مال روڈ کے منظرنامے کو گولڈنگ نے بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:
''مشہور مال روڈ جو 1851 میں اپنی تعمیر کے وقت انارکلی تا میاں میر براہ راست سڑک کے نام سے پکاری گئی، 1875 میں اس کا رنگ روپ کیا تھا، لفظوں میں بیان کرنا بہت دل چسپ ہوگا۔ میاں میر کی طرف سے آتے ہوئے نہر کو عبور کریں تو مال روڈ کے دونوں جانب بنجر اور ویران میدانوں کے سوا کچھ نہ تھا، صرف بائیں جانب ایک دومنزلہ بنگلا نظر آتا تھا جو بعد میں مہاراجا پٹیالہ کی ملکیت میں رہا۔ اس بنگلا میں لاہور کے اینجلیکن بشپ کچھ سالوں کے لیے رہائش پذیر رہے تھے اور یہ (Bishopsbourne) کے طور پر جانا جاتا تھا۔ یہ نام بشپ کی رہائش گاہ کے لیے مخصوص ہوتا ہے۔ تھوڑا سا آگے اسی جانب لارنس باغ، لارنس و مونٹ گمری ہال اور ان کے بالمقابل گورنمنٹ ہاؤس تھے۔ گورنمنٹ ہاؤس سے گزر کر آگے ''ارُنڈل'' آجاتا جو کئی برس تک ایک آئی سی ایس افسر مسٹر آر برنے (Mr. R. Burney)، کئی دوسرے افسروں اور لاہور کی جانی پہچانی غیر سرکاری شخصیات کی ملکیت میں رہا۔ یہیں کشمیر روڈ اور ارُنڈل (Arundel) کے داخلی دروازے کے درمیان ایک خالی قطعہ زمین ہوتا تھا۔ اسے بعض اوقات برنے باغ (Burney's Garden) بھی پکارا جاتا تھا۔ اس کے بعد پنجاب کلب آجاتا، جس کی عمارت بھدی بیرک نما تھی اور اس کے عقبی حصے میں ریکٹ کورٹ بنی ہوتی تھی۔ اسی وجہ سے یہ سڑک کئی سال تک ریکٹ کورٹ کہلاتی رہی جو بعد ازاں ایجرٹن روڈ بنی۔ اسی جگہ بعد میں نیڈوز ہوٹل بنا اور اب اسی قدیم نیڈوز پر جدید آواری ہوٹل کی عالی شان عمارت کھڑی ہے۔ مال روڈ کے اس حصے میں بائیں جانب کوئی عمارت نہ ہوتی تھی۔ پھر 1916 میں میسونک لاج اور اس کے سامنے شاہ دین کی بلڈنگ وجود میں آئیں۔ چیئرنگ کراس سے لے کر ہال روڈ تک مال روڈ پر بائیں حصے میں 1875 میں کوئی عمارت نظر نہ آتی تھی، ہر طرف کھلے میدان تھے۔ صرف مسٹر بریمنر (Bremner) کا فوٹو سٹوڈیو تن تنہا اس حصے میں نظر آتا تھا۔ اس کے بالمقابل یعنی دائیں

جانب اس حصے میں صرف تین بنگلے ہوتے تھے، ان میں سے ایک بنگلے میں بعدازاں ڈائریکٹر انڈسٹریز کا دفتر قائم ہوا۔ جب کہ مسٹر ڈیو جانسٹن (Dav Johnston) کی ملکیتی جائیداد (Beav Parc) کوفورڈ موٹر کمپنی نے خرید لیا تھا۔اس تاریخی عمارت میں انگریزی اخبار سول اینڈ ملٹری گزٹ جاری ہوا اور اس میں مشہور انگریزی ادیب رُڈیارڈ کپلنگ نے بطور صحافی خدمات سرانجام دی تھیں۔ اسی عمارت میں 1880 کی دہائی کے پہلے سالوں میں حکومت پنجاب کے ملٹری سیکرٹری کا دفتر بھی قائم ہوا تھا۔اسی تاریخی عمارت کے ملبے پر اب مال روڈ کا پینو راما شاپنگ سنٹر کھڑا ہے۔

یہیں اسی حصے میں سنی ویو ہوٹل کی عمارت بھی تھی جسے لاہور کے ایک سابق پوسٹ ماسٹر مسٹر جارج نے نجی رہائش گاہ کے طور پر تعمیر کیا تھا۔ ہال روڈ کو عبور کرتے ہوئے مال روڈ پر آگے بڑھیں تو صرف دائیں جانب ایسی عمارت آنکھوں کے سامنے آتی ہے جو کئی سال تک ''مسٹر جیس ڈیوی سنز کیرج شاپس'' (Mr. Jas Davison's Carriage Shops) کی ملکیت رہی۔ اس کے بالمقابل یعنی بائیں جانب دو قدیم بنگلے تھے۔ ان میں ایک بنگلے میں دی ایکسچینج (The Exchange) نام کا ادارہ بعد میں قائم ہوا اور بالآخر اسی بنگلے کو گرا کر اس کے ملبے پر سر گنگا رام ٹرسٹ بلڈنگ تعمیر ہوئی۔ جب کہ دوسرے بنگلے پر فلپس کمپنی قابض ہوئی اور بالآخر یہ بھی انجام کو پہنچ کر ایک نئی عمارت کی شکل میں کھڑی ہوئی جہاں بمبئے سائیکل اینڈ موٹر ایجنسی کے شور ومز اور ورکشاپس قائم ہوئیں۔ اس کے قریب ہی چوک میں جہاں قیام پاکستان سے پہلے تک سر جان لارنس کا مجسمہ نصب تھا (موجودہ ہائی کورٹ کے قریب) پرانی پنجابی طرز کی اینٹوں سے بنی مینار نما عمارت تھی۔ یہ عمارت برطانوی فوج کے ایک سابق آفیسر کی رہائش تھی، اس نے انگریزوں کی سکھوں کے ساتھ جنگوں میں خدمات سرانجام دی تھیں اور پھر اپنی وفات تک پنجاب سول سیکرٹریٹ میں کلرک کے طور پر کام کرتا رہا۔ پورے ہندوستان میں اس شخص کا کوئی رشتہ دار تھا نہ کوئی دوست، اس نے اپنی پوری زندگی مشرقی خواتین کی طرح گھر میں بند رہ کر گزار دی۔ یہیں مال روڈ کے اسی حصے میں موجودہ ہائی کورٹ کے ساتھ مقبرہ شاہ چراغ اور مسجد تھی۔ یہاں کئی سال تک اکاؤنٹنٹ جنرل کا دفتر کام کرتا رہا اور سیشن جج کی عدالت بھی قائم رہی۔ ان سے بھی پہلے ڈپٹی کمشنر کے پرنسپل اسسٹنٹ کی رہائش گاہ رہی۔ کچھ اضافی عمارات 1875 اور 1880 کے

درمیانی عرصے میں تعمیر کرائی گئیں۔ آج کل یہ ایوان شاہ چراغ ہے۔ اس کے بالمقابل مال روڈ پر جو عمارت اس زمانے میں نظر آتی تھی وہ میسرز رچرڈسن اینڈ کمپنی کی ملکیت تھی اور پھر میسرز پلومر اینڈ کمپنی اس کی جانشین بنی جو اس زمانے میں لاہور کے واحد کیمسٹس تھے۔ یہ قدیم عمارت آج بھی قائم و دائم ہے۔

اس حصے سے گزرتے ہوئے مال روڈ پر آگے بڑھیں تو دونوں جانب خالی میدان اور فصلوں کے سوا کچھ نہ تھا، ٹولنٹن مارکیٹ تک علاقہ خالی تھا اور سوائے ایک برف خانے اور چرچ کے کوئی عمارت نہ ہوتی تھی۔ چرچ کی عمارت کو تبدیل کر کے بعدازاں 1880 میں ٹیلی گراف آفس بنایا گیا۔ اسی حصّے میں رفتہ رفتہ جنرل پوسٹ آفس، الائنس بنک، ٹیلی گراف آفس، ایف سی کالج، مُول چند کی دکان اور وائی ایم سی اے کی بلڈنگ وجود میں آتی گئیں۔ مال روڈ کے اس حصّے میں زیادہ تر فصلیں ہوتی تھیں اور کُتا گاڑیاں (Dogcart) چلتی نظر آتی تھیں۔ مال روڈ کے آخری حصّے میں ٹولنٹن مارکیٹ اور تھوڑا سا آگے گول باغ تھا، جس کے پہلو میں اس زمانے میں گورنمنٹ کالج لاہور کی عمارت زیر تعمیر تھی۔ لوئر مال پر ضلع کچہری کے اردگرد کچھ بیرکیں اور گوروں کی رہائش گاہیں تھیں۔

مال روڈ 1876 سے 1947 تک کا سفر

بیسویں صدی کا آخری سورج غروب ہونے تک مال روڈ نے اپنا نصف صدی کا سفر طے کر لیا تھا اور اس دوران کئی اور تاریخی اور عالی شان عمارات اس نے اپنے دامن پر پھیلالی تھیں۔ ان میں وائی ایم سی اے بلڈنگ، پنجاب یونیورسٹی سینٹ ہال، جم خانہ کلب کرکٹ گراؤنڈ، تار گھر، میو سکول آف آرٹس، گورنمنٹ کالج، سنٹرل ماڈل اسکول، سنٹرل ٹریننگ سکول، پنجاب پبلک لائبریری، لاہور ہائی کورٹ، کیتھیڈرل، ٹاؤن ہال، ایچی سن کالج اور عجائب گھر کی تاریخی اور عالی شان عمارات خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے وائی ایم سی اے بلڈنگ 1876 کے لگ بھگ تعمیر ہوئی۔ اسے ینگ مینز ایسوسی ایشن نے سماجی سرگرمیوں کے لیے قائم کیا تھا اور مجید ایڈورڈ بدلی اس کے بانیوں میں سے تھے۔ پنجاب یونیورسٹی کا سینٹ ہال 1876 میں نواب آف بہاول پور کی رقم سے تعمیر ہوا اور اس پر اس زمانے میں چونتیس ہزار روپے کی لاگت آئی

تھی۔ 1878 میں لارنس گارڈن کے اندر انگریز اشرافیہ نے اپنی تفریح کے لیے جم خانہ کلب قائم کیا، کچھ برسوں بعد کرکٹ گراؤنڈ بھی وجود میں آگئی، جسے پاکستان کی پہلی کرکٹ گراؤنڈ ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ اسی عرصے کے دوران موجودہ جی پی او کے سامنے مرکزی تار گھر کی عمارت وجود میں آئی۔ پہلے یہاں چرچ ہوا کرتا تھا اور کسی زمانے ین ایک بزرگ حاجی محمد سعید کا علاقہ ہوتا تھا۔ تار گھر کی عمارت گرجا کی عمارت کی ہیئت تبدیل کر کے 1880 میں رائے بہادر کنہیا لال ایگزیکٹیو انجینئر کی زیر نگرانی بننی شروع ہوئی اور 1882 میں تکمیل کو پہنچی۔ اس سے چند سال پہلے مال روڈ کے پہلو میں گورنمنٹ کالج لاہور کی گوتھک طرز کی عظیم الشان عمارت وجود میں آچکی تھی۔ یہ عمارت 1878 میں پایہ تکمیل کو پہنچی تو مال روڈ پر دُور سے ہی اس کے بلند مینار سے اس کی عظمت جھلکتی دکھائی دیتی تھی۔ میوسکول آف آرٹس نے اگرچہ 1875 میں کام شروع کردیا تھا مگر اس کی عمارت 1883 میں 43 ہزار روپے کی لاگت سے مکمل ہوئی تھی۔ اس کا سنگ بنیاد 3 جنوری 1880 کو پرنس البرٹ وکٹر نے رکھا تھا اور اسے رائے بہادر کنہیا لال نے سرگنگا رام کی سربراہی میں تعمیر کرایا اور اس کا نقشہ بھی انہوں نے خود بنایا تھا۔ اس اسکول کی عمارت اینگلو مُغل کے بہترین نمونے کے طور پر مال روڈ پر سامنے آئی۔ مارچ 1887 میں پنجاب کے پہلے لیفٹیننٹ گورنر ''لارنس'' کا مجسمہ لاہور ہائیکورٹ کے باہر نصب کیا گیا جس کے ایک ہاتھ میں قلم اور دوسرے میں تلوار تھی اور اس کے اوپر عبارت درج تھی کہ تمہارے اوپر حکومت قلم سے کی جائے یا تلوار سے۔

چند برسوں بعد مال روڈ پر ایک ایسی عمارت وجود میں آئی جس نے اپنے مخصوص طرز تعمیر کی وجہ سے اس عظیم شاہراہ کی خوب صورتی میں بے حد اضافہ کیا۔ یہ لاہور ہائی کورٹ کے سامنے مال روڈ اور میکلوڈ روڈ کے دہانے پر کیتھیڈرل کی عمارت تھی۔ اسکی تعمیر دس برسوں میں 1886 میں مکمل ہوئی۔ اس کے بانی تھامس ویلپی فرنچ تھے جو لاہور کے پہلے بشپ بھی تھے۔ اس کی شان و شوکت یورپ کے قدیم گرجا گروں جیسی ہے۔ 1889 سے 1894 تک کے پانچ برسوں کے دوران مال روڈ پر لاہور ہائیکورٹ، ٹاؤن ہال، ایچی سن کالج اور عجائب گھر کی تواریخی اور شان و شوکت والی عمارات وجود میں آئیں تو مال روڈ کی خوب صورتی اور اہمیت میں اور اضافہ ہوگی۔ ہائیکورٹ کی عظیم الشان عمارت اپنے نشان عدل کے ساتھ 1889 میں مکمل ہوئی۔ اسکا

ڈیزائن ماہرفن تعمیر مسٹر بروسنگٹن نے تیار کیا اور تعمیر مسٹر ہلٹن ایگزیکٹو انجینئر کی زیرنگرانی ہوئی۔ اس پر تین لاکھ اسی ہزار آٹھ سو سینتیس روپے صرف ہوئے۔ اس زمانے میں اسے چیف کورٹ کہا جاتا تھا۔ 1919 میں یہ ہائی کورٹ کہلانا شروع ہوئی۔ اس کے ایک برس بعد مال روڈ کے نکتہ آغاز پر ٹاؤن ہال کی تعمیر ہوئی۔ اس کی بنیاد 1887 میں سر چارلس ایچی سن لیفٹیننٹ گورنر پنجاب نے رکھی تھی۔ یہ سال ملکہ وکٹوریا کی پچاس سالہ جوبلی کا سال تھا۔ چنانچہ اسکا نام وکٹوریا جوبلی ہال رکھا گیا۔ فروری 1890 میں اس ہال کا رسمی افتتاح ڈیوک آف کلارنس نے کیا۔ اس پر ساٹھ ہزار روپے صرف ہوا تھا۔ گول باغ کے سامنے سرسبز لان میں جھانکتی ہوئی سُرخ اینٹوں کی اس عظیم عمارت نے مال روڈ کو خوب صورتی بخشنے میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ ایچی سن کی وسیع وعریض رقبے پر پھیلی ہوئی خوب صورت عمارت اسی برس یعنی 1890 میں گورنر ہاؤس کے ساتھ تعمیر ہوئی۔ اگرچہ ایچی سن کالج 1886 میں قائم ہوگیا تھا مگر اس کی عمارت چار سال بعد بنی۔ اس کا ڈیزائن میوسکول آف آرٹس کے وائس پرنسپل بھائی رام سنگھ اور ایس ایس جیکب انجینئر جے پور نے تیار کیا تھا یہ کالج راجوں، مہاراجوں اور نوابوں کے بچوں کی تعلیم وتربیت کے لیے بنایا گیا تھا۔ مال روڈ کا مجموعی ماحول اس اشرافیہ کے لیے بہت سازگار تھا۔ عام آدمی تو یہاں آتے ہوئے جھجکتا تھا۔ بیسویں صدی کی آخری دہائی میں تعمیر ہونے والی ایک عظیم الشان عمارت عجائب گھر کی ہے میوسکول آف آرٹس کے ساتھ اس عمارت کا سنگ بنیاد 3 فروری 1890 کو ملکہ وکٹوریا کے پوتے شہزادہ البرٹ وکٹر نے اپنے دورہ لاہور کے موقع پر رکھا۔ اس کا ڈیزائن بھائی رام سنگھ نے تیار کیا۔ یہ عظیم عمارت 1893 یں تکمیل کو پہنچی جب کہ 1894 میں عوام کے لیے کھولا گیا۔ اس منصوبے پر 1,15,000 روپے صرف ہوئے۔"

بیسویں صدی کے اختتام سے پہلے مال روڈ پر بینک اسکوائر کے قریب نیلا گنبد کے علاقے میں ایف سی کالج قائم ہوا تو مال روڈ کی رونق میں اور اضافہ ہوگیا۔ یہ کالج پادری چارلس ڈبلیو فورمین نے پہلے رنگ محل کے علاقے میں کھولا تھا۔ انہوں نے 1898 میں نیلا گنبد کے مشرق میں 16 ایکڑ 4 کنال زمین کالج کے لیے خریدی اور عمارات تعمیر کر کے ایف سی کالج کو رنگ محل سے یہاں منتقل کر لیا۔ اس کالج کو 1864 میں کھولا گیا تھا لیکن تین سال کے بعد اسے بند کر دیا گیا اور پھر 1886 میں فورمین کرسچن کالج کے نام سے جاری کیا گیا۔ 1920 کی دہائی تک یہ نیلا گنبد

اور مال روڈ پر وائی ایم سی اے کے درمیان والے علاقے میں جاری رہا۔ پھر یہ فیروز پور روڈ پر نہر کے کنارے موجودہ جگہ منتقل کر دیا گیا۔ مال روڈ کے قریب نیلا گنبد والی کالج کی جگہ فروخت کر دی گئی اور کالج مسمار کر دیا گیا، صرف ایک ایوینگ ہال باقی ہے۔ جو ڈائٹر جیمسن ایوینگ کی یاد میں تعمیر کیا گیا تھا۔ وہ ایف سی کالج کے شاہ سوار تھے اور پنجاب یونیورسٹی کے سات سال تک وائس چانسلر بھی رہے تھے۔

انیسویں صدی کا سورج غروب ہونے تک مال روڈ ایک تاریخی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔ محض عمارات کی وجہ سے نہیں اپنے مخصوص ماحول اور ثقافت کی وجہ سے بھی۔ کئی کاروباری دکانیں بھی وجود میں آ گئی تھیں۔ ان دکانوں میں ایک اہم دکان جیمز کریڈک (James Craddak) کی فوٹو گرافی کی تھی۔ وہ لاہور کے پہلے فوٹو گرافر ولیم بارتھولومیو (Bartholomew) کا اسسٹنٹ رہا تھا۔ ولیم بارتھولومیو نے 1849 میں لاہور میں اپنا پہلا اسٹوڈیو شاہی قلعہ میں قائم کیا تھا۔ بعدازاں موجودہ لوئر مال کے علاقے میں منتقل ہو گیا۔ اس کے انتقال کے بعد اس کا اسسٹنٹ جیمز کریڈک لاہور فوٹو گرافر بنا۔ وہ پہلا فوٹو گرافر تھا جس نے مال روڈ پر اپنی فوٹو گرافی کی دکان قائم کی۔ وہ پہلے ایسٹ انڈیا کمپنی اور پھر برٹش حکومت کا سرکاری فوٹو گرافر بھی رہا۔ 1861 میں ایک آئرش فوٹو گرافر ہنری برک نے پشاور میں فوٹو گرافی کا کام شروع کیا تھا۔ اس کی شاخیں راول پنڈی اور مری میں بھی تھیں۔ پھر وہ لاہور کے جیمز کریڈک کا برانچ منیجر بن گیا اور مشہور انگریزی ادیب اور صحافت رُڈیارڈ کپلنگ کی ترغیب پر لاہور آ گیا اور یہاں مال روڈ پر 1885 میں اس نے اپنے سٹوڈیو کی برانچ قائم کی۔ وہ سول اینڈ ملٹری گزٹ اخبار لاہور کا بھی فوٹو گرافر تھا۔ رفتہ رفتہ اس کی برانچ ترقی کرتی گئی اور یہ مرکز بن گئی چنانچہ وہ بیوی بچوں سمیت لاہور آ گیا۔ البتہ مری اور راول پنڈی میں بھی اس کے سٹوڈیو کام کرتے رہے۔ ہنری برک نے 1899 میں لاہور ہی میں انتقال کیا۔ اس کے بعد ڈبلیو بیکر (W. Baker) ایساچے (A. Sache) فریڈ بریمنر (Bremner) اور جیمز ریکالٹن (James Reckalton) جیسے فوٹو گرافر لاہور آئے اور اپنے فن میں شہرت حاصل کی۔

بیسویں صدی کا سورج طلوع ہونے تک مال روڈ اپنی خوب صورت عمارات اور پُرسکون ثقافتی و تعلیمی ماحول کی وجہ سے بہت اہمیت اختیار کر گئی تھی۔ اگلی دو تین دہائیوں

میں یونیورسٹی ہال (اولڈ کیمپس)، جنرل پوسٹ آفس، برٹش پویلین (ملکہ کا بُت)، سیکرڈ ہارٹ کیتھیڈرل، میسونک بلڈنگ اور پنجاب اسمبلی کی عمارات نے اس شاہراہ کو جدید عظمت و اہمیت بخش دی۔ پنجاب یونیورسٹی کی مرکزی عمارت جسے یونیورسٹی ہال بھی کہا جاتا ہے کا سنگ بنیاد 1905 میں رکھا گیا۔ اس کا ڈیزائن بھائی رام سنگھ نے رکھا۔ یہ اینگلو مُغل فن تعمیر کا ایک حسین شاہ کار ہے۔ اس کے گنبد اور کلاک ٹاور مال روڈ پر ہر آنے جانے والے کو اپنی طرف دیکھنے پر مجبور کرتے ہیں۔ جنرل پوسٹ آفس پہلے 1849 میں انارکلی کے علاقے میں عجائب گھر کے قریب واقع تھا۔ اس کے قریب ہی پوسٹ ماسٹر کا بنگلا تھا۔ 1912 میں موجودہ خوش نما جدید وضع کی عمارت تعمیر ہوئی۔ اس میں ایک کلاک ٹاور اور چار بُرجیاں بنائی گئیں جو مال روڈ سے گزرنے والوں کو پُرکشش تاثر بخشتے ہیں۔ مال روڈ پر ریگل سینما کے مخالف سمت ٹمپل روڈ اور لارنس روڈ کے چوک پر رومن کیتھولک کیتھیڈرل کی فلک بوس عمارت 1907 میں تعمیر ہوئی۔ اس کا سنگِ بنیاد اس کے بانی بشپ ڈاکٹر گاڈفری نے 1904 میں رکھا تھا۔ ڈاکٹر موصوف نے اسی سال میں انتقال کیا اور انہیں اس کی تکمیل دیکھنی نصیب نہ ہوئی۔ اس گرجا کی عمارت رومن طرز تعمیر کا نمونہ ہے۔ اس میں ایک بلند مینار، ایک وسیع گنبد اور چند چھوٹے مینار ہیں۔ یہ گرجا درحقیقت اپنی عظمت و شان کے لحاظ سے رُومہ کے بعض گرجوں کا مقابلہ کرسکتا ہے۔ یہیں 1892 سے سینٹ انتھونی اسکول قائم ہے۔ اس کے ستونوں کے لیے آگرہ سے سنگ سفید منگوایا گیا تھا۔ موجودہ اسٹیٹ بنک کے قریب بھی ایک گرجا گھر تعمیر ہوا۔ جو اپنی قدامت کے لحاظ سے آج بھی قابل ذکر ہے۔
چیئرنگ کراس کو ایک خوب صورت تعمیراتی شاہ کار بنائے جانے کا آغاز گنبد کی شکل کے برٹش پویلین سے ہوا جسے 1876 سے 1901 تک ہندوستان پر حکومت کرنے والی ملکہ وکٹوریہ کی تخت نشینی کی جوبلی کے موقع پر تعمیر کیا گیا۔ اس طرح برٹش پویلین کو چیئرنگ کراس کی پہلی عمارت بننے کا اعزاز حاصل ہوا۔ سنگ مرمر کی اس یادگار کا نقشہ میو سکول آف آرٹس کے اس وقت کے ڈپٹی پرنسپل بھائی رام سنگھ نے بنایا۔ 1900 میں ملکہ وکٹوریا کی موت سے پہلے اس کا کانسی کا مجسمہ لندن میں تراشا گیا اور اسے لاہور لاکر چیئرنگ کراس کے وسط میں نصب کیا گیا اور یہ مسلسل پچاس سال تک اس خطے پر انگریزوں کی حکم رانی کا اعلان کرتا رہا۔ یہ جگہ ''ملکہ کے بُت'' کے نام سے مشہور ہوگئی۔ 1951 میں یہاں سے بُت کو ہٹائے جانے کے کئی سال بعد تک بھی لوگ اس جگہ کو

اسی نام سے پکارتے تھے۔ برٹش پویلین کے قریب سڑک کے دوسری طرف فری میسن تنظیم کی طرف سے 1914 میں میسونک ٹیمپل کی تعمیر مکمل کی گئی۔ یہاں پہلے ایک چھوٹا سا باغ تھا جسے سرکلر گارڈن کہا جاتا تھا۔ اس عمارت کا نقشہ بیسل ایم سلیوان نے بنایا تھا۔ نامور انگریزی ادیب رُڈیارڈ کپلنگ اس تنظیم سے وابستہ تھے۔ عمارت شروع سے پُراسرار سرگرمیوں کا مرکز رہی اور کسی کو کچھ پتہ نہ چلتا کہ اندر کیا ہو رہا ہے۔ اسی وجہ سے اس کو بعض لوگ ''جادو گھر'' بھی کہتے۔ اسی عمارت کے بالکل سامنے کوئنز روڈ (موجودہ فاطمہ جناح روڈ) کے پار مال روڈ پر شاہ دین بلڈنگ 1916 میں وجود میں آ گئی۔ یہ عمارت پنجاب چیف کورٹ کے پہلے مسلمان جج اور آل انڈیا مسلم لیگ کے بانی رکن جسٹس شاہ دین کے نام سے منسوب ہوئی۔ ان عمارتوں کی تعمیر کے بعد چیئرنگ کراس کا علاقہ خوب صورت دکھائی دینے لگا۔ پھر 1935 کے ایکٹ کی منظوری کے بعد صوبہ پنجاب کی قانون ساز اسمبلی قائم ہوئی تو اسمبلی چیمبر کی عمارت اس چیئرنگ کراس کے علاقے میں ملکہ کے بت کے سامنے تعمیر کی گئی۔ 1935 میں اس ایوان کا سنگ بنیاد سر جوگندر سنگھ نے رکھا اور 1938 میں یہ تکمیل کو پہنچی۔ اس کا پہلا اجلاس 1939 میں ہوا۔ یہ عمارت انگریز دور کی عمارت میں اہم ترین عمارت ہے اور یہ فن تعمیر کا ایک شاہ کار بھی ہے۔ اس علاقے میں واپڈا ہاؤس اور الفلاح کی عمارتیں قیام پاکستان کے بعد وجود میں آئیں۔ اس زمانے میں واپڈا ہاؤس کی جگہ رائے میلا رام کی ملکیتی عمارات تھیں جن میں کچھ دفاتر، کچھ شوروم اور مشہور میٹرو ہوٹل تھے۔

انگریزی عہد میں جیسے جیسے جدید معاشی و معاشرتی اصلاحات کی جاتی رہیں، نئے نئے ادارے وجود میں آتے گئے، نئی نئی عالی شان عمارتیں بنتی چلی گئیں، جگہ جگہ ریلوے لائنیں اور سڑکیں بچھتی چلی گئیں، رسد گاہیں قائم ہوتی گئیں، ویسے ویسے ایک نیا معاشی خوش حال طبقہ بھی وجود میں آتا گیا۔ ان میں زیادہ تر ریلوے اور فوج کو مختلف اشیا کی فراہمی کے ٹھیکے داروں کا طبقہ تھا۔ معاشی وسائل کو بھی انگریزوں نے خوش حال بننے کے تمام تر مواقع فراہم کیے تھے۔ چنانچہ ایسے ہی طبقے کے لیے ابتداً مال روڈ پر غیر ملکی اشیا کی فروخت کے مراکز قائم ہوئے جن کے مالکان اکثر انگریز ہی ہوتے۔ پھر کچھ مقامی دولت مند افراد نے یہاں تجارتی اور رہائشی مقاصد کی عمارات کھڑی کرنا شروع کر دیں۔ شاہ دین بلڈنگ تو 1916 میں ہی وجود میں آ چکی تھی۔ اس کے بعد تجارتی غرض سے جو عمارات قائم ہوئیں ان میں غلام رسول بلڈنگ، بجاج بلڈنگ، ڈنگا سنگھ

بلڈنگ، گنگارام ٹرسٹ بلڈنگ، دیال سنگھ مینشن، شادی لال بلڈنگ جو پہلے لکشمی بلڈنگ کے نام سے مشہور تھی اور آج کل احمد مینشن کہلاتی ہے۔ کمرشل بلڈنگ، سول اینڈ ملٹری گزٹ بلڈنگ، دھونی چند بلڈنگ، داور بلڈنگ اور جودھالال کی بلڈنگ شامل ہیں۔ رائے میلا رام بلڈنگ، ای پلومر بلڈنگ اور نولنٹن مارکیٹ ان سے بہت پہلے سے موجود تھیں۔ زمان پلازہ، پینو راما شاپنگ سنٹر، نقی مارکیٹ، الفلاح اور واپڈا ہاؤس کے تجارتی مراکز پاکستان بننے کے بعد مختلف اوقات میں وجود میں آئے۔ ان میں سے اکثر پرانی عمارات کے ملبے پر قائم ہوئیں جن کا اب نام و نشان بھی نہیں ہے۔ ان تجارتی اور رہائشی عمارتوں کے قیام سے مال روڈ اشرافیہ کے لیے خرید و فروخت کا بہترین مقام بنتا چلا گیا۔ یہاں عام افراد خریداری کے لیے نہیں آتے تھے کیوں کہ بڑے بڑے جدید سٹوروں پر غیر ملکی اشیا کی قیمتیں ان کی پہنچ سے بہت باہر تھیں۔ ابتداً اکثر سٹوروں کے مالکان انگریز ہی ہوتے جنھوں نے اپنی اشیا کی فروخت کے لیے سیلس گرل اس زمانے میں بھی رکھی ہوئی تھیں اور جو ہمارے مقامی رؤساء اور اشراف کے لیے بہت پُر کشش ہوتی تھیں۔ مال روڈ نے اپنے جدید سٹوروں کے ذریعے مقامی لوگوں کو نئی نئی ایجادات سے بھی روشناس کرایا اور لندن کے اندر بکنے اور بننے والی تقریباً ہر چیز یہاں فروخت ہونے کے لیے لائی جاتی۔ اس سے برطانوی تاجروں، صنعت کاروں اور درآمد برآمد سے وابستہ افراد کو بھی بہت زیادہ مالی فائدہ پہنچتا۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد مال روڈ پر تیزی سے تجارتی دکانیں کھلنا شروع ہوئیں۔ مال روڈ سے مشرقی سمت کی طرف آئیں تو ریگل چوک کے آس پاس مختلف طرح کے اسٹور وجود میں آ گئے تھے۔ ریگل چوک کے بائیں جانب رینکن سٹور، سول اینڈ ملٹری ٹیلرز اینڈ آؤٹ فٹرز تھے۔ اسی جگہ بعد ازاں سول اینڈ ملٹری پریس قائم ہوا اور اخبار بھی جاری ہوا۔ شراب کی فروخت کی دکان کٹلر پالمر اینڈ کمپنی، سمتھ اینڈ کیمبل کیمسٹس کی دکانیں وجود میں آئیں۔ اس کے بعد قائم ہونے والی تجارتی دکانوں میں رچرڈز اینڈ کمپنی، اسلحہ کی فروخت کی والٹر لوک اینڈ کمپنی اور پیانو ڈیلر مسٹر جے ڈی بیون تھیں۔ سڑک کے دائیں جانب سگریٹ کی فروخت کے ڈیلر ورکا ڈوس، ہیئر ڈریسر ہیگ مین، عینک ساز ادارہ پرنس ایڈورڈ اینڈ کمپنی، فوٹو گرافر فریڈ بریمنز اینڈ کمپنی، اس کے بعد سیوائے (Savoy) ہوٹل اور سٹفلز (بیکری و ہوٹل) تھے۔ اس سے آگے سی سٹریٹ

(C.Steirt) اینڈ کمپنی جو میوزک سیلون تھا اور آخر پر جیولری اور گھڑیوں کی فروخت کا ادارہ میکس منک (Max Minck) اینڈ کمپنی تھی جواب گولڈ سمتھس انڈ کمپنی کے نام سے مشہور ہیں۔

جوں جوں وقت گزرتا چلا گیا مال روڈ کی رونق بڑھتی چلی گئی مگر اس کی صفائی سُتھرائی کا پورا پورا خیال رکھا جاتا، دو وقت سڑک پر پانی کا چھڑکاؤ ہوتا اور اسے گرم موسم میں ٹھنڈا رکھنے کی سعی کی جاتی اسی وجہ سے اسے لوگ ''ٹھنڈی سڑک'' کے نام سے پکارتے۔ وہ درخت جو 1851 میں مال روڈ کی تعمیر سے پہلے کے تھے قد وقامت کے لحاظ سے بہت بلند اور گھنے ہو کر سڑک پر سایہ دار شجر بن گئے تھے۔ جو بعد میں لگائے گئے وہ بھی اب جوان ہو کر تن آور ہو چلے تھے۔ پیپل کے درختوں کے پتے پر جب سورج کی کرنیں چڑتیں تو وہ چاندی کی طرح چمکتے۔ لوگوں کے لیے یہ شاہ راہ ایک مکمل سیر گاہ بن چکی تھی۔ وہ خوش گوار احساس حاصل کرنے کے لیے اس پُرسکون سڑک پر ٹہلنے کے لیے آجاتے، بالخصوص دانشوروں، طالب علموں، شاعروں، ادیبوں، پروفیسروں اور وکیلوں کے لیے تو یہ شاہ راہ جنت بن گئی تھی۔ بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں چائے کے متعارف ہونے کے بعد مال روڈ پر کئی ریستوران قائم ہوئے جو رفتہ رفتہ اپنی بہترین چائے کے لیے پہچانے جانے لگے۔ پران نوائل نے ''جب لاہور جوان تھا'' کے عنوان سے اپنی یادداشتوں میں لکھا ہے!

اگرچہ چائے اس وقت مشروبات میں شامل ہو چکی تھی لیکن ابھی تک اس کے قدم نہیں جمے تھے۔ یہ عام طور پر بیماری میں طبی مشورے کے مطابق دودھ کی جگہ استعمال کی جاتی تھی۔ تیس کی دہائی کے دوران انڈین ٹی مارکیٹ ایکسٹینشن بورڈ نے چائے کو مقبول بنانے کے لیے ایک زبردست مہم چلائی۔ لاہور کے بازاروں اور گلیوں میں نمایاں جگہوں پر موبائل ٹی سٹال بنائے گئے جس میں چائے کی تیاری کا عملی مظاہرہ پیش کیا جاتا۔ چائے کے گرما گرم کپ مفت تقسیم کیے جاتے۔ اس کے بعد چائے کا ایک چھوٹا پیکٹ مارکیٹ میں متعارف کرایا گیا۔ جس کی قیمت صرف ایک پیسہ تھی۔ جلدی ہی چینی کے برتنوں میں چائے پینا جوان نسل میں فیشن بن گیا۔ اس کے بعد کافی بورڈ کی باری آئی کہ وہ کافی پینے کو فروغ دینے کے لیے مہم چلائیں۔ تاہم کافی کو چائے جیسی مقبولیت نہ مل سکی۔ اس کا پینے والا طبقہ طالب علموں، اساتذہ اور دانش وران تک محدود رہا جو 1940ء کے لگ بھگ مال روڈ پر کھُلنے والے کافی ہاؤس میں اکثر جاتے تھے۔

ریستوران میں جانا تیس کی دہائی تک متوسط طبقہ کے گھروں میں معیوب سمجھا جاتا تھا۔ ریستوران میں جانے والوں کے متعلق یہ تصور تھا کہ یہ لوگ شراب پیتے اور گوشت اور مچھلی کھاتے ہیں۔ ان کو شرابی کبابی کہا جاتا تھا۔ مال روڈ کے ریستوران لورنگ اور سٹفلن میں بڑی شان دار باریں تھیں اور عام طور پر ایک مخصوص طبقہ کی آمدورفت تھی۔ ان ریستورانوں میں صرف مغربی کھانے ہی پیش کیے جاتے تھے۔ ٹیپلٹز (Teplitz) جو مال روڈ پر واقع تھا اپنی ومٹو کے لیے بہت مشہور تھا جو بڑے بڑے ریستورانوں میں پیش کی جاتی تھی۔ ان کی سرپرستی ''صاحب'' اور ایک مخصوص طبقہ کرتا تھا۔ ملک شیک تیس کی دہائی کے آخر تک جب ناہر سنگھ نے گورنمنٹ کالج میں پہلی مِلک شیک بار قائم کی، غیر معروف رہا، جلدی اس کی پیروی مال روڈ پر یونیورسٹی ہال کے سامنے میونسپل بلڈنگ میں ایک اور دکان کھل گئی۔ اسی دوران سنگترے اور انار کا تازہ جوس بیچنے والی دکانوں کی مقبولیت میں بہت زیادہ اضافہ ہوا۔

اس عرصے میں مال روڈ پر ایک نیا سماجی ثقافتی ماحول بنتا چلا گیا۔ اشرافیہ کی تفریح طبع کے لیے نیڈوز، میٹرو، الفنسٹن، سٹینڈرڈ، لوریگ اور الیزم کے ناموں کے ریستوران اور ہوٹل وجود میں آ چکے تھے۔ جب فلم انڈسٹری نے لاہور میں اپنی جڑیں قائم کیں، تو ہیرا منڈی نئے ستاروں، گلوکاروں اور ڈانسروں کی بھرتی کے مرکز کے طور پر اُبھری۔ ان میں سے کئی آنے والے سالوں میں نمایاں شخصیات کے طور پر سامنے آئیں۔ کئی ایک نے گانے اور اداکاری میں ملک گیر شہرت حاصل کی۔ چالیس کی دہائی میں ہیرا منڈی جانے والا ایک نیا طبقہ سامنے آیا۔ ان میں برے بڑے ٹھیکیدار، کاروباری اور سوداگر شامل تھے۔ جو بڑی بڑی رقمیں کما رہے تھے۔ ان چاہنے والوں نے ایک نیا تصور پیدا کیا اور ہیرا منڈی کے مکین ان کی ضروریات پوری کرنے کے لیے شہر کے دوسرے حصوں میں بھی پھیل گئے۔ اس بڑھتے ہوئے رجحان سے کال گرلز کا ادارہ وجود میں آیا۔ یہ لڑکیاں ہوٹلوں اور دوسری پرائیویٹ جگہوں پر گاہکوں کو تفریح فراہم کرنے کے لیے جاتیں۔ تاہم ہیرا منڈی بھی قائم رہی اور اس کا سبب قریبی شہر امرتسر کے بااثر ہندو لالے بنے۔ ان کے خرچ کرنے کی استطاعت لاہوریوں یا پنجاب کی زمیندار اشرافیہ کے برابر نہ تھی جو ابھی تک سماجی منظر میں نمایاں حیثیت کے حامل تھے۔ مغربی پنجاب کے کئی زمیندار لیجسلیٹو اسمبلی کے ممبر تھے۔ جب وہ اجلاس میں شریک ہونے کے لیے لاہور آتے تو ہیرا منڈی میں

چہل پہل ہو جاتی۔ لیکن اب امرتسریے ان سے آگے نکل گئے تھے۔ وہ اپنی فورڈ، شیورلیٹ، پونیٹاک، پیکارڈ گاڑیوں میں سوار ہو کر آتے۔ لاہور کے اعلیٰ ریستوران سٹفلس، ایلفنسٹن، یا مال روڈ کے سٹینڈرڈ ریسٹورنٹ میں کھاتے پیتے اور شام کو رنگین بنانے کے لیے ہیرامنڈی کا رُخ کرتے۔ وہ یہاں کی حسیناؤں کی اس فیاضی سے سرپرستی کرتے کہ لاہوری ان کی شاہ خرچیاں دیکھ کر مبہوت ہو جاتے۔'' بے شک مال روڈ پر قائم ریستوران اور ہوٹل جسم فروشی کے اڈے نہ تھے البتہ میٹرو، سٹینڈرڈ اور کچھ دوسرے ریستورانوں میں ڈانسرز ڈانس ضرور کیا کرتی تھیں۔ میٹرو کی ڈانسر انجلینا نے تو بہت دھوم مچائی تھی۔ سٹینڈرڈ کا کام ذرا نرم پڑا تو ہیرامنڈی سے نچلے درجے کی طوائفوں کو لا کر نچوانا شروع کر دیا اور بالآخر اس کا کام یوں ٹھپ ہوا کہ ریستوران ہی نہ رہا۔ اس دور کے مال روڈ کی شاید یہی خوبی تھی کہ وہ کسی بھی کام میں گراوٹ کو قبول نہیں کر سکتی تھی۔

جہاں تک مال روڈ کی خوب صورتی کا تعلق ہے تو اس کو برقرار رکھنے کے لیے ابتدا سے ہی سرکاری حکام نے توجہ دی تھی۔ ہر وقت جھاڑو لیے خاکروب موجود رہتے اور ماشکی مشکیں اُٹھائے پانی کا چھڑکاؤ کرتے رہتے۔ روزانہ دو وقت باقاعدگی سے چھڑکاؤ کیا جاتا۔ کئی مقامات پر بڑے منہ والے نلکے بھی لگے ہوئے تھے۔ وہ شیر کے منہ جیسے تھے۔ اس سے پانی بڑی موٹی دھار کا نکلتا تھا انہیں سرکاری نلکے کہتے تھے۔ بعد میں لاہور میونسپل کمیٹی نے گاڑی خرید لی۔ یہ گاڑی سویرے سویرے مال روڈ پر آتی تھی۔ سڑک صاف کرنے کے لیے اس گاڑی کے دونوں طرف بروشے لگے ہوئے تھے۔ وہ صاف کرتے گندگی ایک طرف پھینکتی جاتی تھی۔ دوسری طرف صفائی والے کارکن اسے صاف کرتے جاتے تھے۔ پھر پانی کے چھڑکاؤ والی گاڑی آتی تھی۔ جہاں گاڑی نہیں جا سکتی تھی ماشکی چھڑکاؤ کرتے تھے۔ ان دنوں موٹریں نہ ہونے کے برابر تھیں۔ مال روڈ پر زیادہ تر تانگے چلتے تھے۔ ان تانگوں کے لیے سختی سے حکم تھا کہ گھوڑے کے پیچھے تھیلا باندھ کے رکھو تا کہ گھوڑا لید کرے تو تھیلے میں گرے۔ مال اوڈ کے اوپر گندگی نہ پھیلے۔ کھانے کے وقت گھوڑے کے منہ پر توبڑا باندھ دیتے تھے تا کہ کھاتے وقت دانے باہر نہ گریں۔ بہت صفائی رکھتے تھے۔ پون صدی قبل دراصل مال روڈ سیر گاہ تھی، اسے انارکلی بنا دیا گیا۔ مال روڈ پر شام کے بعد روشنی کا انتظام بھی سرکاری طور پر کیا جاتا تھا۔ لاہور میں بجلی 1913 میں آئی تھی اور مال روڈ پر تو اور بعد میں آئی۔ بجلی سے پہلے لالٹینوں کے ذریعے مال روڈ کو روشن رکھا جاتا تھا۔ میونسپل کمیٹی

علاقے (Beets) بناتی تھیں لیمپس جلانے کی۔ ہر ایک بیٹ کا ٹھیکے دار ہوتا تھا۔ مال روڈ کی بیٹ کا ٹھیکے دار تیس کی دہائی میں مولا لالٹین والا تھا۔ اس وقت یہ تھا کہ کھمبے کے ساتھ شیشے کا کوارڈ ینگر (چوکور شکل میں) ہوتا تھا۔ اس کے وسط میں چمنی۔ شام کے وقت ایک آدمی کندھے پر سیڑھی رکھے بھاگتا چلا جاتا تھا۔ کھمبے کے ساتھ سیڑھی لگائی اور چڑھا، چمنی صاف کی، اس میں جلنے والی بتی کو کاٹ چھانٹ کر درست کیا، نیچے اُترا، سیڑھی پھر کندھے پر رکھی اور اگلے کھمبے کی طرف بھاگ گیا۔ اس کے پیچھے ایک دوسرا شخص کندھے پر سیڑھی رکھے آجاتا۔ اس نے لیمپ میں مٹی کا تیل بھرنا اور اگلے لیمپ پوسٹ کی طرف بھاگ جانا، اخیر میں ایک مشعل بردار آتا وہ ان لیمپوں کو جلاتا چلا جاتا۔ مولا لالٹین اس لیے مشہور ہوگیا کہ وہ سورج نکلنے سے پہلے ہی جا کے سارے لیمپوں میں سے مٹی کا تیل نکال لاتا تھا۔ اس میں تھوڑا اور ملا کے پھر وہی ڈال دیتا۔ وہ اس لیے کہ اسے فی لیمپ کے پیسے ملتے تھے۔ اس کے بعد کاربائٹ آگیا۔ اس میں سفید سی لائٹ نکلتی ہے۔ کاربائٹ میں پانی ڈالو تو گیس نکلتی ہے۔ اسے آگ لگ جاتی ہے۔ پھر انگریزوں نے لیمپوں کو کاربائٹ سسٹم کے تحت جاری کیا۔ کاربائٹ کے لگائے ہوئے لیمپ میں بال کی طرح کا باریک سوراخ ہوتا تھا۔ کاربائٹ کا سسٹم جاری ہوا تو ٹھیکا کسی اور کو مل گیا۔ طریقہ کار وہی رہا۔ صرف یہ تبدیلی آئی کہ مٹی کا تیل ڈالنے کی جگہ وہ شخص ہر لیمپ میں کیلشیم کاربائٹ ڈالتا جاتا اور اس کے بعد ایک دوسرا آدمی اس پر پانی ڈالتا جاتا۔ تیسرا آدمی اسی طرح مشعل کے ساتھ چلا آتا۔ اس کے بعد بجلی آگئی پھر انہوں نے اُوپر شیڈز اور ان میں بلب لگا کے انہیں بجلی کے لیمپس میں تبدیل کیا۔ ہر کھمبے کے ساتھ ایک سوئچ ہوتا تھا۔ مقررہ وقت پر ایک آدمی نے بھاگے بھاگے آنا، سوئچ آن کرتے چلے جانا، صبح پھر سوئچ بند کرتے چلے جانا۔ یہ بلب ایک مین سوئچ کے ساتھ منسلک کردیئے گئے۔ اب بھی یہی طریقہ چل رہا ہے۔ ایک قدیم کھمبا وائی ایم سی اے کی عمارت کے پاس تھا جو اب تک ہے۔

جہاں تک مال روڈ پر چلنے والی سواری کا تعلق ہے تو ابتدا میں جب موٹر کاریں نہیں ہوتی تھیں لوگ تانگے، بگھیوں یا وکٹوریا پر سفر کرتے تھے یا پھر سائیکل پر۔ سائیکل ایک ایسی سواری تھی جسے چھوٹے بڑے سبھی استعمال کرتے تھے۔ سب سے اچھی سائیکل اس زمانے میں ''ریلے'' کی تھی۔ اس کے ساتھ ڈائنمو لائٹ اور نمبروں والا تالا لگا ہوتا تھا اور اس زمانے میں یہ ساٹھ روپے

میں مل جاتی تھی۔ دوسرے مقبول برانڈ بی ایس اے، ہرکولیس، فلپس اور ایسٹرن سٹار کی قیمتیں چالیس سے پچاس روپے تک کی تھیں۔ 1935 میں جاپان نے ہندوستانی مارکیٹ میں ایک سائیکل متعارف کرائی جس کی قیمت صرف انیس روپے تھی۔ سائیکل پر ڈبل سواری کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ خلاف ورزی کرنے والوں کا چالان کیا جاتا اور انہیں عدالت کے رُو برو پیش ہوکر دو روپے جرمانہ ادا کرنا پڑتا تھا۔ رات کو لیمپ کے بغیر سواری کرنے والے کو بھی جرمانہ کی سزا دی جاتی تھی۔ اکثر اوقات پکڑے جانے والے طلبا غلط نام اور پتا بتا دیتے اور عدالت میں حاضر نہ ہوتے۔ شروع شروع میں روشنی کے لیے سائیکلوں کے ساتھ لیمپ لٹکائے جاتے، پھر ہینڈل کے ساتھ جہاں تیل کا لیمپ لگتا تھا وہیں یہ بیٹری لگائی جانے لگی۔ اس کے بعد ڈائنمو آئی۔ مال روڈ پر چیئرنگ کراس میں ایک راڈ پر پٹی لگی ہوتی تھی اس پر لائٹنگ ٹائم لکھا ہوتا تھا۔ ہر سینما کے باہر لکھا ہوتا تھا لیمپ اور پمپ کے ہم ذمہ دار نہیں۔ سائیکل سٹینڈ پر سائیکل کھڑی کرنے کا دو پیسہ کرایہ ہوتا تھا۔ لوگ پھر لیمپ اور پمپ اُتار کر ہال میں ساتھ لے جاتے تھے۔ مال روڈ کے ریگل سینما کے سائیکل سٹینڈ پر بھی یہی رواج تھا۔ پاکستان بننے کے بعد ایک مہاجر عورت بائیسکل رکشا چلاتی تھی۔ وہ مال روڈ پر واحد بائیسکل رکشا تھا۔ صرف بچوں اور عورتوں کی سواریاں لیتی تھی۔

دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں کالج میں داخل ہونے والی لڑکیوں کی تعداد میں اضافہ ہونا شروع ہوا۔ گورنمنٹ کالج کے مقابلے کا لاہور کالج برائے خواتین اور خواتین کے دوسرے کالجوں میں جنگ کے سالوں کے دوران طالبات کی تعداد دوگنا ہوگئی۔ اس سے لڑکیوں کو نئی آزادی ملی اور لڑکیاں گروپس کی صورت میں ننگے سر اور دوپٹا کندھوں پر ڈالے مال روڈ پر سائیکلیں چلاتی نظر آنے لگیں۔ وہ ہفتہ اور اتوار کو سہ پہر کے شو پر انگریزی فلمیں دیکھنے سینما گھروں میں بھی جانے لگیں۔ مال روڈ کے ریگل سینما میں شروع سے صرف انگریزی فلمیں ہی دکھائی جاتی تھیں۔ اس لیے یہاں بھی فلم کے شو کے وقت لڑکیوں کی رونق دکھائی دیتی۔ موٹر کاروں کی مقبولیت سے پہلے کھاتے پیتے لاہوریے اپنے ذاتی پرتکلف تانگے رکھتے تھے جو دل کش پوشش اور پیتل کے فیتوں سے مرصع ہوتے تھے۔ جو زیادہ امیر تھے ان کے پاس بگھیاں اور وکٹوریا تھیں۔ یہ چار پہیوں والی سواری تھی جس کی چھت تہہ کی جا سکتی تھی۔ اس میں سے بعض کو دو گھوڑے کھینچتے تھے۔ بگھی ہی کی ایک اور قسم فٹن تھی۔ یہ ایک ڈبا نما سواری تھی جس میں ایک دروازہ

اور ایک کھڑکی بھی ہوتی تھی۔ان سواریوں کے بعض متمول مالکان نے رکاب دار بھی رکھے ہوئے تھے جو سواری کے عقبی حصے میں ایک پائیدان پر کھڑے رہتے تھے۔ مال روڈ پر یہ تمام سواریاں عام دیکھی جاسکتی تھیں۔

تیس کی دہائی کے وسط تک ان میں سے کئی پُر آسائش سواریاں ختم ہوگئیں اور ان کی جگہ موٹر کاروں نے لے لی۔ موٹر رکھنا اب ایک فیشن بن گیا۔اندرون شہر رہنے والے متمول طبقہ نے تانگے اور وکٹوریا کا استعمال جاری رکھا۔انگریز حکام اور اشراف نے اب تیزی کے ساتھ موٹر گاڑیاں خریدنا شروع کردیں۔شروع شروع میں تو گاڑیاں بہت کم ہوتی تھیں۔ پانچ گاڑیاں تھیں جو مال روڈ پر اکثر نظر آتیں۔ان میں سے ایک گاڑی انسپکٹرلیس آف سکول کی ملکیت بھی جو انگریز تھی اور اسے یہ گاڑی 1928 میں جہیز میں ملی تھی۔ یہ مورس کمپنی کی تھی اور اس کے اُوپر کپڑا لگا ہوتا تھا۔ وہ خود ہی ڈرائیو کرتی تھی،ٹولنٹن مارکیٹ سودا لینے آتی تھی۔ پیچھے اس کے کیرئیر بھی رتھا۔ خانساماں پگڑی والا بیٹھا ہوتا تھا۔ 1970 کے قریب اس کا ماڈل ٹاؤن میں انتقال ہوا۔ دوسری گاڑی میونسپل کارپوریشن کے انجینئر کی تھی۔ وہ انڈین تھا۔اس کی گاڑی بھی اسی طرح کی تھی۔ ایک ڈاکٹر مراجکر کی گاڑی تھی جو سُرخ رنگ کی تھی۔اس کی چھت کینوس کی تھی۔ مراجکر پارسی تھا اور میوہسپتال میں بڑا زبردست سرجن تھا۔اس نے مہاراجا پٹیالہ کا وہاں جا کے کامیاب آپریشن کیا تھا۔جب مہاراجا صحت یاب ہوگیا تو اس نے اسے وہ گاڑی تحفہ میں دی تھی۔ ورنہ وہ پہلے مال بائیسکل پر ہی آتا تھا۔ یہ 1930 کے عرصے کی بات ہے جب اس کی گاڑی مال روڈ پر آیا کرتی تھی۔اس کی کار سپورٹس ٹائپ تھی۔ایک گاڑی میاں افتخار الدین کے پاس ہوتی تھی۔لعل دین قیصر، عبدالعزیز مالواڑہ، میاں وحید اور چوہدری غلام رسول کے پاس بھی اپنی اپنی گاڑیاں ہوتی تھیں۔ایک سرکاری گاڑی کمشنر اور ایک ڈپٹی کمشنر کے پاس بھی ہوتی تھی۔ڈپٹی کمشنر بعض اوقات سائیکل یا گھوڑے پر بھی جاتا تھا۔اس نے نِکر پہنی ہوتی تھی اور ساتھ کوئی عملہ نہیں ہوتا تھا۔ موٹر کاروں کے بعد موٹر سائیکلیں آئیں لیکن صرف چند مہم پسند اور امیر نوجوانوں نے ہی اُسے خریدا۔سات آٹھ نوجوان لڑکوں کے گروپ ہرکولیس سائیکلوں پر بیٹھ کر شام کے وقت مال روڈ کی سیر کرنے آیا کرتے تھے۔ایک موٹر سائیکل اس کے ساتھ منسلک ہونے والی سائیڈ کار اینگلو انڈین جوڑوں میں بہت مقبول ہوئی۔ پولیس سارجنٹ زیادہ تر اینگلو انڈین تھے،انہیں طاقتور انگلش موٹر

سائیکلیں فراہم کی گئی تھیں۔ وہ مال روڈ پر دوڑتے رہتے۔ ان کا برانڈ نیم انڈین تھا۔ وہ مقامی پولیس کے کاموں کی نگرانی کرتے تھے۔ 1945 کے لگ بھگ مال روڈ پر اومنی بسیں بھی چلنی شروع ہوگئیں۔ قیام پاکستان کے بعد 1951 میں لاہور اومنی بس والوں نے ڈبل ڈیکر بسیں بھی چلائیں جو کئی برسوں تک لاہور کی شاہراؤں پر چلتی رہیں۔ لاہور میں سب سے پہلی ڈبل ڈیکر بس کی نمائش مال روڈ کے چیئرنگ کراس پر 2 ستمبر 1951 کو کی گئی تھی۔ لطیفہ ہوگیا تین چار دوست تھے۔ انہوں نے کہا، اوپر کی منزل پر بیٹھتے ہیں، وہاں ہوا بھی ہوگی، گئے تو ایک کہتا ہے، یار یہاں تو ڈرائیور ہی نہیں، یہ نہ ہو کہ نیچے سے بس نکل جائے اور ہم اوپر بیٹھے رہ جائیں۔ اب تو مال روڈ پر ہر طرح کی موٹر کاریں ہی نظر آتی ہیں۔

1947 سے کچھ برس پہلے مال روڈ مکمل سماجی ماحول سے بھرپور شاہ راہ کا رُوپ دھار چکی تھی۔ تاریخی عمارات، تجارتی مراکز، جگہ جگہ جھولتے ہوئے سرسبز درخت، صاف ستھرا ماحول، قدیم و جدید ریستوران اور باغات کلب، عبادت گاہیں درس گاہیں سب کچھ تو اس پر موجود تھا۔ اس وقت کے ماحول کا جائزہ لیتے ہوئے ہم دیکھتے ہیں کہ زم زمہ توپ کے قریب ہی آزادی کے عظیم مجاہد لالہ لال چپت رائے جو شیر پنجاب کے نام سے مشہور تھے کا مجسمہ نصب تھا۔ لالہ لاجپت رائے اپنے وقت کے شاید سب سے فصیح البیان مقرر تھے۔ ان کا انتقال پولیس کے ہاتھوں لاٹھی چارج کے نتیجے میں لگنے والے زخموں کے باعث 1928 میں ہوا۔ اس منظر کو زینت بخشنے والا ایک اور مجسمہ پنجاب کے ایک اور سپوت سر گنگا رام کا تھا۔ گنگا رام ایک عظیم انسان دوست شخص تھے۔ انہوں نے کئی خوب صورت عمارتیں، جدید ہسپتال اور عمدہ سکول دیے۔ اب یہ دونوں مجسمے یہاں موجود نہیں ہیں۔ مال روڈ پر وولنر، لارنس اور ملکہ وکٹوریا کے بُت بھی قیام پاکستان سے پہلے تک نصب تھے۔ سب مٹا دیئے گئے سوائے وولنر کے مجسمے کے۔ لاہور کے ایک ہندو صحافی سنتوش کمار جو 1947 میں تقسیم کے وقت نقل مکانی کر کے بھارت چلے گئے تھے۔ کچھ برسوں بعد لاہور آئے۔ اپنی یادوں کو ''لاہور نامہ'' کی صورت میں محفوظ کیا۔ اس میں لکھتے ہیں:

> ''ضلع کچہری اور گورنمنٹ کالج کے درمیان لوئر مال سے گزرتا ہوا گول باغ پار کرتا ہوا عجائب گھر کے باہر بھنگیوں کی توپ تک آ پہنچا۔ بائیں طرف یونیورسٹی کے باہر علم الہند وولنر کا مجسمہ کھڑا ہے۔ بس لاہور میں اب ایک مجسمہ ہے۔

بُت شکنوں کی دست بُرد سے بچ نکلا ہے۔شاید اس لیے کہ اہلِ کتاب کا ہے۔''

انارکلی چوک میں پہنچنے سے قبل دائیں ہاتھ ایک پُرانی طرز کی عمارت جسے میونسپل یا ٹولنٹن مارکیٹ کہتے ہیں۔اب یہاں ہیریٹیج میوزیم قائم کر دیا گیا ہے۔یہ 1864 میں پنجاب کی پہلی نمایش کے لیے تعمیر ہوئی۔گول باغ سے لے کر انارکلی چوک تک مال روڈ کا یہ حصہ اسی وجہ سے ایگزیبیشن روڈ کہلاتا تھا۔ٹولنٹن مارکیٹ میں کھانے پینے کی اشیا کی چند دکانیں موجود تھیں۔ایک قدیم دکان ایم فیروز دین اینڈ سنز کے نام سے فوٹوگرافی کی بھی تھی۔یہ 86-1885 سے چلی آرہی تھی۔اس کی نکڑ پر کتابوں اور اخبارات کی دکان ہوتی تھی۔اس کے مالک کا نام شفیع تھا۔ یہاں سے تمام اخبارات مل جایا کرتے تھے۔قیام پاکستان کے بعد تک بھی یہ دکان موجود رہی۔ قیام پاکستان کے فوری بعد اخبار کی پندرہ سو کاپیاں دہلی جاتی تھیں اور دہلی سے ایک ہندو اخبار کی اتنی کاپیاں اس کے عوض میں آتی تھیں۔اس وقت دونوں اخباروں کی قیمت دو دو آنے تھی۔ حالاں کہ پاکستانی اخبار کو دہلی میں اڑھائی روپے اور ہندوستانی اخبار کو لاہور میں 1.1/2 آنے میں بکنا چاہیے تھا کیوں کہ اس وقت پاکستانی روپے کی قدر بھارتی روپے کے مقابلے میں 44 فیصد تھی۔لیکن ایسا اس لیے نہ ہو سکا تھا کہ ہندو اخبار کی ایجنسی بھی اس مسلمان اخبار کے مالکوں نے اپنی ہی ملازم کو دلوا رکھی تھی اور وہ خوب منافع کما رہے تھے۔یہی حال ان دنوں کتب کا بھی تھا جو ہندوستان سے یہاں آکر بجائے سستی کے مہنگے داموں فرخت ہوتی تھیں۔

ٹولنٹن مارکیٹ میں ہی ایوب دور میں جب اس کے خلاف ایجی ٹیشن چل رہی تھی، ایک روز احتجاجی جلوس میں آغا شورش کاشمیری اور مولانا کوثر نیازی میں ہاتھا پائی ہوگئی۔پیپلز پارٹی کا ایک جلوس وہاں آکے رُکا۔کوثر نیازی کا گریبان پھٹا ہوا تھا۔ٹوپی انہوں نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی تھی۔مال روڈ پر جی پی او کے باہر راہ میں ایک لیمپ پوسٹ تھی۔اسی لیمپ تلے انہوں نے مختصر تقریر کی کہ انہوں نے کبھی اپنا سر ننگا اور گریبان کھُلا نہیں رکھا ''لیکن آج سامراج کے ایک پالتو ایجنٹ نے مجھ پر حملہ کر کے میرا گریبان چاک کر دیا ہے۔''ٹولنٹن مارکیٹ سے مال روڈ میں خم آتا ہے اور اس سے آگے شہر کا عالی شان حصہ شروع ہو جاتا ہے۔دائیں طرف کمرشل بلڈنگ ہے۔جہاں 1947 سے پہلے بھی اسباب سے لدی دُکانوں کی ایک قطار تھی اور اب بھی ہے۔ مال روڈ پر کمرشل بلڈنگ کی پرانی انارکلی والی نکڑ پر شراب کی مشہور دکان ڈی پی ایڈل جی تھی۔

یہاں سے ہر قسم کی بیئر دستیاب ہو جاتی تھی۔ اس کے مالک پارسی بھنڈارا تھے۔ ان کا بیٹا ایم پی بھنڈارا ممبر قومی اسمبلی بھی رہا۔ مشہور افسانہ نگار سعادت حسن منٹو جو شراب کے خاصے رسیا تھے۔ ان کی نشست کمرشل بلڈنگ میں ایک دکان کے عقبی کمرے میں بھی لگا کرتی۔ ایک مرتبہ چینیز لنچ ہوم میں ایڈل جی وائن شاپ کے ایک پُرانے ملازم سے منٹو کی ہاتھا پائی بھی ہو گئی تھی۔ مداحین نے فوراً ان کو اپنی حفاظت میں لے کر معاملہ رفع دفع کرایا تھا۔ اسی مارکیٹ کے دوسرے کونے پر جہاں سے دائیں طرف میکلیگن روڈ شروع ہوتا ہے کہ ایل مہرا کا بڑا سا ہورڈنگ بورڈ دکھائی دیتا تھا۔ یہ مشہور بزاز اور درزی اگرچہ گونگا تھا لیکن ٹیلرنگ میں اپنی مہارت کی بدولت لاہور کی اشرافیہ اس کی مرہون منت تھی۔ کمرشل مارکیٹ کے مدمقابل یعنی دائیں طرف مشہور انڈین کافی شاپ تھی جو کئی برس تک طالب علموں، اساتذہ اور مقامی دانش وروں بالخصوص بائیں بازو سے تعلق رکھنے والوں کی آماجگاہ رہی۔ قیام پاکستان کے بعد یہ انڈین کافی شاپ کی بجائے پاک کافی شاپ بن گئی تھی پھر ایک وقت آیا کہ یہ کافی شاپ بند ہو گئی اور اس کی جگہ کچھ فاصلے پر مال روڈ پر پاک ٹی ہاؤس نے لے لی۔ انڈین کافی شاپ کے ساتھ ''چیپ جون'' کی بہت بڑی دکان تھی جو اس وقت کے مشہور بزاز، ٹیلر، پوشش ساز، کلاہ ساز اور مرچنٹ تھے۔ اب اس حصے میں شو سٹور، فوٹو گرافی کچھ متفرق دکانیں ہیں جب کہ کمرشل مارکیٹ میں زیادہ تر جیولری کی دکانیں ہیں۔

بینک اسکوائر میں وائی ایم سی اے کے ساتھ سن لائٹ انشورنس کی مرعوب کن عمارت تھی۔ وائی ایم سی اے کا ادارہ ثقافتی، ادبی اور سماجی اجتماعات کا شروع سے مرکز رہا ہے۔ اس زمانے میں یہاں ٹائپنگ اور شارٹ ہینڈ سکول بھی تھا۔ دیوی چند کی دکان، جانکی داس اینڈ کمپنی، لائیڈز بنک، ٹیلی گراف آفس اور امپریل بنک اسی علاقے میں واقع تھے۔ قیامِ پاکستان کے بعد وائی ایم سی اے بلڈنگ میں مشہور صحافی عبداللہ ملک کے بڑے بھائی عبدالروف ملک نے پیپلز پبلشنگ ہاؤس کا ادارہ قائم کیا تھا۔ ترقی پسند ہونے کی وجہ سے یہ ادارہ حکومتی دباؤ میں رہا اور بالآخر اسے یہاں سے جانا پڑا۔ آج کل وائی ایم سی اے میں ریستوران، کچھ دفاتر اور کچھ الیکٹرونک سامان کی دکانیں قائم ہیں۔ جنرل پوسٹ آفس کی رفیع الشان عمارت جو شاہی طرز تعمیر کا نمونہ ہے، کے پاس سڑک کے پار ریزرو بنک آف انڈیا کی عمارت تھی۔ یہ سُرخ اینٹوں سے بنی ہوئی ایک یادگار عمارت ہے قیام پاکستان کے بعد اسٹیٹ بنک کی ملکیت رہی۔ اب سپریم کورٹ

لاہور رجسٹری اس عمارت میں ہے۔ اس کے بعد مال روڈ کا سب سے بہترین حصہ شروع ہو جاتا جہاں دونوں اطراف خوب صورت اور نادر عمارتیں ہیں۔ یہاں میکلوڈ روڈ مال روڈ سے ملتا ہے اور اس مقام اتصال پر ہائی کورٹ کے سامنے کانسی کا بھاری مجسمہ کھڑا تھا۔ یہ مجسمہ پنجاب کے لیفٹیننٹ گورنر سر جان لارنس کا تھا۔ جس کے ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے میں قلم تھی۔ اس کے کتبہ پر لکھا تھا:

''مَیں نے تلوار اور قلم کے ساتھ تمہاری خدمت کی''

اس مشہور مجسمے کی رونمائی 1887 میں سر چارلس ایچی سن، لیفٹیننٹ گورنر پنجاب نے کی تھی۔ یہ دیو ہیکل بُت کہ جس کے ایک ہاتھ میں قلم اور دوسرے میں قبضۂ شمشیر تھا ہر گذرنے والے کے سر پر یہ احسان دھرتا کہ ''میں نے تمہاری خدمت قلم اور تلوار دونوں سے کی ہے۔'' اس سے قبل یہ عبارت یوں ہوتی تھی ''تم پر کس چیز سے حکم رانی کی جائے قلم یا تلوار سے۔'' چوں کہ یہ سوال اہلِ ہند کے لیے توہین آمیز تھا اس لیے اس کے خلاف آواز بھی بُلند ہوئی۔ سب سے پہلے 1889 میں محرم علی چشتی نے لاہور سے چھپنے والے اپنے اخبار ''رفیقِ ہند'' میں اس کے خلاف لکھا۔ لاہور میونسپل کمیٹی نے بھی اس بارے میں قرار دادیں پاس کیں۔ مولانا ظفر علی خاں نے بھی اس پر ایک نظم لکھی۔ 1920 کی دہائی میں ایک قوم پرست سِکھ نے لارنس کے مجسمے کا وہ ہاتھ کاٹ دیا جس کے ہاتھ میں تلوار تھی۔ بالآخر ہندوستانیوں کے احتجاج کے بعد انگریز حکومت نے ''تم پر کس چیز سے حکم رانی کی جائے قلم یا تلوار سے'' کے توہین آمیز الفاظ تبدیل کر کے ''مَیں نے تمہاری خدمت قلم اور تلوار دونوں سے کی ہے'' لکھ دیے۔ بُت کی اپنی بے چارگی تو اس بات سے عیاں تھی کہ اس کے چوڑے چکلے کندھوں پر آوارہ پرندے لحہ دو لحہ ستا لیتے اور اُڑنے سے پہلے اپنا کوئی نقش چھوڑ جاتے، لیکن اس کی قوم نے اس کے دبدبے کو زندہ رکھا ہوا تھا۔ لارنس نے اپنے استعمار کی تعمیر بڑے لگن و شوق اور ان تھک محنت سے کی تھی۔ آزادی کے بعد اس استعماری علامت کو 25، اگست 1951 کے دن ہٹا کر قلعے میں رکھ دیا گیا۔ اب یہ بُت لندن کے آرٹ کالج میں موجود ہے۔

یہاں سے سڑک کشادہ اور وسیع ہو جاتی ہے جس کے دونوں اطراف صاف ستھری گزر گاہیں بنی ہوئی تھیں۔ دائیں طرف ہائی کورٹ کی عمارت تھی جواب بھی پورے وقار کے ساتھ

کھڑی ہے اور بائیں طرف متاثر کن نرسنگھ داس بلڈنگ تھی۔ اسی رُخ ساتھ ہی ای پلومر بلڈنگ ہے جس میں اُس دور کے مشہور کیمسٹ ای پلومر اینڈ کمپنی، عینک ساز کرپارام کی دکانیں تھیں۔ کرپارام اس وقت کے نام ور ماہرِ امراضِ چشم ڈاکٹر دولت رام کا والد تھا۔ نرسنگھ داس بلڈنگ میں اے این جون (John) کی دکان تھی۔ اے این جون جو اپنے نام سے یورپین معلوم ہوتا تھا، دراصل وہ ا نارتھ تھا جس نے ہیئر ڈریسنگ کا کام انگلینڈ سے سیکھا اور یورپی گاہکوں کو لبھانے کے لیے اپنے نام کے ساتھ جون (John) کا اضافہ کر لیا تھا۔ یہیں زیدی فوٹو گرافر کی دکان بھی تھی جو اپنے کام کی وجہ سے شہرت رکھتا تھا اس کی بنائی ہوئی قائداعظم کی تصویر ہر جگہ آویزاں نظر آتی ہے۔ اس زمانے میں مال روڈ پر خاصی رونق دیکھنے کو ملتی انگریز اور ان کو گوری میمیں اکثر کاروں پر سوار ہو کر آتے جنہیں مقامی شوفر چلا رہے ہوتے۔ ان کے پالتو کتوں نے کھڑکیوں سے باہر منہ نکالے ہوتے تھے۔ یہ اپنی جگہ پُر لطف نظارہ ہوتا تھا۔ جنگ عظیم دوم کے زمانے میں پٹرول کی شدید قلت پیدا ہو گئی تھی اور راشننگ کر دی گئی تھی اس لیے لوگ زیادہ تر تانگے اور بگھیاں استعمال کرنے لگے تھے جنہیں کافی حد تک وہ پہلے ترک کر چکے تھے۔ ان دنوں میں مال روڈ پر کاروں سے زیادہ تانگے اور بگھیاں نظر آتیں۔ ای پلومر کی عمارت جہاں ختم ہوتی ہے وہاں "Muree Beer asthe best" کا ٹیوب سائن لگا ہوا تھا۔ قیامِ پاکستان کے بعد بھی چند سال تک یہ بورڈ نمایاں نظر آتا رہا۔ اس زمانے میں شراب ممنوع نہیں تھی۔

ای پلومر بلڈنگ سے تھوڑا سا آگے دائیں طرف سر گنگا رام بلڈنگ جس میں اس زمانے میں سرکردہ کیمسٹ جگت سنگھ اینڈ سنز کی دکان تھی۔ ساتھ ہی عظیم دیال سنگھ مینشن ہے جس کا ڈیزائن مال روڈ کی دوسری عمارتوں سے مختلف ہے۔ اس کی ساخت دائروی ہے اور اس زمانے میں اس میں سرکردہ ریڈیو ڈیلروں واسودیو، پارکو اور ناردرن ریڈیوز کی دکانیں ہوتی تھیں۔ اُوپر کچھ رہائش گاہیں اور دفاتر بھی ہوتے تھے۔ سر گنگا رام کی طرح دیال سنگھ مجیٹھیا، ایک سکھ جو برہمو سماجیہ ہو گئے، بھی بہت بڑے سماج سیوک تھے، انہوں نے ایک سکول، کالج ایک لائبریری کی بنیاد بھی رکھی اور ایک انگریزی اخبار دی ٹریبیون (The Tribune) کے نام سے نکال کر لاہوریوں کے دل جیت لیے تھے۔ تھوڑا آگے جا کر سٹینڈرڈ ریسٹورنٹ تھا جو لاہور کی اشرافیہ کا من پسند مقام تھا۔ یہاں اس زمانے میں مکمل چائے ایک روپیا اور چار آنے میں مل سکتی تھی۔ اس

کے ساتھ جو جس قدر چاہے کیک، پیسٹریاں، پیٹیز اور سینڈوچ بھی کھا سکتا تھا۔ اس کے لیے الگ پیسے دینے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کے آگے ریگل سینما ہے جس میں صرف انگریزی فلمیں دکھائی جاتیں تھیں۔ اس کے باہر پھول بیچنے والے بھی شام کو جمع ہو جاتے تھے۔ اب سینما کی عمارت تو موجود ہے لیکن بند پڑا ہے اور اس کا لان اور برآمدے یہاں حلیم بیچنے والوں کے استعمال میں ہے۔ کراسنگ پر جہاں بائیں طرف سے ہال روڈ اور دائیں طرف ٹیمپل روڈ آ کر مال روڈ سے ملتے ہیں۔ ان کے مقام اتصال پر کرپارام اینڈ برادرز کے نام سے ایک بہت بڑا ڈیپارٹمنٹل اسٹور تھا جو اپنی سالانہ سیل کی وجہ سے مشہور تھا۔ کرپارام بلڈنگ میں ہی امپیریل بک ڈپو ہوتا تھا جہاں قیام پاکستان کے بعد لاہور بک ڈپو بن گیا۔ اس کے اوپر چاچا چوہدری کا فوٹو سٹوڈیو ہوتا تھا۔ اس جگہ اب بسم اللہ چاٹ کارنر اینڈ جوس قائم ہے۔ بائیں طرف لکشمی بلڈنگ تھی (جواب احمد مینشن کہلاتی ہے) اس میں کپڑے کی مشہور انگریزی فرم رینکن اینڈ کمپنی تھی۔ مال روڈ پر رینکن پٹمین، جون، دیوی چند وغیرہ جیسے بزازوں اور درزیوں کے پاس صرف امیر کبیر لوگ ہی جا سکتے تھے۔

ہال روڈ سے ذرا پہلے جہاں اب کلاسیک کی دکان ہے کتابوں کی۔ اس کے ساتھ شنکر داس اینڈ کمپنی تھی۔ یہ بجاج مینشن کہلاتا تھا۔ یہ خالی پلاٹ تھا ہاں اب زمان پلازہ ہے۔ جنگ عظیم دوم کے دنوں میں سُندر داس نے یہ جگہ لیز پر لے لی اور یہاں عارضی طور پر بجاج مینشن بنائی تھی۔ اس نے یہی جگہ لوگوں کو آگے کرائے پر دی۔ شنکر داس اینڈ کمپنی فوٹو گڈز کی ڈیلر تھی۔ سٹوڈیو کے کیمرے مینوفیکچر کرتے تھے۔ پہلے یہ برانڈرتھ روڈ پر ہوتے تھے۔ پھر یہاں مال روڈ پر آ گئے۔۔۔ یہ تین بھائی تھے۔ فوٹو گڈز ڈیلر سُندر داس تھا۔ یہ ریڈیو کا ڈیلر بھی ہو گیا تھا۔

یہاں وہ ریڈیو بھی بیچتے تھے۔ اسی دکان میں جگدیش ڈینٹل گڈز کا ڈیلر تھا۔ ہریش کلاتھ مرچنٹ تھا۔ شنکر داس ان تینوں کے باپ کا نام تھا جس پر فرم کا نام تھا۔ یہ زمنٹ کیمرے بھی بیچتے تھے جو جرمنی سے آتے تھے۔ علاوہ ازیں لکڑی کے کیمرے جن سے کپڑے میں بازو ڈال کر تصویر کھینچتے تھے، شنکر داس اس کا بانی تھا۔ پھر پرنس نے یہ کیمرے بنانے شروع کیے۔ شنکر داس کا سامان پورے ہندوستان میں جاتا تھا۔ لاہور میں سارے فوٹو گرافران سے سامان لیتے تھے۔ مال روڈ کے مشہور فوٹو گرافر رولو نے شنکر داس کی ایک سال کی ملازمت کی۔ پھر اس نے الفنسٹن ہوٹل (موجودہ انڈس) کے ساتھ کرایے پر دکان لے کر سٹوڈیو کھول لیا۔ قیام پاکستان کے وقت

شنکر داس کمپنی کے مالکان سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بھارت چلے گئے۔ جن کے حوالے دکان آئی انھوں نے سب کچھ بیچ باچ ڈالا۔ شنکر داس اینڈ کمپنی سے اگلی دکان یعنی موجودہ کلاسیک کے ساتھ والی جگہ ایڈسو (Adso) فیبر کس کی دکان تھی۔ یہ سوتی کپڑا بیچتے تھے اور اس کا مالک ایک سکھ تھا۔

اس کے ساتھ ہی جہاں بیڈن روڈ شروع ہوتا ہے ڈنگا سنگھ بلڈنگ ہے، یہاں سول اینڈ ملٹری گزٹ کے دفاتر، K شوشاپ، مائرہ موٹرز، الفنسٹن ہوٹل، جین اینڈ الرٹن اور وائٹ وے لیڈ لا کی دکانیں تھیں۔ مشہور فرم وائٹ وے لیڈ لا کی دکان اس جگہ تھی جہاں آج کل فیروز سنز کتابوں کی دکان ہے۔ جو غلام رسول بلڈنگ میں واقع ہے اس دکان میں آرایش اور سنگھار نیز خانہ داری کی ہر چیز مل جایا کرتی تھی۔ مثنوی بدر منیر قسم کی چھوکریاں وہاں سیل گرلز کا کام کرتی تھیں۔ قیاس کیجیے کہ خرید وفروخت کے وقت خریداروں کے دلوں پر کیا کچھ نہ گزرتی ہوگی۔ پھر سمتھ کیمبل اور ساتھ والی دکانوں پر بھی ایسی ہی کیفیت رہا کرتی تھی۔ تقسیمِ ہند سے پچیس تیس سال پیشتر مال روڈ کی شان دار دکانوں میں یورپین اور امریکن منڈیوں کا مال بہ کثرت بِکا کرتا تھا۔ چیئرنگ کراس پر تقریباً سب دکانوں کے مالک یا مینیجر انگریز ہوتے تھے۔ جو اپنی ذہانت اور خوش اخلاقی سے گاہکوں کا دل فوراً ہاتھ میں لے کر ان کی جیبوں سے روپیا اگلوانے میں یدِ طولا رکھتے تھے۔ پھر رینکن کی دکان کے مینیجر مسٹر ''رچی'' کو لوگ گورنر کہا کرتے تھے۔ وہ راجاؤں اور نوابوں کو پھانسنے کے بے شمار گُر جانتے تھے۔ وہ بجا طور پر لاہور کا ''بانڈ اسٹریٹ'' سمجھا جاتا تھا۔ اسی علاقے میں جس جگہ اب پینو راما شاپنگ سینٹر واقع ہے اس کے نیچے سول اینڈ ملٹری گزٹ، پاکستان ٹائمز اور امروز جیسے عظیم اخبارات کا ملبہ دبا پڑا ہے۔ سِول اینڈ ملٹری گزٹ اپنے دور میں برصغیر کا معروف ترین اخبار تھا۔ یہ سب سے پہلے 1845 میں آگرہ سے سن لائٹ کے نام سے جاری ہوا۔ پھر لاہور کرانیکل میں جو کہ 1849 میں لاہور سے شائع ہوا، مدغم کر دیا گیا۔ انڈین پبلک اوپینین (Indian Public Opinion) بھی جو 1866 میں لاہور سے نکلا، اس میں ضم ہوا۔ بعد ازاں اس انتظامیہ نے 1872 میں شملہ سے سول اینڈ ملٹری گزٹ کے نام سے اخبار جاری کیا جو 1876 میں لاہور منتقل ہوگیا۔ اخبار کا انتظام 1933 تک پائنیر کمپنی الہ آباد کے ہاتھ میں رہا، پھر ڈالمیا نے اس کے بیشتر حصے خرید لیے۔ کچھ عرصہ نکلتا رہا مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ سول اینڈ ملٹری گزٹ کے ایڈیٹروں میں رڈیارڈ کپلنگ، کلاڈ سکاٹ، شیخ عبدالمجید اور ظہیر صدیقی کے

نام قابلِ ذکر ہیں۔ تقسیم ملک کے بعد خواجہ نذیر احمد نے یہ اخبار خرید لیا مگر اشاعت گرتی گئی۔ آخر میں یہ مشہور صنعت کار نصیر اے شیخ کی ملکیت بن گیا۔ بالآخر یہ اخبار مالی حالات کے باعث 10 اکتوبر 1963 کو بند کر دیا گیا۔ سوم آنند نے اپنی یادداشتوں ''باتیں لاہور کی'' میں اس دور کے اس اخبار کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔

''ان وقتوں کا لاہور صرف پنجاب کی راج دھانی نہیں تھا۔ علم و ادب کے مرکز کی حیثیت سے بھی اس کی بڑی شہرت ہوگئی تھی۔ مگر مصنفوں کا ذکر ہوتا سب سے پہلے انگریز کا نام ہی زبان پر آتا ہے۔ یہ تھا رڈیارڈ کپلنگ جس نے ناول نگار کے طور پر اپنے وقت میں بڑی شہرت حاصل کر لی تھی۔ اس نے ہندوستان کو، یہاں کے لوگوں کو اور رسم و رواج کو اپنے تعلقات کے جھروکے میں دیکھا اور کہا کہ مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب ہے۔ یہ دونوں کبھی نہیں مل سکتے۔ کپلنگ نے اپنی ادبی اور صحافتی زندگی کا آغاز لاہور ہی سے کیا تھا۔ شروع میں اس نے یہاں کے مشہور انگریزی روزنامے سول اینڈ ملٹری گزٹ میں رپورٹر کے طور پر ملازمت کی اور میدانِ صحافت میں اپنے اندازِ تحریر اور جزئیات نگاری کی وجہ سے جلد ہی مشہور ہو گیا۔

دُنیا کے اس خطے میں چھپنے والے جن دو چار جریدوں سے بیرونی دنیا آشنا تھی، سول اینڈ ملٹری گزٹ ان میں سے ایک تھا۔ اس کی پرانی فائلوں میں برطانوی ہند کی قرنوں کی تاریخ ہی نہیں بلکہ اس کے شب و روز محفوظ ہیں۔ وائسراؤں کی آمد سے لے کر لاہور میں بارش کی دھوم تک نومبر میں پنکھے اترنے سے لے کر میم صاحبہ اور باوا لوگوں کے مشاغل تک سبھی محفوظ ہیں۔ اس کو بچانے اور سنبھالنے کی کوشش آخر دم تک ہوئیں۔ جب اِس کے بند ہونے کی خبریں پھیلیں تو انبالے انڈیا کے ٹریبیون میں خبر چھپی کہ کوئی ہندوستانی صاحبِ ثروت سول خرید کے انبالے لے آئے تا کہ انہیں گزرے ہوئے دنوں کا اعادہ ہو سکے۔

پاکستان ٹائمز جو تقریباً نصف صدی تک انگریزی صحافت میں پاکستان کے اُفق پر چھایا رہا اور اس کی پیشانی پر بانی کے طور پر قائداعظم محمد علی جناح کا نام ثبت ہوتا تھا، اس کا دفتر بھی مال روڈ پر سول اینڈ ملٹری گزٹ کے ساتھ ہی واقع تھا بلکہ سول اینڈ ملٹری گزٹ کے کمروں میں عارضی چوبی دیواریں کھڑی کر کے چند کا بچے سے بنا لیے گئے تھے۔ پاکستان ٹائمز کا اسٹاف وہاں بیٹھتا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ مستحکم ہوتا چلا گیا۔ یہ پاکستان ٹائم تھا جس نے وقت کی آندھی کے سامنے جھکنے کی

بجائے آزادی رائے کو قائم رکھا۔اس میں امروز بھی شامل تھا۔اس اخبار کوشروع کرنے والے میاں افتخار الدین تھے۔میاں صاحب کی شخصیت بڑی دلچسپ تھی۔ایک وقت تھا جب وہ متحدہ پنجاب میں کانگریس پارٹی کے لیڈر تھے۔بہت زمانے تک وہ پنجاب کانگریس کمیٹی کے صدر بھی رہے۔1942 کی تحریک میں انہوں نے بہت دنوں تک جیل کاٹی۔پنڈت نہرو سے ان کے ذاتی مراسم تھے اور پنڈت جی بھی لاہور جاتے وقت میاں صاحب کے یہاں ٹھہرتے۔مگر میاں صاحب کانگریسی سے زیادہ کمیونسٹ تھے۔اس سے بھی زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ بہت بڑے زمیندار تھے۔لاہور شہر میں بھی ان کی اچھی خاصی جائیداد تھی۔بڑی ہی شاندار کوٹھی میں رہتے تھے۔نوکر چاکر تھے،موٹریں تھیں اور زمینداروں والے ٹھاٹھ باٹھ تھے۔زندگی کی ان سب آسایشوں کے باوجود کمیونسٹ نظریات پر اعتقاد رکھتے تھے۔دراصل بہت سے کمیونسٹ لیڈروں کی طرح ان پر بھی مارکسی نظریات کا جادو انگلستان میں چلا جہاں وہ پڑھنے گئے تھے۔لاہور میں میاں صاحب کی حیثیت کمیونسٹوں کے ''گاڈ فادر'' یعنی سرپرست کی سی تھی۔ان کا گھر پڑھے لکھے انٹلیکچویل قسم کے کمیونسٹوں کا اڈا تھا۔پارٹی کے لٹریچر کو اگر کبھی پولیس کی نظروں سے محفوظ رکھنا ہوتا تو میاں صاحب کی کوٹھی میں ڈال دیا جاتا۔تقسیم سے کچھ عرصہ پہلے میاں صاحب کانگریس چھوڑ کر مسلم لیگ میں شامل ہوگئے۔ان ہی دنوں انہوں نے کچھ اور لوگوں کے ساتھ مل کر ایک کمپنی پروگریسو پیپرز لمیٹڈ کے نام سے بنائی اور لاہور سے انگریزی اخبار ''پاکستان ٹائمز'' نکالا۔اس کے بعد اس کمپنی نے اُردو کے روزنامہ ''امروز کا اجرا بھی کیا۔فیض احمد فیضؔ پاکستان ٹائمز کے پہلے چیف ایڈیٹر تھے۔کئی دوسرے چوٹی کے ادیب اور شاعر اس ادارے کے ساتھ وابستہ رہے۔شروع شروع میں مولانا چراغ حسن حسرتؔ امروز کے ایڈیٹر بنے۔ان کے بعد احمد ندیمؔ قاسمی آئے۔ان دونوں اخباروں کی اشاعت جلد ہی زیادہ ہوگئی۔پاکستان ٹائمز کے مقابل تو پورے پنجاب میں کوئی اخبار نہ رہا۔تقسیم کے بعد ''ٹریبیون'' تو لاہور سے انبالہ پہنچ گیا تھا اور دوسرے بڑے اخبار ''سول اینڈ ملٹری گزٹ'' کے مالک بدل گئے،معیار گر گیا اور کچھ ہی عرصے بعد اسے بند کردینا پڑا۔امروز کے مقابلے میں حالانکہ لاہور سے بہت سے اخبار نکلے،مگر چراغ حسن حسرت نے اسے نئے طرز کا اخبار بنا دیا اور پاکستان میں اُردو صحافت کو ایک نیا رُخ دیا۔

پالیسی کے لحاظ سے ''پاکستان ٹائمز'' اور ''امروز'' کمیونسٹ نہیں تو سوشلسٹ ضرور

تھے۔ میاں صاحب نے مسلم لیگ میں شامل ہونے کے باوجود اپنے نظریات نہیں بدلے۔ اپوزیشن کا اخبار تھا۔ حکومت نے 1951 میں فیض احمد فیض کو راولپنڈی سازش کیس میں دھر لیا۔ وہ چار سال بعد رہا ہوئے۔ 1958 میں جب ایوب خان کا فوجی انقلاب آیا تو نئی حکومت نے مارشل لاء سے فائدہ اُٹھا کر ایک ہی جھٹکے میں ان دونوں اخباروں کا سارا نظام بدل کر رکھ دیا۔ کمپنی کے حصوں پر قبضہ کر لیا گیا۔ ڈائریکٹر نکال باہر کیے گئے اور ایڈیٹروں کو مستعفی ہونے پر مجبور کر دیا گیا۔ اس طرح پاکستان ٹائمز اور امروز سرکاری اخبار ہو گئے۔ اور کس کو معلوم نہیں پاکستان میں جو چیز بھی سرکاری ہو جائے اس کا بالآخر بھٹا بیٹھنا ہی ہوتا ہے۔ یہی بالآخر ان دو شان و شوکت والے اخباروں کے ساتھ ہوا۔ چند برس پہلے نہ صرف بند ہوئے بلکہ ان کے دفاتر بھی فروخت کر دیئے گئے اور نئے مالکان کو اس عمارت کی تاریخ اور عظمت سے کیا غرض تھی انہوں نے تو پیسا کمانا تھا کسی نے انہیں پابند بھی نہ کیا کہ اس تاریخی جگہ کی اصل ہیئت نہ بدلے۔ یہی وجہ ہے کہ آج مال روڈ کی دیگر قدیم تجارتی عمارات کے مقابلے میں پینوراما شاپنگ سنٹر کی عمارت جو سول اینڈ ملٹری گزٹ اور پاکستان ٹائمز کے ملبے کے اُوپر تعمیر ہوئی عجیب سی دکھائی دیتی ہے اور یہ مال روڈ کے حُسن میں اضافے کا کوئی سبب بھی نہیں بنی۔ آج جس جگہ صادق پلازا موجود ہے وہاں ایک بلڈنگ موجود تھی۔ یہ بلڈنگ خان بہادر نقی کے بیٹے ایم ڈی کمہار کی ملکیت تھی اسے فلموں میں کام کرنے کا شوق تھا اس شوق میں یہ بلڈنگ نیلام ہوئی اور لوگوں نے اسے خستہ حال دیکھا۔ غلام رسول بلڈنگ میں آج جہاں ماورا بک ہاؤس ہے اس کے اوپر والی منزل پر ڈانسنگ ہال ہوا کرتا تھا۔

سول اینڈ ملٹری گزٹ والی عمارت اور اس کے ساتھ غلام رسول بلڈنگ کے سامنے دائیں طرف کنڈانوالہ موٹرز، سٹفل ہوٹل، نارائن داس موٹرز، الفریڈ اینڈ کمپنی کیمسٹس اور لورینگ ریسٹورنٹ شاہ دین بلڈنگ میں تھے۔ سٹفل اور لورنیگ ریستوران نہایت صاف ستھرے اور شاندار تھے جن پر اس قدر ہجوم رہا کرتا تھا کہ لحظہ بھر بیٹھ کر چائے پینے کو جگہ ملنی محال ہوا کرتی تھی۔ ان ہوٹلوں میں ہندو اور مسلمان تاجر ایک دوسرے کی تواضع کرتے اور لاکھوں روپے کے سودے وہیں بیٹھے ہو جایا کرتے تھے۔ اس حصے میں گاڑیوں کے جو شوروم تھے ان میں نئے ماڈل کی برطانوی اور امریکی کاریں دیکھی جا سکتی تھیں۔ ان دنوں سیلز مین متوقع خریداروں کو گاڑی ڈرائیو کر کے دیکھنے کی دعوت دیتے تھے اور لوگ مارکیٹ میں آنے والے جدید ماڈلوں کے نئے فیچرز کی

تعریف کرتے تھے۔

مال روڈ پر لورلز (Laurels) لمیٹڈ کا ادارہ اور شراب فروخت کی کٹلر پالمر اینڈ کمپنی بھی تھی۔ لورلز لمیٹڈ کا ادارہ 30-1920 کے عرصے میں ہمانی مارکہ نہانے کے صابن اور پرفیومز بنانے میں معروف تھا۔ اس زمانے میں کانگریس کی طرف سے حکومت کے خلاف تحریک چلائی جارہی تھی اور لوگوں کو غیر ملکی اشیا کے بائیکاٹ اور مقامی اشیا کے استعمال کا کہا جارہا تھا۔ ان دنوں ہمانی مارکہ ہندوستانی صابن ساز کمپنی کا پُر لطف اشتہار اخباروں میں چھپتا تھا جس میں کانگریس کے صدر جواہر لال نہرو کی سند کے ساتھ اس صابن کو استعمال کرنے کی ترغیب ہوتی تھی۔ کٹلر پالمر اینڈ کمپنی مال روڈ پر شراب کی پُرانی دکان تھی۔ 1920 کی دہائی میں یہ چھے قسم کی شراب فروخت کرتے تھے۔ یہاں سے شراب کی ایک بوتل تین روپے سے لے کر پانچ روپے تک مل جاتی تھی۔ امپیریل برانڈی، ون سٹار، ٹو سٹار، تھری سٹار، فورسٹار اور رئیر اولڈ (Rare Old) کی شراب بناتے تھے۔ رئیر اولڈ ان کی اعلیٰ ترین کوالٹی تصور کی جاتی تھی اور یہ ریفارم کلب لندن کو بھی سپلائی ہوتی تھی۔

چیئرنگ کراس میں وکٹوریا کا بُت نصب تھا۔ اس کے سامنے پنجاب اسمبلی کی نئی عمارت اس زمانے میں وجود میں آئی تھی۔ یہ عمارت مونٹ گمری اور الگن روڈ کے سنگم پر قائم ہوئی۔ سڑک کے پار چند بڑی دکانیں تھیں جن میں یوبیروئی سپورٹس اور ایف ایچ پٹمین بزاز اور کٹر شامل تھے۔ اس کے نزدیک پلازا سنیما تھا جہاں صرف انگریزی فلمیں دکھائی جاتی تھیں۔ یہ سینما اب بھی موجود ہے۔ بائیں طرف میلا رام کی بلڈنگ تھی جس میں ہر دلعزیز میٹرو ریسٹورنٹ تھا۔ شام کو یہ جگہ پُر رونق ہوتی۔ یہاں لاہور کی فلمی دنیا کی اُبھرتی ہوئی اداکارائیں اور شدید آرزو رکھنے والی نوجوان اداکارائیں اپنے ہمراہیوں کے ساتھ اکٹھی ہو جاتیں اور ان فلمی شخصیات کی توجہ حاصل کرنے میں کوشاں رہتیں جو ان کی سرپرستی کر سکیں۔ میلا رام بلڈنگ کے اوپری حصے میں ریمنگٹن ٹائپ رائٹر کا دفتر ہوتا تھا۔ چوڑے پھٹوں کی سیڑھیاں اوپر جانے کے لیے ہوتی تھیں۔ نیچے اور سامنے دکانیں تھیں۔ یہاں قیام پاکستان سے پہلے فلائنگ کلب کا جہاز کریش ہوا تھا۔ پاک و ہند کی مشہور اداکارہ مینا شوری اپنے خاوند النا صر کے ساتھ لاہور آئیں تو ان کا قیام الفنٹس ہوٹل (موجودہ انڈس) میں ہوا۔ جہاز کریش ہونے کا واقعہ ان کے سامنے ہوا۔ بقول مینا شوری!

''الفنٹس کے قریب ہی جہاں ان دنوں واپڈا ہاؤس ہے۔ میٹرو ہوٹل ہوتا تھا جہاں ایک اینگلوانڈین عورت کیبرے ڈانسر تھی۔ ایک آدھ بار ہم کیبرے ڈانس دیکھنے بھی گئے تھے۔ وہ رقاصہ خوب صورت تھی۔ ایک روز الناصر اور میں الفنٹس کی چھت پر کھڑے تھے۔ فلائنگ کلب کا جہاز نیچی پرواز کر رہا تھا۔ ہم حیرت زدہ رہ گئے کہ آبادی میں اس قدر نیچی پرواز کا کیا مقصد؟ ملکہ کے بُت کے قریب جہاز نے ڈائی جو ماری تو بجلی کے تاروں کی وجہ سے اُٹھ نہ سکا۔ میٹرو ہوٹل کی بُرجی سے ٹکرا کر چڑیا گھر کے قریب گر کر تباہ ہوگیا۔ اس میں سوار دونوں ہوا باز ہلاک ہو گئے۔ بعد میں پتہ چلا کہ ان ہوا بازوں میں سے ایک انگریز تھا جس کی اس ڈانسر کے ساتھ دوستی تھی۔ وہ میٹرو ہوٹل کی چھت پر کھڑی رومال ہلا رہی تھی۔ انہوں نے نیچی پرواز کی اور ہلاک ہو گئے۔ اس واقعہ کے بعد ڈانسر نے کیبرے ڈانس چھوڑ دیا۔

میلا رام کے نام سے لاہور میں بہت کچھ تھا۔ میلا رام ٹیکسٹائل ملز مزار شریف علی ہجویری، داتا گنج بخش کے بالمقابل تھی جس کے آثار 1975 تک موجود تھے۔ کارخانے کے ساتھ ہی لالہ جی کی کوٹھی تھی جو ''لال کوٹھی'' کے نام سے شہر بھر میں مشہور تھی۔ یہاں اب حزب الاحناف کا ادارہ ہے۔ اسی میلا رام نے مزار حضرت داتا گنج بخش کو بجلی فراہم کی تھی۔ یہ واقعہ یہاں بیان کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ 1918 میں انفلوانزا کی وبا اس شدت سے پھیلی کہ خدا کی پناہ! چند ہی ماہ میں پورے ہندوستان میں کروڑ انسان لقمہ اجل بن گئے۔ بدقسمتی سے رائے بہادر لالہ رام میلا رام کے تینوں بیٹے بھی اس مرض میں مبتلا ہوگئے اوران کے گھر میں سخت اُداسی چھا گئی۔ کرنل بھولا ناتھ وارث کرنل امیر چند اور کرنل سدر لینڈ پرنسپل کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج جیسے یگانہ روز گار ڈاکٹر علاج کے لیے صبح شام آتے اور ہزار جتن کے باوجود طبیعت نہ سنبھلی۔ لالہ جی کے ہندو، سکھ اور مسلم دوستوں کا ''لال کوٹھی'' میں تانتا بندھا رہتا۔ سب بارگاہ الٰہی میں دعائیں مانگتے رہتے۔ خود لالہ جی فقراء میں خیرات تقسیم کرتے رہتے اوران سے دُعا کے طلب گار ہوتے۔

لالہ رام کہتے ہیں!

''ایک رات، ہم سوئے ہوئے تھے کہ کمرے میں کچھ آہٹ سی ہوئی اور میری آنکھ کھل گئی میں کیا دیکھتا ہوں کہ ایک سفید بزرگ براق لباس پہنے ہاتھ میں عصا اور دوسرے میں تسبیح لیے میرے بیٹے گوپال کے پلنگ کے پاس کچھ پڑھ رہے ہیں۔ انہیں دیکھ کر میں سہم گیا اور چیخ کر کہا

کہ آپ کون ہیں اور کیا کر رہے ہیں؟ انہوں نے میری بات سنی ان سنی کر دی اور دُعا پڑھنے میں مشغول رہے۔ پھر وہ بزرگ میرے دوسرے بیٹے ''روپ رام'' کی چارپائی کے پاس گئے اور وہاں بھی دُعا مانگی۔ پھر تیسرے بیٹے کے پلنگ کے قریب جا کر بھی ایسا ہی کیا۔ اس کے بعد وہ بزرگ مجھ سے مخاطب ہو کر فرمانے لگے۔

''میں تمہارا پڑوسی گنج بخش ہوں۔ مجھ سے تمہاری پریشانی دیکھی نہ گئی۔ اس لیے میں دُعا کرنے خود آ گیا ہوں۔ اب گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ اللہ تعالیٰ سب کو شفا دے گا۔

خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ اُس بزرگ کی دُعا سے واقعی دوسرے دن تینوں کا بُخار ہلکا ہو گیا اور وہ کچھ باتیں بھی کرنے لگے۔ جب ڈاکٹر صاحبان مریضوں کو دیکھنے کے لیے آئے تو ان کی حالت بہتر پا کر بہت خوش ہوئے اور کرنل امیر چند کہنے لگے کہ رات کو میں اس قدر موثر دوائی دے کر گیا تھا کہ اُس کا اثر تو ہونا ہی تھا۔ اس پر لالہ جی ہنس پڑے اور گزشتہ رات کی تمام کیفیت بیان کی۔ تمام حاضرین اس قصہ کو سُن کر حیران و پریشان ہو گئے اور دیر تک اس بارے بحث و تکرار کرتے رہے۔

جب بیماروں کو مکمل شفاء ہو گئی تو رائے بہادر میلا رام نے دربار کے سجادہ نشین کو اپنے ہاں بلا کر تمام واقعہ سنایا۔ اس کے بعد انہوں نے دریافت کیا کہ وہ کس انداز سے شُکرانے کی نذر پیش کریں۔ آیا کھانے کی دیگیں پکوا کر فقرا میں تقسیم کی جائیں یا پھر نذر کسی اور صورت میں ہونی چاہیے۔ سجادہ نشین نے جواب دیا کہ کھانا تو آپ کی طرف سے ہر سال عُرس کے موقع پر ہوا ہی کرتا ہے۔ اب تو کوئی ایسی بات ہونی چاہیے جس سے مستقل فیض جاری رہے۔ آخر رائے بہادر لالہ میلا رام نے فوری طور پر بجلی کے انتظامات اپنی طرف سے کرنے کو کہا۔ چنانچہ ایک ماہ کے اندر اندر دربار شریف پر بجلی کے تمام انتظامات مکمل کر لیے گئے جس کے بعد رائے بہادر میلا رام نے دربار پر حاضری دے کر پہلے نذر پیش کی اور پھر اس کے بعد بٹن دبا کر دربار حضرت علی ہجویری پر روشنی کا افتتاح کیا۔ یاد رہے لاہور میں بجلی 1913 میں آئی تھی اور سب سے پہلا کمرشل کنکشن بھی رائے میلا رام نے اپنے کارخانے کے لیے ہی حاصل کیا تھا۔

میٹرو ہوٹل اور میلا رام کی عمارت سے تھوڑا سا آگے اس زمانے کا مشہور نیڈو ہوٹل تھا۔ یہ ہوٹل یورپ سے آئے ہوئے نیڈو خاندان نے بیسویں صدی کے آغاز میں تعمیر کیا تھا۔ 1940 تک قائداعظم محمد علی جناح اور کئی دوسرے مسلم لیگی لاہور آتے تو اس ہوٹل میں قیام

کرتے۔اب یہاں ''آواری'' ہوٹل ہے۔اس کے بالکل سامنے لاہور چڑیا گھر کا داخلی دروازہ ہے۔قیام پاکستان سے پہلے ایک دفعہ کسی طرح ایک شیر نے باڑ پھلانگ کر مال روڈ کی طرف دوڑ لگادی تھی جہاں اس کو گولی کے ذریعے مار دیا گیا۔اس کے بعد یہاں بیس فٹ اونچی فولادی باڑ لگادی گئی تھی تاکہ مستقبل میں اس طرح کا کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہ آئے۔ چڑیا گھر کے ساتھ ہی لارنس باغ میں اوپن ایئر تھیٹر تھا جو رومن ایمفی تھیٹر کی طرز پر بنایا گیا۔شوقیہ اداکار اس کے دل کش ماحول میں ڈرامے اور کنسرٹس کرتے تھے۔ پاکستان بننے کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔ اسی باغ کے اندر جم خانہ کلب تھا جہاں سے مونٹ گمری ہال کا نظارہ بھی ہوتا تھا۔کوئی مقامی آدمی اس عظیم الشان عمارت میں نہیں جاسکتا تھا۔ اسکی خوب صورتی سے سجی ہوئی رقص گاہ شیشے کی کھڑکیوں سے موقع بہ موقع رقص کرتے ہوئے جوڑوں کا دھندلا سا عکس دیکھا اور موسیقی کی آواز سُنی جاسکتی تھی۔ مونٹ گمری ہال کے ساتھ جُڑواں ہال لارنس ہال ہے۔ باغ کے دوسرے حصّے میں کاسموپولیٹین کلب واقع تھا جو مغرب زدہ مقامی اشرافیہ کی ملاقات گاہ تھی۔ یہ حکمرانوں کی طرح اکڑ کر چلتے اور بھُورے صاحبوں کے سے طرزِ عمل پر فخر کرتے تھے۔ ساڑھیوں میں ملبوس خواتین کلب کی کورٹ میں ٹینس کھیلتیں۔ لارنس باغ اور گورنر ہاؤس کے آگے ایچی سن کالج آجاتا۔ پھر اس سے آگے پنجاب کلب تھا جو انگریزی طبقہ اشرافیہ کی ایک اور ممتاز رہائشی اور ملاقاتی جگہ تھی۔ یہاں صاحبان اور میم صاحبان گپ شپ اور بناوٹی اظہار محبت کرتے تھے جوان میں سے کئی ایک وقت گزاری کے لیے مقبول ذریعہ تھا۔اس زمانے میں نہر تک دونوں اطراف میں کہیں رہائشی بنگلے اور کچھ دیگر عمارتیں بھی وجود میں آچکی تھیں۔ان میں سے ایک وہ قدیم عمارت قابل ذکر ہے جو موجودہ پرل کانٹینینٹل ہوٹل کے ساتھ واقع تھی اور نرسنگھ داس بلڈنگ کے نام سے مشہور تھی۔آج کل وہاں نظریہ پاکستان ٹرسٹ اور کچھ دوسرے ادارے موجود ہیں۔

بہ شکریہ —— جناب اسد سلیم شیخ

تھڑا کلچر

کسی وقت لاہور میں تھڑا کلچر کی بہت اہمیت تھی۔ بازاروں کے تھڑوں پر دیر رات تک محفلیں جمی رہتیں جن میں محلّے میں ہونے والے واقعات پر چٹکیاں لی جاتی تھیں——!

لاہور کی مجلسی زندگی میں پُرانے وقتوں میں جسے سب سے زیادہ اہمیت حاصل تھی وہ تھڑا (چوپال) کلچر تھا۔ اندرونی شہر کے گلی محلّوں کے تھڑوں کے مقابلے بازاروں کے تھڑوں پر دیر رات تک محفلیں جمی رہتی تھیں۔ ان میں عموماً بڑی عمر کے لوگ شریک ہوتے تھے اور باتیں بھی بڑی بڑی ہوتی تھیں۔ گھروں کے لڑائی جھگڑے، باہر کے مسائل اور دُنیا جہان کی کہانیاں ان تھڑوں پر سُنی اور سُنائی جاتی تھیں۔ کچھ منچلے، جن کی آواز اچھی ہوتی تھی، وہ تھڑے بجا کر مشہور فلمی گانے سُناتے تھے۔ تھڑا بجانے والے اپنے فن اور مہارت کا دل کھول کر مظاہرہ کرتے تھے لیکن آس پاس کے گھروں میں ان لوگوں کے بارے میں ناگوار باتیں ہوتی تھیں۔ وہ لوگ جو دوکانوں کے اوپر مکانوں میں رہتے تھے اُنہیں اپنے بہو بیٹیوں والے گھروں کے نیچے اوباش نوجوانوں کے اس طرح جمع ہو کر ایسی حرکتیں کرنے سے بہت نفرت تھی اور کبھی کبھی یہ نفرت ہاتھا پائی میں بھی بدل جاتی تھی۔

گلیوں کے تھڑوں پر بیٹھنے والے بچّوں پر پانی پھینکا جاتا تھا اور بچے بھی اس کی مخالفت میں احتجاج کرتے ہوئے پانی پھینکنے والے لوگوں کے خلاف اونچی آواز میں ناپسندیدہ نعرے لگاتے تھے لیکن بازار کے تھڑوں پر ایسے واقعات کے نتیجے کے طور پر چاقو نکل آتے تھے۔ اس وقت اندرون شہر لاہور کا مشہور ترین ہتھیار کمانی دار چاقو ہوتا تھا۔

دراصل اندرونی شہر کے بچے بڑے ہوتے ہی عملی زندگی میں داخل ہو جاتے تھے۔ ماحول کے مطابق اُن کے لئے کوئی نہ کوئی ہُنر سیکھنا ضروری تھا۔ راج مزدور کا بیٹا راجگری کرنے لگتا تھا۔ درزیوں کا بیٹا درزی بن جاتا تھا اور نائی (باربر) کا بیٹا حجامتیں کرنے لگتا تھا۔ وہ سارا دن اپنے کام کاج کی جگہ پر گذارتے تھے اور رات کو اُن کے لئے سب سے بڑی تفریح یہ تھڑا ہی ہوتا تھا۔

ایک طرح سے تو یہ تھڑے میل جول کی سماجی ضرورتوں کا ایک ذریعہ تھے اور ہر کوئی تھڑے پر اپنی آزادی کا مزہ لینے یا گلی کے تھڑوں پر محفلیں سجانے والے دوسرے علاقوں کے تھڑوں پر بھی آتے جاتے تھے۔ اس طرح اندرونی شہر کی دوکانوں اور مکانوں کے تھڑے اشتراک (سانجھ) کے مرکز بنے ہوئے تھے۔ بھاٹی دروازے کی کسی جُوئے کی بیٹھک پر چھاپہ پڑتا تو چوک چونا منڈی میں اس کی ساری تفصیل تھڑے بازوں کے ذریعے پہنچ جاتی تھی۔ اگر کوچہ گھسیٹا میں کوئی لڑکا اور لڑکی چھت پر پکڑے جاتے تو یہ خبر تھڑوں پر بہت دلچسپی سے سُنی جاتی اور حماموں میں بوڑھے لوگ اس پر چُٹکی لے کر اپنی رائے کا اظہار کرتے۔ تھڑوں پر بہت کھلے الفاظ میں باتیں ہوتیں جنہیں سُن کر کئی بار بہت شرم بھی محسوس ہوتی تھی۔ ان تھڑوں پر سیکس کے تجربے پوری آزادی اور کھُلے پن کے ساتھ چرچا کا موضوع بنتے تھے۔ ہیرامنڈی اندرونی شہر میں تھی اور کام دھندہ کرنے والے جتنے بھی لوگ تھے وہ ہیرامنڈی سے پوری طرح سے واقف تھے اور وہاں کی عورتوں سے اپنے سیکس تعلقات کے راز بیان کرنے میں ذرا بھی شرماتے نہیں تھے۔ دن کے وقت ان تھڑوں پر چوپٹ، تاش اور شطرنج کھیلی جاتی تھی اور شام کے بعد دودھ دہی کی دوکانوں کے آس پاس سبھی تھڑوں پر ہر طرح کے لوگ آ کر بیٹھ جاتے تھے۔ لاہور میں دوکانوں اور مکانوں کے تھڑے سماجی میل جول کا ٹھکانہ بھی تھے۔ اس زمانے میں چائے کی دوکانیں نہیں ہوتی تھیں۔ زیادہ تر لوگ دودھ پیتے تھے اور سردیوں میں تھڑوں کے ساتھ ساتھ دودھ کی دوکانیں بھی بھری رہتی تھیں اور شام کے بعد لاہور کے اندر یا تو حمام کھُلے ہوتے تھے یا دودھ کی دوکانیں۔ جن لوگوں کو یہاں جگہ نہیں ملتی تھی وہ تھڑوں پر محفل سجا لیتے تھے اور اس وقت کے لاہور کی زندگی میں رنگ بھر دیتے تھے۔

جنگ کے دوران لاہور

دوسری عالمی جنگ کا بیشک دنیا کے ہر کونے پر اثر تھا لیکن لاہور میں اس اثر کو الگ ہی طرح سے دیکھا جا رہا تھا۔ آیئے، محسوس کرتے ہیں اُس وقت کے حالات ——!

پُرانے وقت کے لاہور کے اندرونی حصّوں میں بہت کم گھروں میں بجلی لگی ہوتی تھی۔ صرف خاص خاص گھروں میں ریڈیو تھے اور گرمی کے دنوں میں جن کے پاس ریڈیو ہوتا تھا وہ اُسے گھر کی چھت پر لگا دیتا تھا اور اس کی آواز اونچی کر دیتا تھا۔ اسی طرح کسی کسی کے پاس گراموفون ہوتا اور محلّے بھر کے لوگ بیٹھک میں جمع ہو کر اس پر سہگل اور کانن بالا کے گانے سُنتے لیکن عام طور پر گراموفون پر گانے سننے والوں کو اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اندرونی شہر میں اخبار پڑھنے والوں کی تعداد بھی نہیں کے برابر ہوتی تھی۔ ان دنوں چُونا منڈی میں حکیم کرم دین ہیرا کی دوکان پر کبھی کبھی ''زمیندار'' اور ''ملاپ'' اخبار نظر آجاتے تھے اور ان میں چھپی خبروں پر چرچا ہوتی رہتی تھی۔

اندرونی شہر میں لوگوں کی زندگی ٹھہری ٹھہری اور رُکی رُکی سی تھی لیکن کبھی کبھی ہلچل مچ جاتی تھی اور برصغیر میں ہونے والی تبدیلیوں کی لہریں اندرونی شہر میں بھی اٹھنے لگتی تھیں۔ عام زندگی میں نئے موضوع ابھرنے لگتے تھے۔ جو کچھ لاہور کے اندر اور باہر واقع ہوتا اُس کی باتیں گھروں کے باورچی خانوں تک پہنچ جاتیں اور دیر رات تک چوکوں کے تھڑوں پر لوگ جمع ہو کر باتیں سُنتے اور کرتے تھے۔

دوسری جنگ عظیم شروع ہو گئی تھی۔ اندرونی شہر لاہور میں مٹی کے تیل کی جو بوتل ایک

آنے میں ملتی تھی، ڈپوؤں پر چار آنے میں ملنے لگی تھی۔ شہر کا سب سے بڑا ڈپو مچھی ہٹہ شاہ عالمی دروازہ میں تھا اور تیل لینے والوں کی قطاریں چوک رنگ محل تک لگی رہتی تھیں۔ سائیکلوں کی ٹیوبیں مہنگی ہو گئی تھیں اور اندرونی شہر میں سبھاش چندر بوس کی آزاد ہند فوج کی باتیں سنائی دینے لگی تھیں۔ جرمن ریڈیو سننے پر پابندی لگ گئی تھی اور کلکتہ پر بمبئی کے فوراً بعد وہاں سے لاہور آنے والوں سے پتہ چلتا کہ جاپانی فوج ہندوستان میں داخل ہونے والی ہے۔ اندرونی شہر میں شاہی محلّے کی جنگ تیز ہو چکی تھی۔ لاہور کے ہر محلّے میں سِول ڈیفنس کے دفتر کھل گئے تھے اور کھُلی جگہوں پر پانی کے تالاب بنا دیے گئے تھے۔ ان تالابوں میں شہر کے بچے نہانے لگے تو ان کی دیواروں پر شیشے کے ٹکڑے لگا دیئے گئے تھے۔ شہر کے باعزّت ہندو، سِکھ اور مسلمان شہریوں پر منحصر امن اور ہندوستان بچاؤ کمیٹیاں بن گئی تھیں۔ لاہور کا ایک عام شہری بابو مہر مچھلی اُن دنوں اپنے آپ ہی مشہور ہو گیا تھا۔ وہ بھرتی کے لئے قد ناپنے والا بانسی آلہ اُٹھائے پورے شہر میں گھومتا تھا۔ اُسے پہلی عالمی جنگ میں فوجی خدمات کے لئے تمغے اور 'کلر' حاصل ہو چکے تھے جنہیں وہ ہر وقت اپنے خاکی فوجی بُش کوٹ پر سجائے رکھتا تھا۔

لاہور کے دنگل

لاہور میں اُن دنوں پہلوانوں کے دنگل تو دیکھنے والے ہوتے ہی تھے، ساتھ میں ان دنگلوں کے بارے مُنادی کرنے والے ایک دِلکش ماحول بنا دیتے تھے — آیئے، انہیں محسوس کریں ——!

لاہور میں 50—60 پہلوانی کے اکھاڑے تھے۔ پہلوان ہونا طاقت کی نشانی تھی اور اسی لئے پہلوانی کا شوق عام ہوا کرتا تھا۔ لاہور کے ان اکھاڑوں میں بیگم شاہی مسجد والا یوسف پہلوان کا اکھاڑہ بہت مشہور تھے۔ خلیفہ عبداللہ کا شاہی قلعے کے جنوب میں ایک کھائی پر گودی والے تکیے میں قائم اکھاڑہ بہت مشہور تھے۔ خلیفہ عبداللہ کا یہ اکھاڑہ ''کھائی والا اکھاڑہ'' نام سے مشہور تھا۔ اس کے حوالے سے رُستمِ ہند بُوٹا پہلوان بہت جانے پہچانے جاتے تھے۔ اسی اکھاڑے سے بہت مشہور ایک گُونگا پہلوان تھا جس کا یادگاری دنگل منٹو پارک میں امام بخش پہلوان سے ہوا تھا۔ اسے دیکھنے کے لئے منٹو پارک میں نہ صرف پہلوانوں کا میلہ لگا ہوا تھا بلکہ اُس زمانے میں پنجاب بھر سے بیس پچیس ہزار لوگ وہاں جمع ہوئے تھے اور اس دنگل پر بڑی بڑی شرطیں لگی تھیں۔

لاہور میں اُن دنوں پہلوان منا خرادیا کا نام بھی اونچے پہلوانوں میں لیا جاتا تھا۔ وہ کالو پہلوان کے اکھاڑے کا تھا۔ اس کا اکھاڑہ چیمبرلین روڈ پر تکیہ تاجے شاہ میں تھا۔ لنڈے بازار میں کوتوالی کے پیچھے اکھاڑہ چمن قصائی بھی کوئی معمولی اکھاڑہ نہیں تھا۔ اُس نے پہلوانی کے فن میں ستارۂ ہند کا تمغہ حاصل کیا تھا۔ اُسی زمانے میں کالو پہلوان سے منسوب پہلوانی کے اکھاڑوں

میں نتھا چنگڑ، جمال چنگڑ اور پہلوان شیش گر نے بھی بڑا نام پایا تھا۔ ٹکسالی دروازے کے باہر موہنی روڈ کی طرف ایک ایسا اکھاڑہ بھی تھا جس کی بنیاد رُستم زماں گاما پہلوان نے رکھی تھی۔ اسی اکھاڑے سے اور بھی کئی نامور پہلوان اُبھرے تھے۔ پہلوانی کا تیسرا بڑا اسکول نُورا کا تھا۔ لاہور شہر میں کئی اکھاڑے اس سے جُڑے ہوئے تھے جن میں زیادہ مشہور مصری شاہ، رام گلی، چوک برف خانہ، بھاٹی دروازہ، ٹکسالی دروازہ، تکیہ نتھے شاہ اور تکیہ کھوتیاں والا کے اکھاڑے تھے۔ اس سے کئی نامی پہلوانوں نے ٹریننگ حاصل کی تھی۔ ان میں ایک مشہور نام لالہ راج کا تھا جو ''ملتانی پٹھی'' کے داؤ میں اتنا ماہر تھا کہ اُسے ''پری پیکر'' کہہ کر پکارا جاتا تھا۔

اُس زمانے میں لاہور میں پہلوانی کے اکھاڑے میں بہت سے نوجوان پہلوانی کا پیشہ اپنانے کے لئے نہیں بلکہ صرف کسرت کرنے کے لئے جاتے تھے کیونکہ یہ طاقتور بنانے کے ساتھ ساتھ نشے وغیرہ کی بُرائیوں سے دُور رکھنے کا ذریعہ بھی تھا۔

لاہور میں جب بڑے بڑے دنگل ہوتے تو اس کی مشہوری کے لئے پوسٹر چھپتے تھے جو ہفتہ بھر پہلے بانٹ دیئے جاتے تھے۔ لوگ ان پوسٹروں کو اپنی دوکانوں پر بڑی شان سے لگاتے تھے۔ دنگل سے ایک دن پہلے شام کے وقت پہلوانوں کا جلوس نکلتا تھا۔ اس میں ہر پہلوان اپنے حمایتیوں کے ساتھ خاص لباس پہن کر شامل ہوتا۔ جلوس کے دو حصّے ہوتے اور ہر حصّے کی قیادت ''بڑے جوڑ'' کا پہلوان کرتا اور اس کے پیچھے چھوٹے جوڑ کے پہلوان ہوتے۔ انہوں نے بنارسی پگڑیاں باندھی ہوتیں اور کریپ یا بوسکی کے کُرتے پہنے تانگوں پر بیٹھے ہوتے۔ ہر پہلوان کے تانگے کے ساتھ ایک گیس والا ہوتا۔ جلوس کے آگے آگے بینڈ باجا ہوتا جو فلمی دُھنیں بجاتا ہوا ہر چوک میں رُک جاتا تو لوگ پہلوانوں کا ہار پہنا کر استقبال کرتے۔ یہ جلوس روشنیوں اور باجے کی دُھنوں کے ساتھ شہر کے بازاروں سے ہوتا ہوا داتا گنج بخش کے مزار پر ختم ہو جاتا۔ اس جلوس کے آگے آگے مُنادی کرنے والا ڈھول کی تال اور ٹلّی کی ٹن ٹن میں مست ہوتا اور جگہ جگہ کچھ اس طرح مُنادی کرتا—''جناب عالی، کل آپ کے شہر لاہور میں ایک شاندار پوپٹ دنگل ہو رہا ہے۔ اس دنگل میں ''اچھا گوجرانوالیہ'' اور ''مست ہاتھی اکبر پہلوان پٹھا مہنی رہنی'' والے کا بڑا جوڑا ہووے گا۔''

ٹناٹن—ٹناٹن—ٹناٹن—!

لاہور کے اندر

لاہور کے گھگو بہت مشہور تھے لیکن اُن کے خاندان اتنے ہی دکھی تھے یہی دُکھ اور داسی بن کران کی ماؤں کے چہروں پر چپک گیا تھا ــــــــ!

لاہور میں ہم مکندی لال کے کارخانے کے ''گھگو'' کے ساتھ ہی ان 'گھگوؤں' کی بات بھی کررہے تھے جو اندرونی شہر کے ہر محلّے ، گلی کوچے اور بازار میں موجود تھے۔ اگر ایسا نہیں ہوتا تو امیر علی شاعر کی لکھی نظموں کی کتابوں کا ذکر کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ امیر علی شاعر چوک چُونا منڈی کے اندر بانسانوالہ طبیلے سے آگے ایک کوچے میں رہتے تھے۔ وہ معلم تھے اور تعلیم کے میدان میں ان کی قابلِ ذکر خدمات کے لئے انگریزی دور کی کارپوریشن نے اُن کی عزت افزائی کی تھی۔ جس گلی میں وہ رہتے تھے اُس کا نام کوچہ شاعر امیر علی رکھ دیا تھا۔ اُن کے مکان پر نیلے رنگ کا ایک بورڈ لگا ہوا تھا جس پر انکی شاعری کی کتابوں کے نام اور ان کی قیمت لکھی ہوئی تھی۔

کتابوں کے نام کچھ اس طرح تھے ــــ افیمی گھگو'' ـــ ''چرسی پٹھا'' ـــ ''لالچی چمچہ'' ــــ وغیرہ

اندرونی شہر کے گلی کوچوں میں اس طرح کے کرداروں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ یہ پیدا تو نہیں ہوتے تھے لیکن پیدا ہوتے ہی ان کی کردار سازی شروع ہو جاتی تھی۔ ہر گھر میں پیدا ہونے والا بچہ ، بیشک وہ کسی کھاتے پیتے گھرانے سے ہو یا اُس نے کسی غریب ماں کی کوکھ سے جنم لیا ہو، اسے اندرونی شہر کے رہن سہن ، طور طریقوں اور سماجی و مالی دلدلوں سے ضرور گذرنا پڑتا تھا۔ وہ جس طرح کے حالات اور ماحول سے جُڑا ہوتا، اُس کے لئے ماحول کے اُس فریم سے نکلنا مشکل ہو جاتا۔ ان دنوں چوریاں بھی ہوتی تھیں لیکن چور باہر سے نہیں آتے تھے۔ ساجا چسّی ، بکھا منگی ، جبرُ وشرابی ، مہنگا اُچکّا ، طوطی کالا چور وغیرہ سبھی افیمی گھگھو تھے جنہیں اندرونی شہر کی مائیں جنم

دیتی تھیں۔ انہیں شہر کا رہن سہن ایسا بنا تا تھا اور یہ مائیں بالکل بے بس ہوتی تھیں۔ وہ منّتیں مانگتی تھیں، خانقاہوں اور مندروں میں دیئے جلاتی تھیں، مسجدوں کے چراغوں کے لئے تیل نظر کرتی تھیں، تعویذ دھاگے اور کالے علم والوں کی تلاش کرتی تھیں کہ ان کے بچے آوارہ ہونے سے بچ جائیں۔

تیسری۔ چوتھی دہائی کا لاہور

لاہور کی پُرانی یادوں میں وہ بچپن بھی چھُپا ہوا ہے جسے آج یاد کرتا ہوں تو دل خوشی سے بھر جاتا ہے ——!

تیسری چوتھی دہائی کا لاہور آج کے لاہور سے بہت مختلف تھا۔ زندگی کی بنیادی ضروریات کو ہی پہل حاصل تھی۔ یہی حال تعلیم کا تھا لیکن دوسری جنگ عظیم کے قبل اندرونی شہر کے کھاتے پیتے گھرانے اپنے بچوں کو تعلیم دلانے کی ضرورت کو سمجھنے لگے تھے اور انہیں اسکول نہیں جانے والے بچّوں کے ساتھ گھومنے پھرنے سے منع کرتے تھے۔ اس کا نتیجہ تھا کہ شہر میں کئی پرائمری اسکول کھل گئے تھے۔ اندرونی شہر میں تب ہائی اسکول صرف دو ہی تھے جن میں ایک دیال سنگھ ہائی اسکول اور دوسرا رنگ محل مشن ہائی اسکول تھا۔ کالج کوئی نہیں تھا اور کچھ گھروں کے بچّے شہر سے باہر ریلوے روڈ پر قائم اسلامیہ کالج، دیال سنگھ کالج اور سناتن دھرم کالج میں پڑھنے جاتے تھے۔ اندرونی شہر میں زیادہ تر بچّے مستی دروازہ، شیراں والا دروازہ، بھاٹی گیٹ، پانی والا تالاب اور سعید مٹھا کے پرائمری اسکول میں پڑھنے جاتے تھے جہاں وہ ٹاٹ پر بیٹھ کر پڑھائی کرتے تھے۔ بچوں کو ''گاڈ سیو دی کنگ'' والی نظمیں یاد کرائی جاتی تھیں۔ گلیوں میں ٹیوشن بھی پڑھائی جاتی تھی۔ کئی مذہبی ادارے بھی تھے جو تعلیم دیتے تھے۔ مسلمان محلّوں میں قرآن کی تعلیم کا انتظام تھا اور ہندو محلّوں میں پنڈتوں پاندھوں نے پڑھائی کے مرکز کھولے ہوئے تھے۔ ہر محلّے میں ایک نہ ایک حکیم ضرور ہوتا تھا جو یونانی دوائیاں دیتا تھا اور اپنی بیٹھکوں میں بچوں کو قرآن بھی پڑھاتا تھا۔ لڑکیوں کو پڑھانے کا رواج نہیں کے برابر تھا۔ خاص کر مسلمان گھروں میں لڑکیوں کو صرف بہت عام سی تعلیم دی جاتی تھی۔ انہیں کڑھائی سلائی کا ہنر سکھایا جاتا تھا لیکن ہندو گھرانوں

کی لڑکیاں عام طور پر اسکولوں میں جاتی تھیں۔ اندرونی شہر میں ہندو لڑکیوں کے کئی اسکول اور پاٹھ شالائیں تھیں۔

جنڈی بیڑا میں اس دور کا شاید پہلا انگلش میڈیم اسکول بھی کھل گیا تھا۔ جہاں ہندو، سکھ اور مسلمان بچے پڑھتے تھے۔ اس کا نام مون لائٹ اسکول تھا۔ اندرونی شہر کے اس حصّے کے لوگوں کو مون لائٹ اسکول اس لئے پسند تھا کہ یہ اسکول ماسٹر خیر الدین قادری نام کے ایک آدمی نے کھولا تھا اور وہ خود بہت دلچسپ انداز میں بچوں کو پڑھاتے تھے۔ اس کے علاوہ کہیں کہیں تھڑوں پر بھی شام سے پہلے پڑھائی کا انتظام تھا جہاں اُستاد بچوں کو پہاڑے اور اُردو پڑھاتے تھے۔ یہاں ماں باپ بچوں کو مارتے ہوئے لاتے تھے اور بچے رو رو کر ''الف آم'' اور ''بے بلّی'' کا سبق یاد کرتے تھے لیکن اُس زمانے میں اندرونی شہر کے اسّی فیصدی بچّے ہوش سنبھالتے ہی محنت مزدوری کے چُنگل میں پھنس جاتے تھے۔ کوئی لوہارا کام سیکھ رہا ہوتا تو کوئی ترکھانا کام کر رہا ہوتا۔ بچّے اسکولوں میں جانے کی بجائے گلی محلّوں کی دودھ دہی، حلوائی اور کھانے پینے کی دوکانوں پر نوکر ہو جاتے تھے۔ جن کے ماں باپ کاریگر یا دوکاندار ہوتے تھے وہ ان کے کام میں ہاتھ بٹانے لگتے تھے۔ جن کا کوئی دوسرا کام نہیں ہوتا تھا وہ گلی کوچوں میں چھابڑیاں لگا لیتے تھے۔ کئی سبزی منڈی اور میوہ منڈی کا رُخ کرتے اور جن کا کچھ بھی کرنے کا دل نہیں کرتا وہ ادھر اُدھر بھٹکتے گلی کوچوں میں سارا دن کھیلتے رہتے۔ ایسے بچوں کو گھروں میں بند کر دیا جاتا تھا۔ وہ روشندانوں سے نکل کر باہر بھاگ جاتے تھے۔ انہیں ان کے ماں باپ منٹو پارک، قلعے کے آس پاس، بھاٹی دروازے کے باہر سینما گھروں سے پکڑ کر گھر لاتے تھے اور ان کی خوب پٹائی ہوتی تھی ——— اس وقت یہ سب لاہور کے عام لوگوں کی زندگی کا ایک حصہ تھا۔

تہذیب کا دروازہ

بھاٹی گیٹ لاہور کا ایک ایسا دروازہ ہے جس نے اس کی تہذیب کو سنبھالا ہوا ہے۔ یہی نہیں، یہ لاہور کا مستقبل بھی ہے ——!

لاہور شہر کے بارہ دروازوں کی باتیں ہم نے کئی بار کیں۔ ان میں بھاٹی دروازے کا ذکر بھی ہوا لیکن اس کی کہانی سب سے الگ لاہور کی تاریخ اور اس شہر کی تہذیب کی کہانی ہے۔ بھاٹی دروازے کے ظاہر اور باطن پر لاہور کی تاریخ کے اتار چڑھاؤ کے نشان بہت گہرے ہیں اور یہ دروازہ جو آج ''بھاٹی چوک'' کی شکل میں موجود ہے، پہلے اپنے گرانڈیل دروازوں سے شروع ہوتا تھا اور بازار حکیماں پر ختم ہو جاتا تھا۔ اس سے آگے محلّہ سمّیاں تھا اور دائیں بائیں کئی کھلی اور بند گلیاں تھیں۔ اب ان علاقوں کے سارے لوگ اپنے آپ کو بھاٹی دروازے کا بیٹا سمجھتے ہیں اور مدتوں تک دوسرے دروازوں کے اندر رہنے والے لاہورئیے بھاٹی چوک کا چکر لگا کر اپنی شام کی سیر مکمل کرتے ہیں۔

بھاٹی دروازے کی کہانی شاید مہاتما بدھ سے بھی پہلے شروع ہو چکی ہوگی کیونکہ دریا راوی اس کے پاس سے گذرتا تھا۔ صدیوں سے اس جگہ ایک گذرگاہ تھی اور اس دور میں جب بدھ کے بھکشوؤں کی یہاں سے گذرنے کی جھلکیاں نظر آتی ہیں تو ممکن ہے وہ اس سے پہلے بھی مسافر اپنی اپنی تہذیبوں کے ساتھ یہاں سے گذرتے ہوں گے اور کچھ چھوڑ جاتے ہوں گے، کچھ لے جاتے ہوں گے۔ کبھی کبھی قدیم ترین لاہور اس طرح وزن میں آتا ہے۔ جیسے لاہور شہر کے تہذیبی سفر کا آغاز بھاٹی دروازے سے ہوا تھا۔ یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ لاہور شہر کے ہر طرح کے پھیلاؤ

کا مرکز بھاٹی دروازہ ہی ہوسکتا ہے۔ ہر دور میں جیسے جیسے لاہور کا رنگ روپ بدلا، قصے افسانے بدلتے گئے، سماجی اور کلچرل پرتوں پر نئی پرتیں چڑھتی گئیں اور یہ حقیقت ہے کہ لاہور نے جب پھیلنا شروع کیا تو سب سے پہلے لاہور شہر بھاٹی دروازے کے راستے باہر نکل کر مزنگ، سانده، نواں کوٹ وغیرہ آبادیوں کی شکل میں ظاہر ہوا۔

بھاٹی دروازہ سبکتگین، محمود غزنوی، غوری، خلجی، بلبنی، سُوری اور آخر کار مغل حکمرانوں کے زمانے میں نمایاں ہوتا چلا گیا۔ الگ الگ رنگ ونسل، مذہبی عقیدہ، تہذیبوں اور پیشوں سے تعلق رکھنے والے لوگ آباد ہو کر مقامی آبادی کا حصہ بن گئے اور بھاٹی دروازے کے باہر ایک نئی زندگی ابھرنے لگی۔ اندرونی شہر میں جہاں پہلے زندگی الگ سی تھی، اب اس تہذیبی عمل میں شامل ہوگئی تھی۔ لاہور کی سرزمین میں جس پہلے انسان نے صوفی کا درجہ حاصل کیا وہ حسّو نامی انسان تھا اور اس کا تعلق بھاٹی دروازے سے تھا۔

برصغیر میں مغل حکومت کا سورج غروب ہونے تک بھاٹی دروازے کا کوئی کردار نظر نہیں آتا جبکہ انگریز برصغیر کی شاہ رگوں پر قبضہ کر کے ستلج تک آچکے تھے۔ مغلوں کی طرف سے تعینات گورنر اتنے کمزور نکلے تھے کہ وہ پنجاب کے ہتھیار بند سکھوں پر قابو نہیں پا سکے۔ 1810 میں حضر شاہ مقیم سے میر محمد لاہور میں داخل ہوا تو اس وقت لاہور کے تین حاکم تھے۔ سوبھا سنگھ، مہنا سنگھ اور گُجر سنگھ۔ مغرب سے لے کر بھاٹی دروازے تک سوبھا سنگھ کی عملداری تھی۔ میر محکم نے سوبھا سنگھ سے ملاقات کر بھاٹی دروازے کے باہر کھیتی باڑی کرنے کی اجازت حاصل کر لی اور بھاٹی دروازے کے اندر اپنا مکان بھی بنوالیا۔ اپنی قابلیت سے اس نے میر مُحکم کو متاثر کیا اور اس پر اپنا بھروسہ قائم کر لیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اس نے میر مُحکم کو بھاٹی دروازہ اور لاہوری دروازہ کا انچارج بنا دیا۔ اس وقت محنت کشوں اور تاجروں کی کمائی ان تینوں حاکموں میں تقسیم ہو جاتی تھی۔ اس کے باوجود یہ تینوں حاکم اتنے کمزور تھے کہ فصیلیں پھاند کر شہر میں داخل ہونے والوں کی روکنا ان کے قابو میں نہیں تھا۔ ان حالات کا فائدہ میر مُحکم نے اٹھانے کی کوشش تیز کر دی اور لاہور میں اپنے پاؤں پسارنے لگا۔

پایل کے سائیں

لاہور میں بڈھن سائیں کی اپنی عجب داستان ہے۔ یہ کہانی دلچسپ تو ہے ہی، ساتھ ہی وہاں کی تہذیب کو بھی بتاتی ہے ——!

ایک آدمی کا نام تھا بڈھن سائیں اور ہیرا منڈی میں اس وقت کی طوائفوں کی نئی نسل کو سائیں سے بے حد عقیدت تھی۔ سائیں جب کبھی کسی طوائف کے چوبارے میں چلا جاتا تو وہ سمجھ لیتی کہ خُدا اس پر مہربان ہوگیا ہے۔ بازارِ حُسن میں دن رات گھومنے والے اس جٹا دھاری سائیں کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ سائیں ولی اللہ ہے اور ان کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ بے اثر نہیں ہوتے۔ صرف طوائفیں ہی نہیں ہر کوئی سائیں کو خوب پہچانتا تھا۔ یہاں تک کہ گشت کرتے تھانیدار کو بھی اگر سائیں سامنے سے آتے دکھائی دے جاتے تو تھانے دار راستہ چھوڑ دیتا۔ سائیں کا ٹھکانہ ہیرا منڈی کے بازار شیخو پوریاں کا ایک مکان تھا جہاں سے وہ کئی کئی دن اگر باہر نہ نکلتے تو ہیرا منڈی میں ہر کوئی سوچنے لگتا کہ شاید بازار پر کوئی آفت آنیوالی ہے۔ کہتے ہیں کہ جھورے گُجّر نام کے ایک آدمی نے ایک بار سائیں کو جھڑکا تو اچانک وہ ریہڑے سے گر کر مر گیا اور پھر کچھ ہی دنوں میں ایک کے بعد ایک بازار میں اتنی موتیں ہوگئیں کہ سب سمجھنے لگے کہ یہ سائیں کو جھڑکنے کا نتیجہ ہے۔ تب شاہی محلّے کے لوگوں نے سبھی طوائفوں کا ایک جلسہ بلایا اور فیصلہ ہوا کہ نیاز دی جائے اور سائیں سے دُعا کرائی جائے۔ اس فیصلے کے مطابق مشہور طوائفیں سائیں کے کمرے تک پہنچیں۔ سائیں پچھلے ایک ماہ سے اپنے کمرے میں بند تھے۔ بازار میں دیگیں پکتی رہیں۔ طوائفیں دن بھر کمرے کا دروازہ کُھلنے کے انتظار میں بیٹھی رہیں اور جب شام کو دروازہ

کھلا، سائیں مسکراتے ہوئے باہر نکلے تو نیاز تقسیم ہونے لگی۔ اس واقعہ نے ہیرامنڈی میں سائیں کی شخصیت کو بہت زیادہ اہمیت عطا کردی۔

بڈھن سائیں کون تھا، طوائفوں کی نئی نسل اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی۔ لیکن زیادہ عمر کی طوائفوں کے بڑھاپے کے ساتھ ایک عجیب کہانی آگے بڑھی تھی جس کا مرکزی کردار بڈھن سائیں تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ لاہور کی ہیرامنڈی صرف بازارِ حُسن ہی نہیں تھا بلکہ اس کی کوکھ سے ایسی ہی روز نئی کہانیاں جنم لیتی تھیں۔ کہانیاں پیدا ہوتیں اور دم توڑ دیتیں لیکن بڈھن سائیں جیسی کوئی کوئی کہانی ایسی ہوتی جو چرچا کا موضوع بن جاتی۔ ملک کے بٹوارے تک دیوانگی کی حالت میں رہنے کے بعد سائیں مر گئے تو اس کی کہانی بے نقاب ہوئی۔ لوگ انہیں درویش سمجھتے تھے جس نے اپنے پاس کفن کی فکر بھی نہیں رکھی تھی اور جب وہ مرے تو لوگ یہ سُن کر حیرت میں پڑ گئے کہ درحقیقت وہ ایک کروڑ پتی انسان تھے۔ مرتے وقت بھی وہ ایک کروڑ پتی ہی تھے۔ موت کے بعد بہت بہت کھوج بین کرنے پر ایک اخبار کے رپورٹر نے جب سائیں کی زندگی سے پردہ ہٹایا تو پتہ چلا کہ سائیں کا اصلی نام جے گوپال تھا اور وہ شاہدرہ کے ایک دولتمند ہندو ساہوکار لالہ ملکھی رام کا بیٹا تھا۔ لالہ ملکھی رام ایک نیک انسان تھے اور ہندو سماج میں ان کی بہت عزت کی جاتی تھی۔ جو گوپال کو بھی شروع میں ہندو دھرم کی تعلیم دی گئی تھی۔ ان کی ماتا دھارمک خیالات والی ایک ایسی درویش عورت تھیں کہ ان کی وفات کے بعد شمشان بھومی کے نزدیک اُن کی یاد میں ایک عالیشان دیوی ماتا کا مندر بنایا گیا تھا۔ یہ ''ماتا کا مندر'' نام سے بہت مشہور ہوا اور ملک کی تقسیم سے پہلے تک لوگ دور دور سے زیارت کے لئے یہاں آتے تھے۔ مقبرہ جہانگیر کے پیچھے شاہدرہ کے موڑ پر اس مندر کے نشان آج بھی موجود ہیں۔

جے گوپال جوان ہوا تو اس کہانی نے ایک نیا موڑ لے لیا۔ اچانک اُس نے ماتا کے مندر سے منہ موڑ لیا اور مندر کی مقدّس سیڑھیاں چڑھنے کی بجائے ہیرامنڈی میں طوائفوں کے چوباروں کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ اس کے کان مندر کی دلکش گھنٹیوں، گیتوں اور بھجنوں سے نا آشنا ہوگئے اور اس نے اپنا دل پائل کی جھنک اور طبلے کی تھاپ سے لگالیا۔

بُڈھن سائیں

بُڈھن سائیں کی زندگی میں اچانک یہ تبدیلی کیسے آئی اور کیسے وہ مذہبی لبادہ اتار کر ایک نئے ماحول اور نئی دنیا میں داخل ہو گئے ـــــ آیئے، اس کہانی کو پڑھتے ہیں ـــــ!

بات بُڈھن سائیں کی ہو رہی تھی جس نے اپنا دل پائل کی جھنکار اور طبلے کی تھاپ سے لگا لیا تھا ـــ طوائفیں دراز قد، خوبصورت اور ان پر دولت لٹانے والے شہزادے جے گوپال کی آمد کی منتظر رہنے لگیں۔ شاعر مزاج جے گوپال نے خود کو ناچ گانے میں کھو دیا اور اس کے دن رات طوائفوں کے چوباروں میں گذرنے لگے۔ اسی دوران جے گوپال میں ایک تبدیلی ہوئی اور اس کی واقفیت کچھ ایسے لوگوں سے ہوئی جن کا تعلق الگ الگ مذہب سے تھا اور خُدا اور خدائی کے مختلف پہلوؤں پر بحث کیا کرتے تھے۔ جے گوپال کو اس موضوع نے متاثر کیا اور رنگ و نغمہ کی محفلیں سجانے کے ساتھ ساتھ وہ صوفی لوگوں کی قربت میں بھی رہنے لگا۔ دیکھنے والے حیران ہوتے کہ ایک طرف ہیرا منڈی کی خوبصورت طوائفوں کی دنیا اور دوسری طرف صوفی سنت۔ جے گوپال کی ذہنی بے چینی بڑھتی گئی اور مختلف مذاہب کے مطالعے سے اُسے اچانک کائنات کی آخری سچائیوں کا شدید احساس ہوا اور اسی کی تلاش اُس کی زندگی کا مقصد بن گیا۔
حُسن، موسیقی اور طوائفوں کے خریدار کی رُوح جب بے چین ہو گئی تو اس نے اسلام مذہب قبول کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کی شخصیت ہندوؤں اور مسلمانوں میں چرچا کا موضوع بن گئی۔ جے گوپال کے خاندان والوں نے اُسے اپنے ہندو سماج سے تو نکال دیا لیکن جائیداد سے بے دخل نہیں کر سکے۔ مسلمانوں کا خیال تھا کہ جے گوپال نے کسی مسلمان خاتون سے شادی

کرنے کے لئے اسلام قبول کیا ہے لیکن سچائی کا کسی کو پتہ نہیں تھا۔ اب تک جے گوپال بڈھن سائیں کے نام سے مشہور ہو چکا تھا۔ یہ راز بھی کھل گیا تھا کہ اس نے اقبال بیگم نام کی ایک عورت سے شادی کر لی تھی اور اُس کے ایک لڑکی بھی پیدا ہوئی۔ اس راز کے کھلتے ہی ہندو سماج میں کھلبلی مچی اور اُسے اچھوت قرار دے دیا گیا۔ اسی دوران اس کے باپ کی موت ہوگئی اور وہ اکیلا بہت بڑی جائیداد کا مالک بن گیا۔ اس سے قبل اقبال بیگم سے اُس کی علیحدگی ہوگئی تھی۔ اقبال بیگم نے جج سکھانند کی عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا کہ وہ بھی جائیداد کی حق دار ہے۔ مقدمے کے دوران جب بحث چل رہی تھی تو جج کی کسی بات پر جے گوپال کو اتنا غصّہ آیا کہ اُس نے جج کو تھپڑ مار دیا اور اُسے تین سال کی قید ہوگئی۔ قید میں ایک بار پھر اُس کی زندگی بدل گئی اور تین سال بعد جب وہ جیل سے باہر آیا تو وہ شاعر بن چکا تھا۔ اسی دوران اقبال بیگم بھی مر گئی۔ جے گوپال اب مکمّل طور پر صوفی شاعر بڈھن سائیں بن چکا تھا۔

لاہور میں آج بڈھن سائیں کا ایک مزار ہے جہاں سالانہ عُرس ہوتا ہے اور دُوسرے طبقے کے لوگوں کے علاوہ طوائفیں خاص طور سے وہاں حاضری بھرتی ہیں۔ یہ عجیب وغریب داستاں دہاکوں سے دل میں ایک کہانی کی طرح بسی ہوئی ہے۔ کئی بار اس سائیں کا لوگوں کا ان میں یقین کا احساس شاعری میں بھی آتار ہا اور لاہور کے معصوم لوگوں کے چہرے دل میں بسے رہے۔

صرف یہی نہیں لاہور کے لوگوں کا اور بھی کئی طرح کا یقین دل کے کسی کونے میں بسا ہوا ہے جسے کبھی بھی درگذر نہیں کیا جا سکتا۔

سبحان تیری قدرت

لاہور کی عام زندگی بھی خوب ہوتی تھی ——دِل والے لوگوں کی زندگی۔ آیئے اسی زندگی کے حوالے سے اس کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں یہاں جانتے ہیں——!

لاہور شہر کی زندگی تیوہاروں، میلوں اور عُرسوں کے رنگوں، خوشبوؤں اور گیتوں میں بہت پُر جوش، شوخ اور مکمل طور پر زندہ لگتی تھی۔ لاہور کی ہر صبح ایک نئی سرگرمی کی خوشخبری لے کر طلوع ہوتی تھی اور ہر شام ایک نئی مصروفیت کے ساتھ شہر میں داخل ہوتی تھی۔

اندرونی شہر کے لوگ پرندے اور جانور بہت شوق سے پالتے تھے۔ ان میں مُرغ، بٹیر، تیتر، کبوتر، سُرخ، ہرن، کُتّے، بندر، بھیڈو، بکرے، چھترے وغیرہ شامل تھے۔ ان جانوروں اور پرندوں کے مقابلے محلّہ وار ہوتے تھے اور کبھی یہ لاہور میں بڑے پیمانے پر بھی کرائے جاتے تھے۔ یہ مقابلے ماہر استادوں کی نگرانی میں ہوتے تھے اور کئی بار یہ مقابلے تیوہار یا میلے کی شکل اختیار کر لیتے تھے۔ چھٹّی کے دن، چاہے اتوار کی ہو یا کسی تیوہار کی، شہر سے باہر باغوں میں پالیاں لگتی تھیں۔ شہر والے اپنے پرندے یا جانور لے کر شہر سے باہر جاتے تھے اور ان کے ساتھ ان کے حمایتی بھی ہوتے تھے۔ ہر مقابلے پر شرطیں لگائی جاتی تھیں۔ مُرغوں، بٹیروں، تیتروں اور سُرخوں کے مقابلے شہر کے اندر ہی ہوتے تھے لیکن لاہور کے منٹو پارک میں کتّوں اور دُمبوں کا مقابلہ ہوتا تھا۔ ان میں خونخوار کُتّے اور گینڈے کی طرح مضبوط پرورش کیے ہوئے بھیڈو لائے جاتے تھے۔ اصل مقابلہ کُتّوں اور بھیڈووٗں کا ہوتا تھا۔ ایک طرف کی منڈلی میں کتّوں کا مقابلہ ہوتا تو دوسری طرف بھیڈووٗں کے شوقین جمع ہوتے۔ کتّوں کی لڑائی خوفناک ہوتی تھی اور

دو تین گھنٹے جاری رہتی تھی۔ بھیڈو جب ایک دوسرے کے سامنے آ کر اپنے کھُر زمین پر مار کر پہل کرنے کا جتن کر رہے ہوتے تو اوپر سے اپنے اپنے بھیڈو کو حوصلہ دینے کے لئے مختلف قسم کی آوازیں نکالی جاتیں تھیں۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ کوئی بھیڈو مخالف بھیڈو سے آمنا سامنا ہوتے ہی پیچھے مُڑتا اور میدان چھوڑ کر بھاگ جاتا تو اس بھیڈو کے مالک کی شرمندگی دوسروں کے لئے ہنسی مذاق کی وجہ بن جاتی۔

گلی محلّوں میں بٹیر بازی اور تیتر بازی ایک مقبول تفریح تھی اور کئی بٹیر باز تو دن بھر ایک نہ ایک بٹیر ہاتھ میں رکھتے تھے۔ کام کاج کے دوران بھی بٹیر کو ہاتھ سے نہیں چھوڑتے تھے۔ تیتر صبح ہی پنجروں میں بولنے لگتے تھے اور ان کی آواز سے یوں لگتا تھا کہ کہہ رہے ہوں— ''سبحان تیری قدرت''۔ سُرخ چڑیاں جن کے پروں پر سفید دانے ہوتے تھے، صبح سویرے ان کی آوازیں سُن کر یہ محسوس ہوتا تھا کہ وہ قرآن کی آیت کی تلاوت کر رہی ہیں۔ ان ننھی ننھی سُرخ چڑیوں کو مسلمان گھرانوں میں بہت شوق سے پالا جاتا تھا اور نہ چڑیوں کا مقابلہ کرایا جاتا تھا۔

کبوتر بازوں کی بھی اندرونی شہر میں اپنی خاصیت تھی اور ماہر کبوتر باز سارا سارا دن کوٹھوں کی چھتوں پر چڑھ کر آسمان میں نظریں گڑائے رہتے تھے جہاں ان کے کبوتر اڑانیں بھر رہے ہوتے تھے۔

فصیلوں والے شہر لاہور کے اندر زندگی کی سرگرمیوں کی اَن گنت شکلیں اور شغل تھے جو صدیوں سے شوق بن کر لاہور کی زندگی کا اٹوٹ حِصّہ بن گئے تھے۔

جُرمِ اُلفت

لاہور کی تاریخ میں شہزادہ سلیم اور انارکلی کا عشق دُنیا بھر میں مثال بنا ہوا ہے — یہاں کچھ اس بارے میں —!

لاہور شہر کی جس طرح دنیا بھر میں اپنی ایک خاص پہچان ہے اسی طرح لاہور میں انارکلی بازار کی بھی اپنی ایک الگ پہچان اور اہمیت ہے۔ انارکلی بازار نہ صرف پاکستان بلکہ ہندوستان میں بھی اپنی رونق، چہل پہل اور اپنے دلکش شگفتہ نام کی وجہ سے بے حد مشہور ہے۔ ساتھ ساتھ یہ بات بھی بہت عجیب ہے کہ اس کی اصل وجہ سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ اس بات کا تو شاید کسی کو گمان بھی نہ ہو کہ وجہ ایک ایسی عورت تھی جس کی بے پناہ خوبصورتی نے اکبری محلوں میں شہزادیوں اور شاہی بیگمات کو پریشان کر رکھا تھا۔

اس کا اصل نام نادرہ بیگم بتایا جاتا ہے۔ وہ بادشاہ اکبر کی شاہی کنیزوں میں سب سے زیادہ حسین و جمیل تھی اور اسی وجہ سے اکبر کی اس قدر منظورِ نظر بھی تھی کہ حرم سرا میں تمام بیگمات اس کے اثر سے خوفزدہ رہتی تھیں۔ بادشاہ نے اپنی اس کنیز کا نام انارکلی رکھا جس کا چہرہ گل انار کی طرح لال سرخ تھا۔ کہا جاتا ہے کہ شہزادہ سلیم اور انارکلی خفیہ طور پر آپس میں محبت کرتے تھے۔

عشق اور مُشک کبھی چھپے نہیں رہ سکتے۔ رازِ محبت بیشک لاکھ پردوں میں ہے، پھر بھی کھل ہی جاتا ہے۔ آہستہ آہستہ ان کے عشق کی خبریں بادشاہ تک پہنچنے لگیں۔

ایک بار اکبر شیش محل میں بیٹھے تھے۔ انارکلی بھی موجود تھی اور شہزادہ سلیم بھی وہاں آ گیا۔ دونوں کنکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے اور آنکھوں ہی آنکھوں میں پیار کا اظہار کرنے لگے۔ اکبر کی نگاہ بہت دُور رس تھی۔ وہ یہ تمام حرکتیں اپنے آئینہ خانے میں دیکھ رہے تھے۔ شاہی

کنیز اور وہ بھی اکبر کی خاص کنیز اور اُس کی شہزادے کے ساتھ دِل لگی ــــ بادشاہ کے نزدیک یہ جُرم نا قابلِ برداشت تھا۔

یہ درست ہے کہ اکبر بہت ہی رحمدل تھے لیکن کئی حالات میں بے رحم بھی تھے۔اس کے نزدیک انارکلی اور سلیم کی محبت بہت بڑا جرم تھی۔ دونوں مجرمانِ عشق برابر سزا کے سزاوار تھے مگر سلیم شہزادہ تھا، ولی عہد تھا، لختِ جگر تھا ــــ بچ گیا لیکن انارکلی کو جُرم الفت کی وہ سزا ملی جس کی اکبر جیسے شہنشاہ سے کم اُمید تھی۔ اُس نے انارکلی کو زندہ زمین میں چُنوا دینے کا حکم دیا اور اس شاہی حکم کے مطابق انارکلی کو لاہور کے اس مقام پر جہاں آج مقبرہ انارکلی کی عالیشان عمارت اب تک اشکِ حسرت بہا رہی ہے، کھڑا کیا گیا اور اس کے اردگرد اینٹوں کی دیوار چُنوا دی گئی۔اس حُسن کی دیوی نے وہاں گھُٹ گھُٹ کر جان دے دی۔ یہ واقع 1599 کا ہے۔

سلیم کو خبر ملی لیکن وہ کچھ کر نہیں سکتا تھا۔ تیرہ اکتوبر 1605 کو باپ کی موت کے بعد جب وہ پہلی بار لاہور آیا تو اسی جگہ جہاں اس کی محبوبہ انارکلی کو دیوار میں زندہ چُنوایا گیا تھا، ایک عالیشان مقبرہ اور شاندار باغ تعمیر کئے جانے کا حکم دیا جو 1615 میں مکمل ہوا۔

انارکلی کے مقبرے پر فارسی زبان میں ایک شعر درج ہے جو سچ مچ شہزادہ سلیم کے عشق حقیقی کے جذبے کو بیان کرتا ہے۔ اس مقبرے پر لگے سنگِ مرمر پر اتنی نفیس اور خوبصورت میناکاری کا کام کیا ہوا ہے کہ ایک یورپین مسافر نے اس بارے لکھا تھا ــــ ''یہ دنیا میں سب سے نفیس سنگ تراشی کے کاموں میں سے ہے۔''

قلعے کے درمیان

لاہور کے قلعے کی بہت اہم تاریخ ہے۔ اس تاریخ میں اور بھی بہت ساری عمارتیں جُڑی ہوئی ہیں — یہاں ان کے بارے میں ——!

لاہور کا قلعہ شہر لاہور کی خاص پہچان ہی نہیں بلکہ اس کے ساتھ ایک لمبا اتہاس بھی جُڑا ہوا ہے۔ عہد اکبری میں یعنی مغل بادشاہ اکبر نے پہلے سے موجود پرانے قلعے کی جگہ پر لاہور کا شاندار قلعہ تعمیر کرایا۔ اس میں عالیشان محل بنوایا اور اسے اتنی وسیع شکل دی کہ اس میں پورا ایک شہر آباد ہوسکتا تھا۔ لاہور کے اس قلعے نے اکبر کے زمانے کے جلسے، قتل وغارت کے ہنگامے، خوشی اور غم اور حکمرانی کی کبھی نہ بھلائی جانے والے واقعات وحادثات دیکھے ہیں۔

اکبر کے بعد جہانگیر نے قلعے میں کئی نئی عمارتیں تعمیر کرائیں۔ 1626 میں سر ٹامس ہربرٹ نامی ایک انگریز نے جہانگیر کی موت سے ایک سال قبل لاہور کو دیکھا اور اپنے سفرنامے میں قلعے کی عمارتوں کے بارے میں لکھا —— "قلعے کے اندر ایک محل ہے جس کے دو دروازے ہیں۔ دیواروں پر کئی تصویریں لگی ہوئی ہیں جن میں آصف جاہ، راجہ جگن ناتھ اور مرزا شریف کی تصویریں بھی ہیں۔ راجہ رام داس، راجہ مان سنگھ، راجہ رنجیت سنگھ اور راجہ بیر سنگھ وغیرہ کئی غیر مسلم راجاؤں کی تصویریں بھی ہیں۔ دروازوں پر یسُوع مسیح اور حضرت مریم اور صلیب کی تصویریں ہیں۔ ایک جگہ پر بابر اپنے درباری اُمراء کے ساتھ موجود ہے۔ ان تمام تصویروں کا آرٹ ہندو آرٹ سے متاثر ہے۔ جہانگیر کو لاہور بہت پسند تھا اور اس نے اپنی زندگی کے آخری سال اپنی پیاری بیگم ملکہ نور جہاں کے ساتھ اسی شہر اور اسی قلعے میں گذارے۔ اس کے بعد شاہجہاں نے بھی قلعے میں کئی نئی عمارتیں تعمیر کرائیں۔ جس دروازے پر آج بھی سپاہی پہرہ دیتا ہے اور جو

مہاراجہ رنجیت سنگھ کی سمادھی کے ٹھیک سامنے ہے اسے طے کرنے کے بعد ایک اور دروازہ حضوری باغ کے سامنے آتا ہے جسے ہاتھی پاؤں، ہاتھی پول یا ہاتھی پوڑ دروازہ کہتے ہیں۔ یہاں سے حرم سرائے کی عورتیں اور بیگمات ہاتھیوں پر سوار ہو کر لاہور کے باغات کی سیر کیا کرتی تھیں۔ مغربی دیوار کے قریب ثمن بُرج اور شیش محل موجود ہیں۔ قلعے کی یہ عمارتیں آج بھی محفوظ ہیں۔ مغرب کی طرف ہی ایک نولکھا محل ہے جس کی حالت اب خستہ ہو چکی ہے۔ اسے پتھر کے خوبصورت پھولوں سے، جو دیواروں پر بنے ہوئے ہیں، سجایا گیا ہے۔ کہتے ہیں کہ اس زمانے میں اس پر نو لاکھ روپے خرچ ہوئے تھے۔ اسے شاہجہاں نے بنوایا اور اورنگ زیب نے مکمل کروایا تھا۔

قلعے کے اندر مسجدوں کے علاوہ ایک مندر بھی ہے جو اب تک محفوظ ہے۔ یہ مندر ایک گہرے تہہ خانے میں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ چھوٹا سا وہ مندر بھگوان رام چندر کے بیٹے راجہ لوہ (لَو) جنہوں نے لاہور قائم کیا، کا بنوایا ہوا ہے۔ مندر کی سطح اور قلعے کی باہری سطح کیونکہ برابر ہے۔

اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مندر بہت پرانا ہے اور قلعے کی تعمیر کرنے والوں نے اسے صحیح سلامت رہنے دیا۔ گیارہ دسمبر 1923 کو محکمہ آثار قدیمہ کی طرف سے اس کی چاروں طرف صفائی کھدائی شروع کرائی گئی۔ مندر کے برابر ہی ایک گہرا کھڈھا ہے جس میں ایک خستہ سا گنبد نظر آتا ہے۔ کھڈھے کی یہ سطح دو فٹ اوپر تک پتوں اور مٹی سے دبی ہوئی ہے۔ کھدائی کے دوران تیرہ دسمبر کو یہاں سے جو کنکال برآمد ہوئے انہیں دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس دور کے لوگ قد کاٹھ میں زیادہ لمبے اور طاقتور تھے۔ محکمہ آثارِ قدیمہ کے مطابق یہ کنگال مہاتما بدھ سے بہت پہلے کے زمانے کے ہیں۔

1798ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے لاہور فتح کیا اور اسی قلعے میں رہائش رکھی۔ انگریزوں کے زمانے میں قلعے کے دونوں بڑے دروازے بند کرا دیئے اور کئی تاریخی عمارتوں کو گرا کر وہاں فوجی بیرکیں بنوا دی گئیں۔

سلیم کی داستان

لاہور کی تاریخ میں جہانگیر بادشاہ کا جو دور ہے، کئی وجوہات سے زیرِ بحث رہا ہے۔ اس دور کو لوگوں کی یادوں میں رنگین دور کے طور پر بھی ہم دیکھتے ہیں ـــــــ!

مغل بادشاہ اکبر کے بیٹے سلیم (جو بعد میں مغل بادشاہ جہانگیر کے نام سے جانے گئے) جودھا بائی عُرف مریم زمانی کی کوکھ سے پیدا ہونے والے اکبر کی پہلی اولاد تھے۔ اکبر کے دوسرے بیٹے دانیال اور تیسرے مراد تھے۔ یہ تینوں اولادیں مغل حکومت کی تاریخ میں اپنی عیاّشی کی بہت سی داستانیں چھوڑ گئیں۔ سلیم (جہانگیر) کی عیاشیاں تو لا مثال تھیں۔

شہزادہ سلیم نے بادشاہ جہانگیر بننے سے پہلے پانچ شادیاں کیں اور چھٹی شادی جہانگیر کے روپ میں بادشاہ بننے کے بعد کی۔ صرف سولہ سال کی عمر میں تیرہ فروری 1586 کو سلیم کی شادی آمیر کے راجا بھگوان داس کی بیٹی مان بائی (شاہ بیگم) سے ہوئی۔ دوسری شادی 17 سال کی عمر میں راجا اودے سنگھ کی بیٹی سے ہوئی اور کچھ ہی وقت بعد تیسری شادی ایک ایرانی رئیس خواجہ حسین کی بیٹی سے ہوئی۔ راجا کیشو دار کی بیٹی سے اس نے چوتھی شادی کی اور راج گدّی پر بیٹھنے کے بعد اس نے پانچویں شادی اپنے اُستاد قائم خاں عرب کی بیٹی سے کی۔ چھٹی اور آخری شادی تخت نشینی کے چھ ماہ بعد مئی 1611 میں اپنی پرانی معشوقہ مہر النسا (نور جہاں) سے کی۔ کہا جاتا ہے کہ سلیم (جہانگیر) کی یہ چھ شادیاں باقاعدہ تھیں۔ ان کے علاوہ نہ جانے اس نے اور کتنی شادیاں کی ہوں گی۔

آئینہ ضمیر میں اپنا بدن نہ دیکھ
شاید تیرا بدن تجھے عریاں دکھائی دے

بادشاہ ایک بے حد رنگین مزاج انسان تھے۔اس کی رنگین مزاجی کی ایک وجہ حد سے زیادہ شراب نوشی تھی۔وہ ایک دن میں لگ بھگ بیس پیالے شراب پیتے تھے۔کہتے ہیں کہ وہ چودہ پیالے سارے دن میں اور چھ پیالے رات کو پیتے تھے۔وہ دو دفع کشید کی گئی شراب کا استعمال کرتے تھے۔اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آخری عمر میں وہ شراب کا پیالہ اپنے ہاتھ سے منہ تک نہیں لے جاسکتے تھے۔نور جہاں کے بہت کہنے پر ایک بار اس نے شراب چھوڑی بھی لیکن محض قلیل مدّت کے لئے ہی۔اگر چہ جہانگیر خود شراب پیتے تھے۔لیکن انہوں نے ملک بھر میں شراب پینے پر پابندی لگا رکھی تھی۔زیادہ شراب نوشی کے علاوہ جہانگیر کی جوانی بھی داغدار تھی اور وہ عیش پرستی و رنگ رلیاں منانے کے عادی تھے۔قدرتی حُسن سے اسے بے حد پیار تھا اور عالیشان باغ لگوانا اس کا محبوب ترین شوق تھا۔

جہانگیر کے دونوں بھائی دانیال اور مُراد بھی بلا کے مے نوش تھے۔اکبر کے لاکھ سمجھانے اور کوشش کرنے کے باوجود وہ شراب نوشی سے باز نہیں آئے اور جوانی میں ہی زیادہ مے نوشی کے باعث ان دونوں کی موت ہوگئی۔

مارچ 1606 میں جب شہزادہ سلیم بادشاہ جہانگیر بن کر تخت نشین ہوا تو سب سے پہلے اس نے جشن نوروزہ منایا اور اس جشن میں جہانگیر نے اٹھارہ دنوں تک رنگ رلیاں منائیں اور شراب، شباب و بدمستیوں میں ماحول ڈوبا رہا۔

جہانگیر کو لاہور سے خاص لگاؤ تھا اور کابل و کشمیر جاتے ہوئے وہ اپنا خاص دربار لاہور میں منعقد کیا کرتا تھا۔

انارکلی اور سلیم کا عشق

انارکلی اور شہزادہ سلیم کے عشق کی کہانی اُس مقبرے میں دفن ہے جو سلیم کے ذریعے اپنے باپ بادشاہ اکبر کی موت کے بعد لاہور میں تعمیر کرایا گیا تھا۔ اس خوبصورت عمارت کی چھت پر جس کے نیچے حُسن و عشق کی زندہ تصویر دفن ہے، ایک بہت بلند گُنبد ہے جو قدیم مُغل دور کے فنِ تعمیر کا بہترین نمونہ ہے۔ اس کے نیچے آٹھ بڑی محرابیں ہیں۔ اس کا دائرہ مشرق سے مغرب تک 75 فٹ 6 انچ ہے۔ یہ گنبد دو منزل ہے۔ روشن دان، جالی دار، بُرجیاں، کھڑکیاں، دروازے اور محرابیں بہت بڑی تعداد میں تھے لیکن وقت اور حکومتوں کی تبدیلی کے ساتھ ہی اس عمارت یعنی انارکلی کے مقبرے میں بھی تبدیلیاں کی جاتی رہیں۔

مقبرے کے باغ میں بہت سی خوبصورت عمارتیں بھی سلیم (بادشاہ جہانگیر) کے حکم سے تیار ہوئی تھیں۔ اُس زمانے میں دریائے راوی مقبرے اور باغ کی دیواروں کے ساتھ بہتا تھا۔ داراشکوہ نے اپنی ایک تحریر میں اس مقبرے اور باغ کا ذکر کیا ہے۔ اسی تحریر میں وہ حضرت میاں میر کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ شہر کے جنوب کی طرف انارکلی باغ کے اُس گنبد میں جو اسی باغ کی جنوبی دیوار کے کونے میں قائم ہے، حضرت کبھی کبھی دن کے وقت جا کر وہاں آرام فرمایا کرتے تھے۔

بادشاہ عالمگیر کے بعد بگڑے ہوئے حالات کے دوران بھی باغ اور مقبرے کی عمارت پر کوئی آفت نہیں آئی تھی اور وہاں نصب قیمتی پتھر تک محفوظ رہے تھے۔ 1821 میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اس باغ کو چھاؤنی بنا کر جنرل ونتورا کے ماتحت فوج کی چار پلٹنیں قائم کر کے اسے پریڈ گراؤنڈ بنا دیا تھا اور انارکلی کی قبر کا تعویذ بھی ان حالات کی نذر ہو گیا تھا۔ اس تعویذ پر ربِّ خدا کے

99نام لکھے ہوئے تھے۔ مقبرے کا چبوترا جو تعویذ کی طرح ہی سنگِ مرمر کا بنا ہوا تھا، اسے صحیح و سالم اُتروا کہ کہتے ہیں کہ دربار صاحب امرتسر بھجوا دیا گیا تھا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے 1816 میں جب اپنے ولی عہد کھڑک سنگھ کو باقاعدہ ولی عہد بنانے کے اعلان کے لئے ایک بہت بڑے جشن کی تیاری کی تو اس تقریب کے لئے مقبرہ انارکلی کی جگہ ہی چُنی گئی اور وہاں پنجاب کے نامی سرداروں، راجاؤں اور جاگیرداروں کے خیمے لگا دیئے گئے۔ مقبرہ انارکلی پر یہ تقریب کئی روز چلی۔ ہزاروں لوگ اس جشن کو دیکھنے نزدیک اور دور سے یہاں آئے۔ نجومیوں اور جیوتشیوں نے اس جشن کا مہورت پندرہ ماگھ تجویز کیا تھا۔ مہاراجہ نے کھڑک سنگھ کو اپنے روبرو اپنے ہاتھ سے مسندِ شاہی پر بٹھایا تھا اور تمام اہلِ دربار سے نذریں دلوائیں اور کئی دنوں تک یہاں ہنگامہ عیش و عشرت جاری رکھا۔

1849 میں انگریزوں نے جب پنجاب پر اپنا کنٹرول قائم کیا تو اس وقت مقبرہ انارکلی کا نام وہاں مہاراجہ رنجیت سنگھ کی فوجوں کے ٹھہرنے کی وجہ سے ''چھاؤنی انارکلی'' مشہور تھا۔ انگریزوں نے اس کی مرمت کرائی اور اس مقبرے کو پروٹیسٹنٹ گرجے کے نام سے استعمال کرنے لگے اور اس کا نام ''سینٹ جیمز چرچ انارکلی'' رکھا۔ یہاں سے زمین کھود کر انارکلی کی لاش باہر نکالی اور اُسے ایک ستون کے نیچے دبا دیا گیا۔ 1884 یا اس کے کچھ عرصہ بعد تک یہ مقبرہ گرجہ گھر کے طور پر استعمال ہوتا رہا اس کے بعد اس عمارت میں کچھ تبدیلیاں کر کے اسے فائنشیل کمشنر میں بدل دیا گیا جو اَب تک وہاں قائم ہے۔ لاہور میں سب سے بڑا پہلا کلاک جب آیا تو اُسے اسی گرجہ گھر یعنی مقبرہ انارکلی میں لگایا گیا۔ اس زمانے میں لاہور کے لوگ جب اس کلاک کی آواز سنتے تھے اور یہ دیکھتے تھے کہ یہ آواز خود ہی نکل رہی ہے تو بہت حیران ہوتے تھے۔

نُور جہاں — سلیم اور جہانگیر

مغل دور میں جن کا بہت چرچا رہا ان میں ایک اہم نام نُور جہاں کا ہے جو بے حد خوبصورت تھی، عقلمند اور ماہر منتظم تھی۔ وہ بہت دلیر اور حوصلہ مند خاتون بھی تھی اور اُسے آرٹ سے خاص لگاؤ تھا۔ شہنشاہ اکبر کے زمانے میں نور جہاں کے والد مرزا غیاث کی رسائی دربار تک ہوگئی اور نور جہاں کی ماں شاہی محلوں میں آنے جانے لگی۔ اُسے شاعری اور فن مصوّری میں مہارت حاصل تھی جس کی وجہ سے اس نے جلد ہی بیگمات سے تعلقات قائم کر لئے۔ اپنی ماں کے ساتھ نور جہاں بھی شاہی محلوں میں موجود رہتی۔ آہستہ آہستہ ماں بیٹی محل میں ہی رہنے لگیں۔ ان سے متاثر ہو کر بادشاہ اکبر نے حکم دیا کہ نور جہاں کی تعلیم شاہی محل میں ہی ہو۔ شہزادہ سلیم (جہانگیر) کی ماں مریم زمانی بھی نور جہاں سے بہت محبت کرتی تھی اور اس پر خاص توجّہ دیتی تھی۔ اس وقت نور جہاں کا نام مہر النساء تھا۔

شہزادہ سلیم مہر النساء (نور جہاں) کے حُسن سے متاثر ہوا اور اس میں عشق کی حد تک دلچسپی لینے لگا۔ بادشاہ اکبر کو علم ہوا تو انہوں نے شہزادے کو ان حرکتوں سے منع کیا لیکن اس کا عشق حد سے آگے نکل چکا تھا۔ 1595 میں مہر النسا کی عمر تیرہ سال تھی اور اکبر کے کہنے پر اس کے والد مرزا غیاث نے اس کی شادی ایک ایرانی مہاجر علی قلی خاں سے کر دی۔ 1599 میں جب چتوڑ کی مہم شہزادہ سلیم کو سونپی گئی تو علی قُلی خاں اُسی کے فوجی دستے میں شامل تھا۔ اکبر نے اُسے بردوان کا صوبیدار بنا کر بنگال بھیج دیا اور یوں مہر النساء شاہی محل سے نکل کر اپنے خاوند کے ساتھ بنگال چلی گئی۔ شہزادہ سلیم مجبور ہو کر رہ گیا لیکن دل میں محبت کی چنگاری برابر سلگتی رہی۔ اکبر کی وفات کے بعد سلیم جب بطور جہانگیر بادشاہ بنا تو یہ چنگاری شعلہ بن کر بھڑک اٹھی اور جہانگیر نے مہر النساء کو

حاصل کرنے کے لئے علی قلی خاں کو راستے سے ہٹانے کا منصوبہ بنالیا۔ اس نے مختلف طریقے سے سازشوں کے ذریعہ کئی ناکام کوششیں کیں اور آخر کار وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوگیا۔ اُس پر غداری کا الزام لگا کر اُسے قتل کر دیا گیا۔ خاندان کو نظر بند کر دیا اور مہر النساء کو شاہی قیدی بنا کر آگرہ لے جایا گیا۔ وقتاً فوقتاً جہانگیر ہر ممکن کوشش کرتا رہا کہ وہ مہر النساء کو حاصل کرے۔ یہاں تک کہ اُس نے مہر النساء کو اپنی سوتیلی ماں سلیما بیگم کی خاص کنیز بنادیا اور اُسے شادی کا پیغام بھجوایا لیکن مہر النساء نے انکار کر دیا۔ مسلسل چار سالوں تک کوشش کرنے کے بعد آخر کار اس نے مہر النساء کو رضا مند کرلیا اور مئی 1611 میں ان کی شادی ہوگئی۔ شہنشاہ جہانگیر نے پہلے اُسے ''نور محل'' کا خطاب دیا اور بعد میں نور جہاں کے لقب سے نوازا۔

نور جہاں نے بادشاہ کی دیوانگی کا بھرپور فائدہ اٹھایا اور اس نے اپنے والد اور بھائی کو بادشاہ کا خاص صلاح کار بنوا کر لگ بھگ بارہ سالوں تک حکومت میں اپنا دخل رکھا۔ اس نے سیاسی حقوق پر مکمل قبضہ کرنے کے لئے ہر ممکن کوششیں کی اور یہاں تک کہ شہزادہ خسرو کے قتل میں بھی اُس کا خاص حصّہ تھا۔ اُس کی درباری سازشوں کی وجہ سے شہنشاہ جہانگیر نے اپنی زندگی کا آخری وقت بہت ناخوشگوار گذارا۔ نور جہاں 1627 میں بادشاہ کی موت کے بعد اٹھارہ سالوں تک، اپنی زندگی کے آخر تک، شاہی قلعہ لاہور میں رہی اور 18 دسمبر 1645 کو اس کا انتقال ہوگیا۔ شاہدرہ (لاہور) میں ریلوے لائن کے نزدیک نور جہاں نے اپنی زندگی میں ہی اپنا عالیشان مقبرہ بنوایا تھا جو پہلے ادوار کی نسبت اب کافی بہتر حالت میں وہاں موجود ہے۔

لاہور کے نقّاش

لاہور دیگر فنون کے ساتھ ساتھ مصوّری کا بھی مرکز رہا ہے۔ اس شہر سے گذرنے والے یوروپ کے مصوّروں نے بھی لاہور کے محلّوں، گلی کوچوں اور تاریخی عمارتوں کی تصویریں بھی بنائیں۔

لاہور ہمیشہ سے فن مصوّری کا مرکز رہا ہے۔ اندرونی شہر میں ایک محلّے کا نام ہے محلّہ نقاشاں ممکن ہے کہ کسی وقت یہاں نقاش رہتے رہے ہوں۔ اسی طرح اس شہر سے گذرنے والے یوروپ کے مصوّروں نے بھی لاہور کے محلّوں، گلی کوچوں اور تاریخی عمارتوں کی نقاشی کی۔ ان میں سے کئی تصویریں بڑے بڑے بلاکوں کے ذریعے چھاپی گئیں اور ان میں ہاتھ سے رنگ بھرے گئے۔ یہ زمانہ اٹھارہویں صدی اور انیسویں صدی کے آغاز کا تھا جب فوٹوگرافی ابھی نہیں آئی تھی۔ اس طرح اس زمانے کے لاہور کا ایک بڑا منظر نامہ تیار ہوگیا۔ 1835 میں فوٹوگرافی کی کھوج ہوئی۔ بہادر شاہ ظفر کی ایک عالیشان تصویر ان کی بیگم کے ساتھ جلاوطنی کے زمانے میں کھینچی گئی۔ اس سے فوٹوگرافی کو مصوّری جیسی جگہ حاصل ہوگئی بلکہ وہ کسی حد تک نقّاش بھی تھے کیونکہ شیشے کی پلیٹوں والے نیگیٹو اور کاغذ پر لئے گئے پازیٹو کو برش سے ٹھیک کرنا پڑتا تھا۔

فوٹوگرافی شروع میں امیر لوگوں تک ہی محدود تھی۔ انگریزی دور کے شروع میں کچھ انگریزوں نے اور بعد میں لاہور کے مقامی لوگوں نے دوکانیں کھولیں۔ ٹولینٹن مارکیٹ اور چھاؤنی علاقے میں لاہور کے سب سے پُرانے اسٹوڈیو کھُلے ان کا ایک کام کالج کی کانووکیشنز کی تصویریں کھینچنا ہوتا تھا۔ لکڑی کے ایک بڑے سے بکسے کے ساتھ ایک کالا کپڑا پیچھے لٹکا ہوتا تھا اور بکسا تین ٹانگوں والے سٹینڈ پر رکھا ہوتا تھا۔ پاس ہونے والے طالب علم اپنے اپنے گاؤن پہنے

لائینوں میں کھڑے ہوتے تھے۔فوٹوگرافر سب کو خاموش بُت بنا کر کیمرے کے لینس (Lens) سے بڑا سا ڈھکن ایک طرف سے اتارتا اور ایک منٹ کے بعد دوسری طرف سے واپس لگا دیتا۔ اس طرح تصویر کھینچ جاتی۔ جو لوگ کالج پاس نہیں کرتے تھے انہیں تصویریں کھنچوانے کا زیادہ شوق ہوتا تھا۔ان کی سہولیت کے لئے منٹ کیمرے آ گئے۔ وہی کالے پردے والا کیمرہ اور سامنے اس کے بڑے سے پردے پر بنی ہوئی پیرس یا وی آنا کے کسی محل کی تصویر کسی پردے پر تالاب میں فوّارے اور پانی میں تیرتی بطخیں اور ان پردوں کے سامنے کھڑے ہو کر تصویر کھنچواؤ۔ بھاٹی چوک میں آج بھی لمبی مونچھوں والا ایک بابا ایسے ہی منٹ کیمرے اور پردے والی طرح طرح کی تصویروں کے ساتھ موجود ہے۔کئی لوگ دیہاتوں سے لاہور دیکھنے آتے ہیں اور ان پردوں کی تصویریں انہیں فوٹو کھنچوانے کی دعوت دیتی ہیں۔

وقت کے بدلاؤ کے ساتھ فوٹوگرافی میں بھی بہت سی تبدیلیاں ہوئیں۔ لاہور کے کئی فوٹو اسٹوڈیوز نے بڑا نام پیدا کیا ہے۔آج لاہور سے 'گتی کی کڑی' اور سٹوڈیو غائب ہو چکے ہیں۔

ہیر رانجھے کی عشق کہانی

ہیر اور رانجھا کے عشق کی کہانی بھاگ بھری اور وارث شاہ کی اپنی عشق کہانی ہو یا نہ ہو، اسے لکھ کر جہاں وارث شاہ نے پنجابی ادب کو ایک انمول شعری تخلیق دی وہیں لاہور شہر نے سب سے پہلے اسے ایسی پہچان عطا کی ہے کہ یہ تخلیق زندہ جاوید ہوگئی اور ساتھ ہی وارث شاہ بھی۔ وارث شاہ کی زندگی میں ہی لاہور کی موسیقی میں ہیر سما گئی تھی۔ وارث شاہ کے استاد مولانا حافظ غلام مرتضیٰ نے ہیر وارث شاہ کا ذکر سُنا تو وہ غصّے میں آ گئے اور انہوں نے وارث شاہ کو بلا کر کہا——
''عمر بھر مجھے دو ہی ہونہار شاگرد ملے اور ان کی تعلیم پر جتنی محنت میں نے کی یہ سب برباد ہوگئی۔ بُلّے شاہ نے سارنگی سنبھال لی اور تم نے ہیر لکھ کر مجھے نادم کر دیا۔'' ——وارث شاہ نے اپنے استاد کی طرف دیکھا، پھر آنکھیں نیچے کیئے خاموش بنے رہے۔ کچھ دیر بعد استاد نے وارث شاہ سے کہا—— ''میں نے لاہور میں تمہاری ہیر کی چرچا سُنی ہے۔ مجھے کچھ سناؤ تا کہ علم ہو کہ تم نے لکھا کیا ہے!'' ——وارث شاہ ہیر کے الگ الگ حصّے استاد کو سُناتے رہے اور استاد آنکھیں موند کر سنتے رہے اور آخر کار انہیں کہنا پڑا—— ''وارث، تم نے تو کمال کیا ہے۔''

ہیر کو سُر کی شکل میں محض کچھ حصّوں کو ہی ہم سُنتے ہیں۔ یہ ایک لمبی شعری تخلیق ہے۔ جس میں وارث شاہ نے رانجھے کا کردار نوجوانی سے لیا ہے۔ وہ جاٹ قوم کا ایک خوبصورت نوجوان ہے اور دن بھر بانسری بجانے کے علاوہ وہ کوئی دوسرا کام نہیں کرتا۔ خاندان میں بھائی بھاوجیں اُسے نکمّہ کہہ کر طعنے مارتے ہیں اور تنگ آ کر وہ گھر چھوڑ دیتا ہے اور اُس علاقے میں پہنچ جاتا ہے جہاں سیال قوم کے لوگ رہتے ہیں۔ ہیر اسی قوم کے سردار کی لڑکی ہے جو بے حد حسین ہے۔ دونوں کا مِلن ہوتا ہے اور وہ ایک دوسرے سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کے نزدیک

رہ سکیں، اس کے لئے وہ ہیر کے گھر بھینس چرانے کے لئے نوکر ہو جاتا ہے اور مسلسل بارہ سالوں تک یہی کام کرتا رہتا ہے۔ ان کے عشق کا پتہ چلتے ہی ہیر کے ماں باپ ہیر کی شادی کھیڑے قوم کے ایک نوجوان سیداں سے کر دیتے ہیں۔ ہیر کی جُدائی میں رانجھا فقیر بن جاتا ہے اور بہت دنوں تک اِدھر اُدھر بھٹکنے کے بعد ہیر کے سسرال جا پہنچتا ہے۔ وہ دونوں ایک بار پھر ملتے ہیں اور موقع پا کر ہیرا اپنے رانجھے کے ساتھ بھاگ جاتی ہے لیکن چند روز کے بعد ہی وہ پکڑے جاتے ہیں۔ رانجھا وہاں کے حاکم کے پاس فریاد لے کر پہنچتا ہے اور اُسے اپنے عشق کی داستان بیان کرتا ہے۔ حاکم اپنا فیصلہ رانجھے کے حق میں دے دیتا ہے۔ تب رانجھا اپنے گاؤں جا کر بھائی بھاوجوں کو سب بتاتا ہے اور ہیر سے شادی کرنے کے لئے بارات لے کر جانے کی تیاری کرنے لگتا ہے۔ تبھی اُسے یہ غمناک خبر ملتی ہے کہ ہیر کو اس کے ماں باپ نے زہر دے کر مار ڈالا ہے۔ اس خبر کو سنتے ہی رانجھا بھی فوت ہو جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ کہانی جسے بُنیاد بنا کر وارث شاہ نے پنجابی زبان میں اسے شعری تخلیق کی شکل میں قلمبند کیا ہے۔ وارث شاہ کی اس تخلیق کو لاہور کے گلوکاروں نے کچھ اس طرح سے اپنایا اور گایا کہ یہ تخلیق امر ہو گئی اور ساتھ ہی وارث شاہ بھی۔

تعلیم کا مرکز لاہور

لاہور ہمیشہ سے ہی علم اور تعلیم کا مرکز رہا ہے۔ انگریزوں نے 1849 میں لاہور پر قبضہ کرنے کے بعد ایک سروے کرایا جس کے مطابق اُس وقت لاہور میں 116 فارسی اسکول، 26 عربی اسکول، 44 عربی فارسی مشترکہ اسکول اور 38 شاستری اسکول تھے۔ ان کے علاوہ جگہ جگہ بہت سے مدرسے اور اسکول قائم تھے جو پرانے زمانے سے چلے آرہے تھے۔ ان دنوں تعلیم بہت تھوڑے لوگوں کے لئے روزی روٹی کا ذریعہ تھی۔ انگریزوں کے دور میں جب خاندانی جائیدادیں اور جاگیریں ختم ہوگئی تھیں اور پُرانے پیشے بھی ختم ہو رہے تھے تو نئی ضرورتوں کے مطابق بے شمار نئے کاموں کی بنیاد پڑی۔ اسی وجہ سے جنس کی جگہ نقد لین دین بڑھا اور مقامی لوگ تعلیم کو سرکاری نوکری کا ذریعہ سمجھنے لگے۔ کیونکہ انگریز صرف افسری کے لئے میسّر تھے اس لئے دیسی کلرک بنانے کے لئے تعلیمی ادارے کھولے گئے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے میں انگریز فورٹ ولیم کالج میں اردو زبان پڑھتے سیکھتے تھے۔ کیونکہ ان کا واسطہ مقامی لوگوں سے پڑتا تھا۔ دیسی کلرک انگریزی پڑھ کر ملازم ہو جاتے تھے۔ یوں ترقّی کا راستہ عام آدمی کے لئے انگریزی زبان کی واقفیت بن گیا۔ یہیں سے وہ سائنسداں، ڈاکٹر، انجینئر بھی بنے۔ جان لارینس کا بُت مال روڈ لاہور پر ایک ہاتھ میں قلم اور دوسرے میں تلوار لئے ہوئے نصب تھا۔ انگریز کے خلاف آزادی کی لڑائی کی چنگاری سُلگ رہی تھی اور لوگوں نے قلم کے ساتھ آزادی کی جنگ شروع کردی۔ کانگریس، آریہ سماج، مسلم لیگ، اِحرار وغیرہ تحریکیں تعلیم کی دکھائی ہوئی راہ سے ہی بنی اور لاہور سیاسی وادبی تحریکوں کا مرکز بن گیا نئے تعلیمی نظام کے ذریعے نوجوانوں کو کالجوں میں زندگی کے آداب سیکھنے کا موقع حاصل ہوا۔ کپڑے پہننے، ادبی محفلوں اور چائے کی میز پر

بات چیت کرنے کا سلیقہ بھی آیا۔

لاہور کا سرکاری کالج، اورینٹ کالج، لا کالج، سینٹرل کالج، ایف سی کالج، ایچی سن کالج، کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج، پنجاب یونیورسٹی، میو سکول آف آرٹس اور ریلوے پولیٹیکنک بڑے تعلیمی ادارے ہیں جہاں سے پڑھ کر بہت سے مشہور لوگ زندگی کے مختلف شعبوں میں دُنیا بھر میں مشہور ہوئے بعد میں 1910 میں بنے دیال سنگھ کالج اور پھر میکلیگن کالج آج بھی بڑے تعلیمی ادارے ہیں۔ صرف لڑکیوں کے لئے لاہور کا پہلا کالج 1912 میں لیک روڈ پر کھُلا اور بہت کوششوں کے بعد یہاں صرف نو لڑکیوں نے داخلہ لیا۔ 1922 میں لاہور کالج کھُلا۔ اسلامیہ کالج 1939 میں کوپر روڈ پر کھلا جو پرانی انارکلی کے ایک کونے میں ہے۔

لاہور میں آگرہ بینک 1861 میں بینک روڈ پر قائم ہوا اور بعد میں بہت سے دوسرے بینک قائم ہوتے گئے۔ یہ بینک کالج کی شکل میں بینک کاری اور حساب کتاب کے ماہر پیدا کرنے لگا۔ اس کے لئے زمین سر گنگا رام نے دی تھی۔ ملک کی تقسیم سے پہلے 1933 میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج امرتسر میں کھلا تھا جو تقسیم کے بعد لاہور میں منتقل ہو گیا۔ سارے شمالی ہندوستان میں لاہور ہمیشہ سے ہی تعلیم کا بہت بڑا مرکز تھا۔

بھاٹی دروازہ کہیں گُم ہوگیا

تب کے لاہور کی بات یہاں سے چلتی ہے کہ میر محکم کو سوبھا سنگھ نے بھاٹی دروازہ اور لوہاری دروازہ کا انچارج بنا دیا اور میر محکم نے جلدی جلدی لاہور سے باہر چپّے چپّے پر اپنے نام کی تختیاں لگوانے کے شوق میں ہاتھ پاؤں مارنے شروع کر دیئے۔ اس نے چوک جھنڈا کے علاوہ نواں کوٹ میں بھی غلّہ منڈی قائم کردی۔ رنجیت سنگھ اس وقت تک کافی طاقتور ہو چکا تھا اور اس کی نظریں بھی لاہور پر لگی ہوئی تھیں۔ میر محکم نے موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اُسے مالی حالت سے آگاہ کر دیا۔ ایک منصوبے کے تحت رنجیت سنگھ دو سو ہتھیار بند سواروں کے ساتھ ایک صبح لاہوری دروازے کے باہر نمودار ہوا اور میر محکم نے دروازہ کھول کر اس کا شایانِ شان استقبال کیا اور انہیں بھاٹی دوازے میں ٹھہرا کر خود سوبھا سنگھ کو جا کر اطلاع دی کہ رنجیت سنگھ دس ہزار لشکریوں کے ساتھ لاہور کے اندر داخل ہو چکا ہے۔ لاہور میں رنجیت سنگھ کی آمد کی کہانی بھاٹی دروازے سے شروع ہوتی ہے اُس کی حکمرانی سے لے کر لاہور میں انگریزوں کی حکومت تک بھاٹی دروازے کی تاریخی واقفیت اس کی زندگی کی بدلتی قدروں سے وابستہ ہے۔

بھاٹی دروازہ میں سب سے پہلے مسلم آبادی زیادہ تھی جن میں بھٹّی زیادہ تھے جو تالہ سازی کا کام کرتے تھے۔ انہیں کی وجہ سے شاید یہ بھاٹی دروازہ کہلایا۔ ملک کے بٹوارے سے پہلے تک یہاں پٹھان، کشمیری، مغل، ملک، سیّد، جاٹ وغیرہ بھی کافی بڑی تعداد میں موجود تھے۔ اس دروازے کے دائیں طرف کی گلیاں ہندوؤں کے گلی کوچوں اور محلّوں میں نکلتی تھیں جہاں پنڈت اور ٹھاکروں کے گھر زیادہ تھے۔ ان میں سے جن ہندوؤں نے لاہور میں اپنی خاص پہچان قائم کی ان میں دیوان بیج ناتھ، دیوان ایودھیا پرشاد، دیوان شنکر ناتھ، دیوان پریم ناتھ اور شِو ناتھ

کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ تاریخ کے بہت سے چھوٹے بڑے واقعات سے گذرنے والے بھاٹی دروازے کی ایک منزل یہ بھی ہے کہ جب 1857 کے بعد لاہور میں گرجا گھروں کے مینار بلند ہونے لگے اور دیکھتے دیکھتے پورا برصغیر انگریز کے چُنگل میں پھنستا چلا گیا تو دہلی اور دوسرے پامال علاقوں سے ذہین اور پڑھے لکھے لوگوں نے لاہور کا رُخ کر لیا۔ مولانا حالی یہاں آ کر لوٹ گئے۔ علاّمہ اقبال لندن سے لاہور آ کر بھاٹی دروازے میں رہے۔

سر عبدالقادر، مولانا ظفر علی، میاں محمد شاہ دین، پنڈت شِو نارائن شمیم، مولوی محبوب عالم، مُنشی محمد دین فوق جیسے ذہین لوگوں کا مسکن بھاٹی دروازہ بنا۔ لاہور میں قائم ہونے والی پہلی ادبی انجمن یہیں بنی۔ بھاٹی دروازے کے محلّہ اسلام خاں میں فلم ''تان سین'' کی اداکارہ و فلمی اداکار یعقوب کی بیوی خورشید بیگم رہتی تھی۔ مشہور قلم کار ساغر صدیقی بھی یہیں رہے۔ بھاٹی دروازہ کی کبڈی کی ٹیم لاہور شہر کی سب سے طاقتور ٹیم تھی جس میں جانے مانے قلمکار مرزا ادیب کے بہنوئی مرزا سردار علی بہت نامور کھلاڑی تھے اور اپنے لمبے قد اور کسرتی ڈیل ڈول کی وجہ سے فلم ''رُستم سہراب'' میں انہیں رُستم کے کردار کے لئے چُنا گیا تھا۔ قلم کار ساغر صدیقی نے بھی زندگی کا زیادہ حِصّہ یہیں گذارا۔

بھاٹی دروازہ کھانے پینے کے لئے ہمیشہ مشہور رہا ہے۔ یہاں مقیم زیادہ تر لاہوریئے رات کا کھانا گھر پر نہیں پکاتے تھے۔ یہاں کے بازاروں اور چوکوں میں چوپٹ خوب کھیلی جاتی تھی۔ پتنگ سازی کے بڑے بڑے ماہر یہاں تھے اور اس کی گلیوں میں پتنگیں بنانے والے استادوں کی بیٹھکیں تھیں۔ جو لوگ منٹو پارک میں پتنگ بازی کے مقابلے جیت کر آتے تھے وہ جلوس کی شکل میں یہاں تک آتے۔ کبوتر بازی کے لئے بھی یہ دروازہ جانا جاتا تھا۔ بھاٹی چوک میں اب شہر کے مختلف حصّوں سے آنے والی سڑکیں جہاں ملتی ہیں۔ وہاں آج کے زمانے کا ایک الگ شہر آباد ہو گیا ہے۔ اب یہ ایک طرف ٹکسالی دروازہ تک اور دوسری طرف سُوری دروازہ تک پھیل چُکا ہے اور اندر سے تّبی تھانے تک مِلا ہوا ہے لیکن دیوانوں کی طرح رہنے والے لوگ اب یہاں نہیں ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے لاہور کا وہ بھاٹی دروازہ کہیں گُم ہو گیا ہے۔

عشق کی سرزمین

ہیر کے خالق وارث شاہ کا لاہور شہر سے سیدھا تعلق کوئی نہیں تھا لیکن شاید وارث شاہ کو اپنی اس شعری تخلیق کے حوالے سے اتنی پہچان اور شہرت کبھی حاصل نہ ہوتی اگر لاہور شہر اسے اپنی کلچرل وراثت کا حصّہ نہ بناتا۔ لاہور محض ایک شہر ہی نہیں ہے، ایک بھرپور زندگی کا اٹوٹ حصّہ ہے۔ کوئی میلہ، تیوہار اور محفل ادھوری رہتی ہے اگر وہاں ہیر نہ گائی جاتی ہو۔

پنجاب کی سوندھی مٹی کے ہر ذرّے میں بے شمار عشق کہانیوں نے جنم لیا ہے۔ اس دھرتی کا ہر دل جوان ہے۔ لہلہاتے سرسوں کے پیلے کھیت، گیہوں کی پکی بالیاں، جھر جھر بہتے جھرنے، پیڑ پودے تک اُن عشق کہانیوں کے میٹھے بول سناتے گنگناتے ہیں۔ مشترکہ پنجاب میں چناب کی دھرتی آج بھی سوہنی مہیوال کی یاد دلاتی ہے۔ گھنے جنگلوں میں مجنوں کو پکارتی لیلیٰ کی آواز آج بھی گونجتی ہے۔ اسی دھرتی کی سسّی پنوں کی داستان محبت آج بھی زندہ ہے۔ ہیر اور رانجھے کی عشق کہانی بھی اسی دھرتی کی کہانی ہے اور اسے فانی بنانے والا پنجابی شاعر وارث شاہ ہے جس نے ہیر وارث شاہ لکھ کر بے پناہ شہرت حاصل کی۔ آج بھی ہیر کے سُروں میں ڈوب جانے والے پنجابیوں کی تعداد کم نہیں ہے۔

ہیر کی تخلیق کرنے والے پنجابی شاعر وارث شاہ کی داستان بھی کم دلچسپ نہیں ہے۔ لاہور سے تیس کوس کے فاصلے پر جنڈیالہ شیر خاں نامی گاؤں میں ہجری 1150 میں سیّد وارث شاہ کی پیدائش ہوئی۔ جوانی کو پہنچتے ہی موسیقی اور ادب میں وہ گہری دلچسپی لینے لگے۔ لاہور اُن دنوں علم و ادب کا بہت بڑا مرکز تھا اور وہاں مولانا حافظ غلام مرتضیٰ کی عالم کے طور پر بہت شہرت تھی اُسی زمانے کے مشہور مُرتضیٰ سے تعلیم حاصل کر کے وارث شاہ جب اپنے وطن لوٹنے لگے تو مولانا

نے کہا کہ بیرونی علم کے ساتھ ساتھ جب تک اندرونی علم حاصل نہ کیا جائے تب تک تعلیم مکمل نہیں ہوتی۔ یہ بات وارث شاہ کے دل کو چھوگئی اور وطن لوٹنے کی جگہ وہ پاک پٹن چلے گئے اور عبادت میں مگن ہوگئے۔ ایک طویل مدّت کے بعد جب وہ اپنے وطن لوٹے تو راستے میں آرام کے لئے ایک گاؤں میں رُک گئے۔

صبح جب وہ روانہ ہونے لگے تو وہاں ایک خوبصورت لڑکی کو دیکھ کر اُس کے حسن پر فِدا ہوگئے۔ اس لڑکی کا نام بھاگ بھری تھا۔ انہوں نے وطن لوٹنے کا اپنا ارادہ بدل دیا۔ بھاگ بھری بھی وارث شاہ کے عشق میں مبتلا ہوگئی۔ دونوں کی محبت پروان چڑھنے لگی اور اسی دور میں وارث شاہ نے ''ہیر وارث شاہ'' لکھی۔ کچھ لوگ کا ماننا ہے کہ ہیر رانجھا کی عشق کہانی درحقیقت بھاگ بھری اور وارث شاہ کے عشق کی کہانی ہے۔

کہاں رہے اب ویسے لال

شکار پور ایک زمانے میں لاہور کا پیرس کہلاتا تھا۔ امیر اور شاندار شہر جس کی رونق ان ہندوؤں سے تھی جن کا کاروبار ساری دنیا میں پھیلا ہوا تھا اور پانی کے جہازوں سے ان کا آنا جانا یوروپ، افریقہ، چین اور جاپان میں ہوتا تھا۔ اسی زمانے میں یہاں ایک بہت بڑے بیوپاری سیٹھ اودھو داس کی بہت شہرت تھی۔ ان کے کاروباری دفتر ساری دُنیا میں پھیلے ہوئے تھے اور ان پر دولت کی برسات ہوتی تھی۔ وہ امیر ہونے کے ساتھ ساتھ رحمدل بھی تھے۔ ایک مرتبہ اُن کی ماں بیمار پڑی اور بیمار بھی ایسی کہ زندہ رہنے کی امید نہ تھی۔ سیٹھ جی کو اپنی ماں سے بہت لگاؤ تھا۔ وہ جانتے تھے کہ اس سارے علاقے میں کوئی ایسا ہسپتال نہیں جو ان کا علاج کر سکے۔ وہ ماں کو لے کر فوراً بمبئی روانہ ہوگئے۔ بمبئی اس وقت اپنے ماہر ڈاکٹر اور سرجن کے لئے سارے ہندوستان میں مشہور تھا۔ سیٹھ جی کی ماں بھی چند دنوں میں تندرست ہوگئی اور ماں بیٹا دونوں شکار پور لوٹ آئے۔ ایک روز ماں کے منہ سے یہ نکلا کہ کاش! یہاں بھی بمبئی جیسا ہسپتال ہوتا تاکہ یہاں کے رہنے والوں کے لئے علاج آسان ہو جائے۔ یہاں کا ہر شخص میرے بیٹے جیسا امیر نہیں ہے کہ اپنے بیمار ماں باپ یا بیوی کو بمبئی لے جا سکے اور ان کا علاج کرا سکے۔ ماں کی یہ بات بیٹے کے دل میں تیر جیسی لگی۔ سیٹھ جی نے ماں سے تو کچھ نہ کہا لیکن زمین کا ایک بہت بڑا ٹکڑا خرید کر اُس پر ہسپتال بنوانے کا کام شروع کر دیا۔ جلد ہی ہسپتال بن کر تیار ہو گیا تو انہوں نے ملک بھر سے اچھے ڈاکٹر، سرجن اور دوسرا اسٹاف بھرتی کر لیا۔ اب سیٹھ جی اپنی ماں کے پاس گئے اور کہنے لگے کہ آپ نے بمبئی سے لوٹ کر کہا تھا کہ کاش! یہاں بھی ویسا کوئی ہسپتال ہوتا۔ آپ کی خواہش کو پورا کرنے کے لئے میں نے ایک بڑا ہسپتال بنوا دیا ہے اور اب آپ کے پاس آیا ہوں تاکہ

آپ اس کا افتتاح کر دیں۔ ماں نے کہا کہ بیٹا، تم نے بہت اچھا کیا کہ اپنے علاقے کے لوگوں کے لئے بڑا ہسپتال بنوایا۔ اب لوگ تمہاری واہ واہ کریں گے، کہیں گے کہ سیٹھ اودھوداس کیسا رحمدل امیر انسان ہے۔ اس طرح تمہارے اندر کے اِہم کو بڑھاوا ملے گا اور تم جانتے ہو کہ اِہم کوئی اچھی بات نہیں۔ بیٹے نے سر جھکا کر ماں کی بات سُنی اور کچھ بھی کہے بغیر واپس ہسپتال چلے گئے وہاں جا کر سیٹھ نے آرکی ٹیکٹ سے کہا کہ ہسپتال کے صدر دروازے پر سے اس کا نام ہٹا کر، نام کی تختی کو گیٹ کے فرش پر اس طرح لگائے کہ آنے جانے والے اُس کے نام کے اوپر سے گذریں۔ سیٹھ جی کی یہ فرمائش جب پوری ہوگئی تو وہ ایک بار پھر اپنی ماں کے پاس گئے اور کہنے لگے کہ اب اس ہسپتال میں ایسی کوئی بات نہیں جس سے میرے اِہم کو بڑھاوا ملے اب آپ چل کر ہسپتال کا افتتاح کر دیں تا کہ وہاں آج سے ہی مریضوں کا علاج شروع ہو سکے۔ ماں نے بیٹے کو دعائیں دیں اور یوں وہاں کے سب سے بڑے ہسپتال میں ہزاروں مریضوں کا علاج ہونے لگا۔ ملک کا بٹوارہ ہوا تو سیٹھ جی کا خاندان بھی جنم بھومی چھوڑ کر جانے پر مجبور ہوا۔ سیٹھ جی کا بنوایا ہوا ہسپتال آج بھی وہاں موجود ہے۔

چند سال قبل سیٹھ اودھوداس کی نواسی پاکستان آئی تو جائے ہسپتال بھی گئی۔ ہسپتال کے سامنے کھڑے ہو کر اُس نے فرش پر کھدے ہوئے اپنے نانا جی کا نام دیکھا — اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اُن کے ساتھ جو لوگ تھے، ان کی آنکھیں بھی بھیگ گئیں۔ سیٹھ جی کی نواسی نے ہسپتال کے اندر قدم ایسے رکھا کہ اُس کے پاؤں اپنے نانا جی کے نام پر نہ پڑیں۔ یہ ہمارے برصغیر کی شاندار روائتیں ہیں جنہیں بٹوارے نے کوئی نقصان نہیں پہنچایا اور جن کا آج بھی بے حد احترام سے نام لیا جاتا ہے۔

بہ شکریہ: زاہدہ حنا

بھٹّی والیئے مائیے

تندور لفظ ہر گھر کی زندگی کا ایک اہم حصّہ ہے۔ مشترکہ پنجاب کے وقت لاہور شہر کا شاید ہی کوئی ایسا کونہ ہوگا جہاں تندور نہ ہوتا ہوگا۔ لگ بھگ ہر محلّے اور ہر گلی کوچے میں کوئی نہ کوئی تندور ضرور ہوتا۔ یہ حالت آج بھی نہیں بدلی ہے۔ ایک اندازے کے مطابق آج بھی لاہور میں پندرہ بیس ہزار تندور موجود ہیں۔ لاہور میں تندور کا اتہاس صدیوں پُرانا ہے۔ ایسا کہا جاتا ہے کہ یہ سلسلہ مرکزی مشرق کے گھرانوں سے یہاں آیا اور عربوں نے لاہور میں تندور کی داغ بیل ڈالی۔ کہتے ہیں کہ تقسیم سے قبل لاہور کے تندوروں پر ایک آنے کی آٹھ روٹیاں ملتی تھیں۔ تندور سسٹم لاہور کے لوگوں کی عام ضرورت تھا۔ روٹی کا کوئی متبادل نہیں تھا۔ تازہ آٹے اور لاہور کی سوغات خمیرے آٹے کی روٹیاں تندوروں پر مل جاتی تھیں۔ کھانے کا وقت ہوتا اور گھر کا کوئی بھی فرد تندور سے ضرورت کے مطابق روٹیاں خرید لاتا۔

تقسیم سے قبل لاہور میں بابے مولے کا تندور بہت مشہور تھا۔ اسی طرح لاہور میں مُنادی کے لئے ماسٹر صادق ڈھول ٹلّی والا بھی بہت مشہور تھا۔ اُس کی یہ منادی لوگوں کی توجہ اپنی طرف ضرور کھینچتی تھی۔۔۔ ''مہربان! غور سے سُن لو۔ آج سے لاہور میں کوئی بھوکا نہیں سوئے گا۔ پیسے کی روٹی اور دال مفت بابے مولے کے تندور سے ملے گی اور گرمیوں میں ٹھنڈا ٹھار پانی بھی۔''

تندور کی طرح ہی لاہور کے گلی محلّوں میں دانے بھوننے والی بھٹیاں بھی بے شمار ہوتی تھیں۔ سردیوں کے موسم میں شام کا نظارہ کچھ ایسا ہوتا تھا کہ ایک مائی اپنے سر پر سُوکھے پتّے اور سُوکھی ٹہنیوں کی گٹھڑی اٹھائے محلّے کی کسی مشترکہ جگہ پر آتی۔ وہاں اُس نے اینٹوں روڑوں سے ایک بھٹی بنائی ہوتی۔ اُس پر چکنی مٹی کا لیپ کرتی۔ خشک پتّوں کے بالن سے وہ بھٹی جلاتی جس پر

لوہے کی کڑاہی میں ڈالی ریت کو گرم کرتی ۔ ریت جب خوب گرم ہو جاتی تو بھٹی پر دانے بھُنانے آئے بچوں عورتوں سے باری باری چنے، مکئی اور کبھی کبھی گندم کے دانے لے کر کڑاہی میں ڈالی ریت میں ڈال کر موٹے تیلوں والے جھاڑے کے ساتھ ہلاتی جاتی ۔ دانے جب بھُن جاتے تو انہیں موٹے سوراخوں والی چھاننی سے چھان کر دے دیتی ۔ ایسی مائیاں اُس زمانے میں رکرتی قوم سے تعلق رکھتی تھیں ۔ بھٹی جلاتی اور اس کے پاس بھیڑ لگ جاتی ۔ لوگ اس کے ساتھ باتیں بھی کرتے جاتے اور پتوں کی آگ سے ودھوئیں سے بھیجتے جاتے ۔ جب دھوآں بڑھ جاتا تو مائی ایک پتلی چھڑی کے ساتھ بالوں کو آگے پیچھے کر کے پھونک مارتی، پتے جلنے لگتے اور دھواں کم ہو جاتا اندھیرا ہونے تک بھٹی جلتی رہتی اور دانے بھُنتے رہتے ۔

تندور ہو یا دانے بھوننے والی مائی کی بھٹی، یہ ایسی جگہیں ہوتی تھیں جہاں روٹیاں سِنکتی اور دانے تو بھنتے ہی تھے ۔ یہ میل ملاقات کی جگہ بھی ہوتی تھی ۔ نئی اطلاعات اور خبروں کا تبادلہ ہوتا تھا، چغلیاں ہوتی تھیں، ہنسی ٹھٹھولی اور دل لگی ہوتی تھی اور تندور بھٹیوں کے ساتھ یہ سب ہمارے رہن سہن اور سماجی زندگی کا حصہ ہوتا تھا لیکن لاہور والا پنجاب ہو یا امرتسر والا، اب ہمارا رہن سہن اور سماجی زندگی بدل گئی ہے ۔ تندور ڈھابوں اور ہوٹلوں میں سما گیا ہے اور مائی کی بھٹی کے دانے پیکٹوں میں بند ہو گئے ہیں ۔

میں لاہور ہوں

میری کہانی کا آخری باب 1947

1947 — یہ سال اس پورے برصغیر میں اُتھل پتھل کا سال بن گیا تھا۔ سال کے شروعاتی دنوں میں ہی اب لگ بھگ طے مانا جانے لگا تھا کہ بٹوارہ ہوگا مگر تب بھی زیادہ تر لوگ وقت کی دیوار پر لکھی جارہی اِس عبارت کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہو پا رہے تھے۔

آپسی نفرت و ناپسندیدگی کا احساس پیدا ہونے لگا تھا۔ لگ بھگ تمام باشندوں کے ذہن میں ایک دہشت سی پیدا ہونے لگی تھی۔ تمام ہندو اور سِکھ اب یہ طے مان رہے تھے کہ اُن کے بسیرے، ان کے کاروبار، میرے شالیمار باغ، میرے انارکلی بازار اور مُسلم آبادی سے اُن کے رشتے ناطے، سب کچھ جلد ہی ختم ہو جائے گا۔

اُن دنوں میری آبادی لگ بھگ تیرہ لاکھ تھی۔ ان میں پانچ لاکھ ہندو تھے اور ایک لاکھ کے لگ بھگ سِکھ تھے۔ مسلمانوں کی آبادی تقریباً چھ لاکھ تھی باقی ایک لاکھ کی آبادی میں ملے جلے لوگ تھے۔ ان میں عیسائی بھی تھے اور باہر سے آئے نوکر چاکر بھی تھے۔ سب سے زیادہ حساس علاقہ اندرونی تھا جو شہنشاہ اکبر کی طرف سے بنائی گئی لگ بھگ سات میل لمبی دیواروں کے اندر تھا۔ یہاں لگ بھگ پانچ لاکھ کی آبادی تھی۔ ان میں تقریباً تین لاکھ مسلمان تھے اور ہندو سکھ لگ بھگ برابر یعنی ایک لاکھ کے قریب تھے۔ یہاں اُن دنوں کچھ مکان ایسے بھی تھے جہاں ہندو، مسلمان اور سِکھ مشترکہ طور پر رہتے تھے۔

یہاں کے بازار بھی اپنی ہی قسم کے تھے۔ الگ الگ جگہ ایک ہی قسم کا روزگار کرنے والے اپنے آپ ہی ایک ہی علاقے میں رہنے لگتے اور پھر وہ اُن کا بازار یا محلّہ کہلانے لگتا۔ مثلاً چمڑے کا کام کرنے والے جہاں بسے، وہ موچی بازار ہو گیا۔ جوہری جہاں آس پاس رہے وہ جوہری بازار ہو گیا۔ جوہری بازار کے ایک طرف عطّار بازار تھا۔ کانچ کی رنگ برنگی شیشیوں میں قرینے سے بھرا گیا ہر طرح کا عطر یہاں ملتا تھا۔ کہتے تھے کہ طبیعت میں تازگی لانے کے لئے بس ایک بار اس بازار سے گذرنا ہی کافی ہوتا تھا۔ مینا کاری، لاکھ کی پالش والے پیالے، ہاتھی دانت و سیپ جڑی چھوٹی چھوٹی صندوقچیاں سب کچھ یہاں مل جاتا تھا۔ انہیں علاقوں میں پھول والا بازار بھی تھا۔ گلاب و چمبیلی کی خوشبو سے یہ سارا علاقہ مہکتا رہتا۔ گلاب کی پتّیوں و پھولوں کے انباروں پر چمبیلی کی کلیوں کے ہار و گجرے لٹکتے رہتے۔

ایک بازار ایسا بھی تھا جہاں چاقو، چھُرے، کرپانیں ملتی تھیں۔ بے شک ان ہتھیاروں کا استعمال کاٹنے مارنے کے لئے بھی طے تھا مگر ان کے ہتّھے بھی سجاوٹ کے ساتھ بنتے تھے یعنی ہر خطرناک چیز کے ساتھ خوبصورتی بھی شامل ہوتی تھی۔

کپڑا مارکیٹ میں موٹے لالے سج دھج کر گدّیوں پر بیٹھ جاتے اور اُن کے کارندے گاہکوں کے سامنے کپڑے کے تھان بچھاتے، پھر لپیٹے، پھر بچھاتے اور انہیں کپڑوں کی کوالٹی و خاصیت کے بارے میں چند فقروں میں باتوں کا رس پلاتے رہتے۔

اسی حوالے سے لالہ بُلا کی شاہ کا ذکر نہ ہو تو بات ادھوری رہ جائے گی۔ اسی بازار میں ایک ہندو بستی تھی۔ اسی بستی میں اوپر کی منزل پر بیٹھ کر لالہ بلا کی شاہ نقاشی دار کھڑکیوں سے بازار کی رونق دیکھتا رہتا۔ کہا جاتا ہے کہ اس وقت کے پنجاب کے لگ بھگ آدھے کسان بُلا کی شاہ کے بہی کھاتوں میں قید تھے۔ جب دنگے ہوئے تو بُلا کی شاہ کے سارے بہی کھاتوں کو دنگائیوں نے آگ کے سپرد کیا۔

اب یہ طے کرنا ممکن نہیں کہ دنگوں کی شروعات کہاں سے ہوئی تھی۔ دراصل جب الگ پاکستان کا ذکر شروع ہوا تو گانٹھیں اُسی وقت سے پکّی ہونے لگی تھیں۔ جو لوگ طے مان رہے تھے کہ پاکستان تو بنے گا ہی، ان میں سے کچھ نے دوسرے مذہب کے لوگوں کی جائیداد کی فہرست بنانا شروع بھی کر دیا تھا۔ ممکن، یہی حالات 35 میل دور امرتسر میں یا کسی اور ہندوستانی شہر میں

بھی رہے ہوں۔

میرے یہاں لوگ بتاتے ہیں کہ قتل وغارت کے سلسلے کی نیم خاموش ہلچل ماہ مارچ میں ہی شروع ہوگئی تھی۔ اپنی ساری جائیداد اور خاندان کے غیر محفوظ ہونے کے شک سے ایک مذہب کے لیڈر نے دوسرے مذہب کے سیاسی پارٹی کا جھنڈا تلوار سے کاٹ ڈالا تھا۔ اُس کے ساتھ ہی قتل وغارت کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔ اس قتل وغارت میں شہری علاقوں و آس پاس کے دیہاتوں کے لگ بھگ 3500 لوگ مارے گئے تھے جن میں کافی بڑی تعداد میں سِکھ تھے۔

بس وہیں سے مجھے الوداع کہنے کا سلسلہ تیزی پکڑنے لگا۔ ایک بات تو انہیں دنوں صاف ہوگئی تھی کہ قتل وغارت مچانے والوں میں زیادہ تر لوگ غیر سماجی عناصر یا غنڈے تھے۔

ان دنوں بھارت میں سِکھوں کی کُل آبادی لگ بھگ 60 لاکھ مانی جاتی تھی۔ اس آبادی میں سے لگ بھگ 50 لاکھ پنجاب میں رہتے تھے۔ صرف میرے علاقے لاہور میں ان کی تعداد ایک لاکھ کے قریب تھی۔ حالانکہ پنجاب کی اُس وقت کی کُل آبادی میں ان کا حصّہ صرف تیرہ فیصدی ہی تھا مگر یہاں کی 45 فیصدی زمینیں اُن کی ملکیت تھیں۔ بھارت فوج میں بھی ان دنوں ایک تہائی سِکھ تھے۔ ایک عجب حالت یہ تھی کہ سِکھ، ہندو اور مسلمان انگریزوں کے ماتحت تو رہ پا رہے تھے مگر نفسیاتی طور سے وہ ایک دوسرے کے ماتحت رہنے کے لئے تیار نہیں ہو پا رہے تھے۔

سِکھوں کی قیادت اُن دنوں ماسٹر تارا سنگھ کے پاس تھی۔ ماسٹر تارا سنگھ جذباتی قسم کے سیاست دان تھے۔ انہیں جوش دلانا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ مگر ان دنوں ان کے دل میں بھی غصّہ تھا اور وہ شدّت سے محسوس کرنے لگے تھے کہ سِکھ پریواروں پر زیادہ ظلم ہوسکتا ہے۔

وہ پانچ مارچ کا دن تھا۔ دو دن پہلے خضر حیات خاں کی قیادت والی پنجاب سرکار نے استعفیٰ دے دیا تھا۔ نئی سرکار بنانے کی قواعد میں کوششیں ہو رہی تھیں کہ مسلم لیگ اور سِکھ نیتا مل کر سرکار بنالیں کانگریس تو اُس وقت تک تقسیم کے خلاف تھی ہی۔

ادھر پنتھک نیتاؤں نے مسلم قیادت کے ساتھ ہاتھ ملانے سے انکار کر دیا تھا۔ پانچ مارچ کو مسلم لیگ کے حمائیتیوں کا ایک بڑا ہجوم پنجاب اسمبلی کے باہر جمع تھا۔ تبھی ماسٹر تارا سنگھ اپنے دیگر ساتھی لیڈروں کے ساتھ باہر نکلے۔ چشم دید لوگوں کے مطابق انہوں نے تلوار لہراتے ہوئے ''پاکستان مردہ باد'' کا نعرہ لگایا۔ ان کا دوسرا نعرہ تھا— ''کٹ کے دیاں گے اپنی جان،

نہیں دیاں گے پاکستان۔" دراصل ماسٹر تارا سنگھ ناراض تھے اور ان کا غصّہ سِکھوں کے غیر محفوظ ہونے کی وجہ سے تھا۔

اُسی روز شام کو پرانی انارکلی کے نزدیک ہی کپورتھلہ ہاؤس میں ہندوؤں اور سِکھ لیڈروں کی ایک میٹنگ ہوئی۔ میٹنگ میں ماسٹر تارا سنگھ نے پھر وہی تیور دکھائے۔ اُن کا کہنا تھا —"اب امتحان کا وقت آچکا ہے۔ ہماری سرزمین خون مانگتی ہے۔ ہم اپنا خون دینے کو تیار ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ کم گنتی کا طبقہ سدا حاوی رہا ہے۔ یہ ہندو راشٹر تھا مگر اس پُر مغلوں نے قبضہ جما لیا اور حکومت کرتے رہے۔ پھر سِکھوں نے مُغلوں سے حکومت چھینی اور راج کیا۔ پھر مٹھی بھر انگریز آئے۔ انہوں نے حکومت چھینی۔ ہم پھر سے حکومت سنبھالیں گے۔" اس موقع پر ایک اور سِکھ لیڈر گیانی کرتار سنگھ اور ایک ہندو لیڈر چودھری کرشن گوپال نے بھی تقریریں کیں۔ اگرچہ اس میٹنگ میں گوپی چند بھارگو (جو بعد میں ہندوستانی پنجاب کے پہلے وزیر اعلیٰ بنے) بھی موجود تھے مگر انہوں نے کوئی ایسا تیور نہیں دکھایا حالانکہ مسلم لیگ کی سرکار بنانے کی انہوں نے بھی مخالفت کی تھی۔

مارچ کے یہ پہلے دن بے حد تناؤ سے بھرے تھے۔ ایک طرف مسلم لیگی اپنی کامیابی کے دعوے بیان کر رہے تھے تو دوسری طرف ہندو اور سِکھ تناؤ میں تھے۔ اُن کے دل میں شک و شبہات بھی تھے اور مسلم لیگ کے بارے میں غیر یقینی بھی تھے۔

خوشونت سنگھ نے 1947 کے وسط جون سے ہی دنگوں کی شروعات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے "— ان دنگوں میں مسلموں کا پلڑا بھاری رہا۔ اس کی بڑی وجہ تھی پنجاب کی پولیس میں 80 فیصدی مسلموں کی تعیناتی۔ ادھر مغربی پنجاب میں بھی لگ بھگ یہی حالت تھی۔"

پندرہ اگست کو جب بٹوارہ ہوا اُس دن سر فرانسِس موڈی نئے پاک پنجاب کے پہلے گورنر بنے اور نواب افتخار حسین ممدوٹ پہلے وزیر اعلیٰ بنے۔ اُدھر ہندوستانی پنجاب میں سی۔ ایم۔ ترویدی پہلے گورنر بنے اور گوپی چند بھارگو پہلے وزیر اعلیٰ بنے۔ ان دونوں ہی نئی سرکاروں پر سب سے پہلی ذمّہ داری اپنے اپنے صوبوں میں لوگوں کی حفاظت کی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ یہ نئی سرکاریں اب اپنی اپنی مرکزی حکومت کو جوابدہ تھیں مگر دونوں ہی سرکاروں کے درمیان ایک دوسرے پر اپنے اپنے صوبوں میں کم گنتی کے لوگوں کی حفاظت نہ کر پانے کے الزامات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

اُن دنوں جو ہوا اُسے دوہراتے ہوئے بھی جسم کانپنے لگتا ہے۔ کبھی کبھی تو یہ حقیقت

ذہن کو مفلوج کرتی ہے کہ اس وقت کے دوراندیش لیڈر، جن میں جناح، گاندھی، نہرو کے علاوہ ماؤنٹ بیٹن بھی شامل تھے، اس بات کا تھوڑا بھی اندازہ نہیں لگا پائے کہ تباہی اور پاگل پن کا معیار کیا ہوگا۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ لوگ اوران کے صلاح کار مذہبی طور پر انتہا پسند نہیں تھے۔ ان کی ساری سوچ صرف آنے والے کل کے سیاسی ڈھانچے تک ہی محدود تھی۔

میں لاہور ہوں — اور مجھے اس بات کا ملال ہمیشہ رہے گا کہ میرے شہر کی تمام نالیاں انسانی خون سے بھر گئی تھیں۔ سڑکوں کے کنارے ایک مذہب والوں کے گھر جل رہے تھے اور چاروں طرف چیخ وپکار، آگ، دھواں اور قتل وغارت کے مناظر تھے۔

بٹوارے کو برسوں گذر گئے۔ درمیان میں ایک بار (غالباً آزادی کے لگ بھگ دس سال بعد) دونوں طرف کے شرنارتھیوں کو ایک بار اپنی اپنی جڑوں کو دیکھنے کا موقع دیا گیا۔ مقصد یہ تھا کہ اگر کوئی رفیوجی اجڑتے وقت اپنی کچھ بیش قیمتی چیزیں کہیں دبا کر یا چھپا کر رکھ گیا ہو تو وہ مقامی سرکاری کارندوں کی موجودگی میں صحیح نشاندہی کے بعد اپنی چیزیں واپس حاصل کر سکے۔ لگ بھگ 700 لوگوں نے میرے یہاں آکر اپنی دبی دولت ونشانیاں حاصل کیں۔ میرے یہاں بھارت سے آکر بسنے والے لوگ بھی بھارت کے کئی شہروں سے اپنی دبی ہوئی یا دبائی گئی چیزیں واپس لے آئے۔ دس سال بعد کا یہ واقعہ اُس بات کا گواہ تھا کہ اجڑتے وقت بھی دونوں طرف کے لوگ یہ اُمید نہیں چھوڑ پائے کہ وہ ایک نہ ایک دن واپس لوٹ آئیں گے۔ اس عرصے کے دوران کچھ حادثے بھی ہوئے۔ کچھ لوگ اپنی پُرانی جڑوں کی دیواروں سے سر ٹکرا ٹکرا کر بھی روئے۔ کچھ بے ہوش ہو گئے اور درجن بھر لوگ جو جڑوں کے قریب پہنچ کر دم توڑ گئے۔ مگر اس تھوڑے سے عرصے میں کروڑوں کی دولت اس کے صحیح وارثوں کے پاس پہنچ گئی تھی۔

مجھے وہ لمحہ بھی یاد آتا ہے جب پنڈت جواہر لعل نہرو اور لیاقت علی خاں ایک کھُلی کار میں آئے تھے۔ یہ آزادی کے کچھ دن پہلے کی بات ہی ہے۔ مہینہ اگست 1947 کا ہی تھا۔ دونوں خاموش تھے۔ چہروں پر گہری اداسی وتھکان تھی۔ عجب عالم تھا کہ دونوں ملکوں کے دو نمائندہ انسانوں کی قیادت میں کوئی ہاتھ نہیں ہلا رہا تھا۔ ان کی کار کے دونوں طرف اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر آنے جانے والوں کے قافلے چلے جا رہے تھے۔

تبھی نہرو نے خاموشی توڑی، بولے — ''لیاقت یہ کیا ہو گیا ہے!''

لیاقت علی خاں کا جواب تھا— ''ہمارے لوگ پاگل ہو گئے ہیں۔''

اسی دوران ایک بزرگ دکھائی دینے والا ہندو سامنے آیا۔ اس نے نہرو جی کو پہچان لیا تھا۔ وہ کار کی طرف لپکا۔ کار دھیمی تھی۔ وہ زور زور سے رونے لگا۔ گڑگڑانے لگا۔ وہ نہرو سے مدد مانگ رہا تھا۔ اس کی بارہ سال کی بیٹی کو کچھ غنڈے اٹھا کر لے گئے تھے۔ وہ بار بار التجا کر رہا تھا— ''پنڈت جی! آپ بہت بڑے آدمی ہیں۔ آپ جو چاہے کر سکتے ہیں۔ بس، مجھے میری بیٹی دِلوا دیں۔''

پنڈت نہرو نے بعد میں تین مورتی بھون میں اس واقع کا ذکر کیا تو وہ خود بھی جذباتی ہو گئے تھے۔ بہرحال نہرو لیاقت کے محافظوں نے اس روتے بلکتے بزرگ کو کار سے الگ کیا۔ اُس رات دنوں میرے یہاں ہی رُکے تھے۔ مگر نہرو ساری رات برآمدے میں ہی چکر کاٹتے رہے۔ وہ سو نہیں سکے۔ رہ رہ کر ان کے سامنے اُس بزرگ کا گڑگڑاتا چہرہ ابھر آتا اور انہیں اپنی بے چارگی کا احساس کراجاتا۔ نہرو اگلے دن صبح نکلے تو ایک بڑھیا نے کار کو ہاتھ دے دیا۔ لیاقت علی خاں نے کارروائی۔ وہ بُڑھیا نہ رو رہی تھی اور نہ کچھ مانگ رہی تھی۔ اُس کا تو صرف ایک گِلہ تھا— ''آپ دونوں تو بہت بڑے سمجھدار آدمی ہو۔ بٹوارہ ہی کرانا تھا تو جائیدادوں کا کراتے۔ کبھی آبادیاں اجاڑ کر بھی بٹوارے ہوتے ہیں؟

بٹوارے تو ہم نے بھی سُنے ہیں لیکن آبادیوں کے بٹوارے نہ سُنے، نہ دیکھے۔ لعنت ہو تم سب پر''، اور یہ کہتی کہتی وہ بڑھیا ایک گلی کی طرف مُڑ گئی۔ وہ ڈر بھی گئی تھی کہ اُسے اُس کے غصّے کے لئے کہیں سزا نہ ملے۔ اس کی بات سے اندر تک دہل چکے ان دونوں ''بڑوں'' نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ دونوں کی آنکھوں میں سوال تھے مگر دونوں نے سر جھکایا اور اپنی اپنی طرف باہر دیکھنے لگے— بہرحال، اب بہت کچھ بدل چکا ہے۔ ابھی کچھ بازاروں، کچھ محلّوں اور کچھ بستیوں و سڑکوں کے ناموں میں زیادہ تبدیلیاں نہیں آئیں۔ منٹو والا لکشمی مینشن ابھی بھی لکشمی مینشن ہی ہے۔ کرشنا گلی ابھی بھی کرشنا گلی ہے۔ سر گنگا رام روڈ برقرار ہے۔

اس وقت کا میرا وجود ''تھری اِن ون'' کہلاتا ہے یعنی ایک ہی شہر میں تین طرح کی زندگیاں ہیں پرانا شہر، جسے اندرون شہر بھی کہتے ہیں، لگ بھگ ایک ہزار سال پُرانا ہے۔ یہاں جو کچھ ہے، تاریخی ہے۔

دوسرا لاہور وہ ہے جسے برٹش راج نے بسایا تھا۔ اس میں میو ہسپتال سے مشرق میں

کینال بینک (نہر کا کنارہ) تک کا علاقہ شامل ہے۔ تیسرے لاہور میں مسلم ٹاؤن، بحریہ ٹاؤن، ڈی ایچ۔اے جیسے علاقے ہیں جو آزادی کے بعد بنے۔ اب یہاں بہت کچھ ہے۔ مینار پاکستان، قذافی سٹیڈیم اور دوسری ایسی جگہ ہیں جو بدلتے ہوئے پاکستان کے نئے چہرے کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ پاکستان میں Intelectuals، صحافیوں، قلمکاروں، فنکاروں کا ایک ایسا بڑا طبقہ ہے جو اپنے ملک کی موجودہ تصویر کو سنوارنے کے لئے بے چین ہے۔ یہ لوگ تعداد میں بھی کافی ہیں اور سوچ میں بھی۔

ویسے بھی میرا درجہ اب وہ نہیں رہا تھا جو 1947 سے پہلے تھا۔ اب کراچی میرے سے کہیں آگے ہے۔ آہستہ آہستہ میرا کلچرل رُتبہ، میری پہچان ایک بار پھر لوٹنے لگی ہے۔ پارک لین کے پاس والی گلی اب بھی مہتہ گلی کہلاتی ہے۔ قلم کار روید مہتہ کے بزرگ اسی گلی میں رہتے تھے۔ بے شک زیادہ تر عمارتوں، باغوں و سڑکوں کے نام بدل گئے ہیں مگر گھریلو تقریبات میں ڈھولکیاں، مہندی، چوڑیوں کی کھن کھن، کاجل، عطر، گلاب کی پتیاں نہانے والے ٹب میں ڈالنا، بازاروں میں وہی اور ویسے ہی پولیس والے جو پچھلی لگ بھگ ایک صدی میں نہیں بدلے، شہر کا مشہور گندہ نالا، شہر کے وسط میں بہتی لمبی نہر، محلّوں میں بیت بازی — کچھ بھی تو نہیں بدلا۔

"شکاگو گرِل" —— کیفے ذوق، پیزا ہٹ، کے ایف۔ سی، فرینڈیز کیفے وغیرہ بے شمار جدید آؤٹ لیٹ کھل گئے ہیں مگر بازاروں میں فلودا، کلفی، کشمیری چائے، حلوہ پوری، ملائی والی چائے، کڑاہی والا دودھ، سب کچھ پہلے سے زیادہ فروخت ہوتے ہیں۔ جگہ جگہ جسمانی طاقت کے نسخے فروخت کرنے والوں کے بورڈ اب زیادہ چمکنے لگے ہیں۔ میرے شہر کے لوگ اب بھی کھانے پینے کے شوقین ہیں۔ میرے یہاں کے باشندوں کے لئے زندگی سے بھی زیادہ ضروری لذیذ کھانا ہے۔ فوڈ سٹریٹ میں پارکنگ کی جگہ نہیں ملتی۔ اس کے علاوہ بھی چمن کی قلفی و آئس کریم، یوسف کی قلفی، وِلیس کا بوفے، چٹخارہ کی پاپڑی چاٹ، مزنگ کی مچھلی، وارث کی نہاری، ریلوے روڈ کی حلوہ پوری، گوال منڈی کی کھیر وغیرہ لوگوں کی پسندیدہ جگہیں ہیں۔

یہ محاورہ آج بھی زندہ ہے کہ ——

جس لاہور نہیں ویکھیا —— او جمیا ہی نہیں

Mein Lahore Hoon
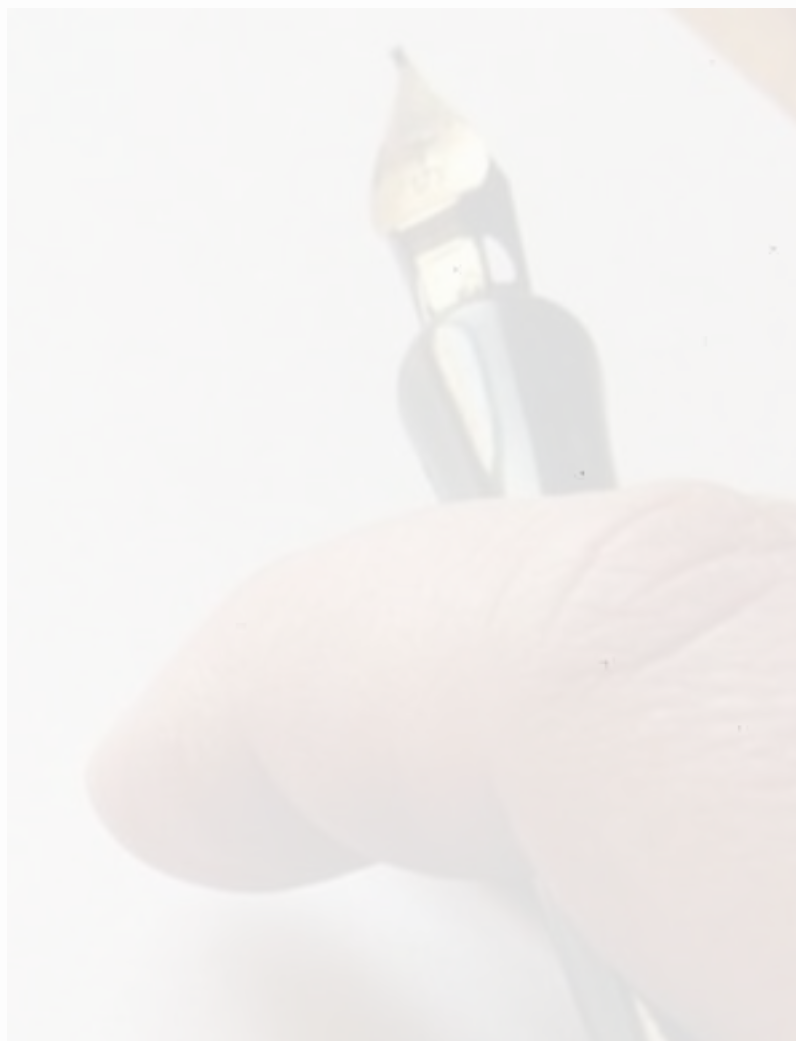
Pani Ka BulBula

ملکہ نور جہاں نے کہا تھا کہ میں اپنی جان فروخت کر کے اگر لاہور خرید لوں تو پھر بھی یہ ایک سستا سودا ہوگا۔۔۔

میں نے بھی دُنیا کے ایسے بڑے بڑے شہر چھوڑے ہیں جہاں لوگ آباد ہونے کو ترستے ہیں، میں نے نہ صرف وہ شہر چھوڑے بلکہ کچھ عشق بھی چھوڑے،

اُن عشقوں سے بے وفائی کی لیکن میں نے ہمیشہ لاہور سے وفا کی

اور اس جادوئی شہر کے بام و در میں واپس آ گیا۔۔

اور یہ ایک سستا سودا تھا۔

اس شہر کی فضاؤں میں ایسے طلسم سرگوشیاں کرتے ہیں کہ کسی نے بھی اُنھیں سُنا تو وہ ہمیشہ کے لیے اس شہر بے مثال کا ہو گیا۔

آپ کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، امرتا پریتم، خوشونت سنگھ، پران، اوم پرکاش، دیو آنند اور کامنی کوشل سے پوچھیے کہ جب مجبوراً اُنھیں لاہور چھوڑنا پڑا تو اُن پر کیا گذری؟

کنہیا لال کپور لاہور سے نکلے تو نابھ میں جا مقیم ہوئے، کسی نے پوچھا کہ آپ کسی بڑے شہر میں جا کر کیوں آباد نہیں ہوئے؟۔۔۔ کہنے لگے جب کوئی شہر لاہور جیسا ہوگا تو چلا جاؤں گا۔

کیول دھیر کی کتاب ''میں لاہور ہوں'' میں یہی لاہور ان کے لفظوں میں سانس لے رہا ہے۔

اس میں کیا شک کہ وہ ایک بڑے لکھنے والے ہیں اور یہ انھوں نے ایک بڑی کتاب لکھی ہے۔

کیول دھیر کو دھیرے دھیرے پڑھتے آپ بھی لاہور کے طلسم میں گرفتار ہو جائیں گے۔

مستنصر حسین تارڑ

DARBAAN KITABEIN, main street Gaga, Daska (Sialkot).
DARBAAN online book store, Sialkot, Lahore.
052-6611192 03000700313
دربان کتابیں , Lahore BOOKS Online Showroom